وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ

اِختلافِ اُمّت اور صِراطِ مُستقیم

حصہ اوّل، دوم

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ

مکتبہ لدھیانوی

besturdubooks.wordpress.com

وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ (القرآن)

اختلافِ اُمت

اور

صراطِ مُستقیم

حصہ اوّل

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ

مکتبہ لدھیانوی

besturdubooks.wordpress.com

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

رب کائنات سورۃ الانعام آیت ۱۵۳ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، تم اسی پر چلنا، اور ان راستوں پر نہ چلنا کہ (ان پر چل کر) خدا کے راستے سے الگ ہو جاؤ گے ان باتوں کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔"

اس آیت کریمہ کے ذیل میں حافظ ابن کثیرؒ تفسیر ابن کثیر میں درج ذیل روایتیں نقل فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر اپنے دست مبارک سے ایک خط (لکیر) کھینچی اور فرمایا: "یہ خدا کا سیدھا راستہ ہے" اس کے بعد دائیں اور بائیں لکیریں کھینچیں اور فرمایا: "یہ وہ راستے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر شیطان بیٹھا ہوا ہے اور اپنی طرف بلا رہا ہے" اس کے بعد مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا: "یہ تو ہوا خدا کا راستہ" پھر سیدھی اور بائیں طرف دو لکیریں کھینچیں اور دائیں بائیں شمار کرتے ہوئے فرمایا: "یہ سب شیطان کے راستے ہیں" اور بیچ والی لکیر پر انگلی رکھ کر آیت کریمہ "وان ہذا صراطی مستقیما" تلاوت فرمائی۔

ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنے پاس جگہ عنایت فرمائی۔

اندیشہ ہے، اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد بہت ہی زیادہ واضح ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے، اور میری امت (اختلافات کی بناء پر) ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہوگی، تمام کے تمام فرقے جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے۔"

جب صرف ایک ہی فرقہ نجات یافتہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ کیونکہ تمام فرقے اسلام اور اہل حق ہونے کے مدعی ہیں، اور ان کے رہنما اپنے اپنے پیروکاروں کو یہی بات ذہن نشین کرادیتے ہیں کہ ان کے علاوہ کوئی حق پر نہیں، اور نجات صرف انہی عقائد اور اعمال کے ساتھ مخصوص ہے جن کی وہ تلقین و تبلیغ کرتے ہیں۔ تو اس سلسلے میں بھی ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نجات یافتہ طبقہ اور جماعت وہ ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں" اور ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"تمہارے لئے میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت ہے، اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔"

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراط مستقیم کی تشریح کے لئے صحابہ کرامؓ کی سنت کو کیوں معیار قرار دیا؟ علمائے کرام اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ غیر شرعی عمل کا صدور ان سے ہونا ممکن ہی نہیں رہا تھا، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ جس عمل پر ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوجائے اس کو چھوڑ دیں۔ گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور فیض نظر سے اسلام کی عملی تطبیق بن گئے تھے، وہ اس سانچے میں ڈھل گئے تھے جو

besturdubooks.wordpress.com

اور امت کی ایک بڑی جماعت ان کی پیروی کی وجہ سے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئی۔

ممدوح مکرم مرشدی سیدی وسندی، قدوۃ السالکین، استاذ العلماء، شیخ المشائخ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی زادہ اللہ شرفاً و کرامۃً موجودہ دور کی ان شخصیات میں سرِفہرست ہیں جن کو رب العالمین نے ترجمانِ اہلِ حق اور شارحِ صراطِ مستقیم کی حیثیت سے منتخب فرما دیا، اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ موجودہ وقت میں آپ کے قلم کو اللہ تعالیٰ نے جو قبولیتِ عامہ عطا فرمائی ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں۔

حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت حضرت اقدس مولانا خیر محمد صاحب خلیفہ ارشد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمائی۔ تدریس کے ساتھ ہی آپ نے جب پہلا مضمون تحریر فرمایا تو محدث العصر، عاشقِ رسول حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری کی نظرِ انتخاب پڑی اور آپ کو "بینات" کے لئے طلب کیا تو سعادت مند شاگرد کی طرح حضرت نے فرمایا: "میں تو استاذِ محترم کے حکم کا تابعدار ہوں، جیسے حضرت مولانا خیر محمد صاحب فرمائیں۔" حضرت اقدس بنوری نے استاذِ محترم سے طلب کیا تو زندگی بھر کے لئے حضرت اقدس مولانا بنوری کی آنکھوں کے تارے ہو گئے۔ ادھر شیخ بنوری نے بھی محبت کا ایسا محور بنایا کہ "ہم نام اور ہم کام" اور صرف یہی نہیں مرید و خادم نہیں رفیقِ محترم کے درجے پر فائز فرما دیا۔ "بینات" اور مجلس تحفظِ ختمِ نبوت سب کچھ سپرد کر دیا۔ حضرت اقدس بنوری کی وفات کے بعد جانشینِ بنوری مفتی احمد الرحمٰن نے اپنے مربی و شیخ حضرت اقدس بنوری کی اس محبت کو حرزِ جان بنایا۔ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے پہلے ہی جلسے میں خلافت سے سرفراز فرما کر اشارہ فرما دیا کہ مستقبل میں ترجمان کا منصب منتظر ہے، عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی نے حضرت شیخ الحدیث کے عطا کردہ منصب پر مہرِ تصدیق ثبت فرما کر تمام سلسلوں کا مقتدا بنایا۔ اور ان کا یہ امت کا نقیب جب حضرت اقدس مولانا لدھیانوی کے قلم سے "اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم" کی شکل میں جلوہ گر ہوا تو چاروں طرف سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ علمائے حق نے سندِ توثیق ثبت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "الحمد للہ! مسلکِ اعتدال اور مسلکِ حق کی صحیح ترجمانی کی" عوام الناس نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "اختلاف کے اس دور میں صراط

فہرست

besturdubooks.wordpress.com

حصہ دوم ۲۷۱

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

دیباچہ طبع اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

عام مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ خاصی پریشانی کا باعث ہوتا ہے کہ مختلف اسلامی فرقوں میں سے صحیح راستے پر کون ہے؟ زیر نظر مقالہ اسی قسم کے سوال کا جواب ہے، جس میں "صراط مستقیم" کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتے ہوئے مشہور فرقوں کے اختلافات کو بخوبی پر جانچا گیا ہے، اس سے ایک متوسط عقل و فہم کے منصف مزاج شخص کے لئے حق کی تلاش میں اور صحیح و غلط کے درمیان امتیاز کرنے میں کوئی دقت نہیں رہ جاتی۔

یہ مقالہ ماہنامہ "بینات" کراچی کی خاص اشاعت (رجب و شعبان ۱۳۹۶ھ) کی شکل میں شائع ہوا تھا اور حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اپنے احباب و اکابر کے علاوہ عام انصاف پسند حلقوں میں اسے بہت ہی پسند کیا گیا۔

طبع دوم کے موقع پر مؤلف کو اپنی مصروفیت کی وجہ سے نظرثانی کی فرصت نہیں مل سکی، تاہم طبع اول میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں ان کو درست کر دیا گیا ہے۔ میں ان احباب کا ممنون ہوں جنہوں نے ان اغلاط کی جانب توجہ دلائی۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس حقیر سی کاوش کو قبول فرما کر اسے اپنے بندوں کے نفع کا ذریعہ بنائیں، اور قارئین کرام سے متوقع ہوں کہ وہ مؤلف کو بھی اخلاص و رضا وحسن خاتمہ کی سعادت نصیب فرمائیں۔

ولہ الکبریاء فی السمٰوات والارض

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

۲۹/۶/۱۳۹۶ھ

ایسا بھی ہے جو مولانا مودودی صاحب کے علاوہ پاکستان میں کسی اور کو امام ہی نہیں مانتا، اور اس کا کہنا ہے کہ نیاز دینا، ہر فاتحہ پڑھنا، حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں دینا اور ختم شریف پڑھنا، سب شرک ہے، وغیرہ۔ بہرحال ہم سب لوگ جب کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو مجھے غلط تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ میں کسی بھی فرقے کو غلط یا کسی کو صحیح نہیں کہتا، اس لئے میرے باقی ساتھی میرا فیصلہ خود ہی تسلیم کر لیتے ہیں اور اس طرح ہماری بحث کسی حتمی انجام کو پہنچتی ہے، مگر بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جو میں معلومات نہ ہونے کی وجہ سے حل نہیں کر پاتا۔ چونکہ "جنگ" میں، میں آپ کا کالم بڑی پابندی سے اور توجہ سے پڑھتا ہوں، اس لئے میں نے اپنے سب ساتھیوں سے مشورہ کرکے چند ضروری مسائل جن پر ہم لوگ آج تک متفق نہیں ہوسکے ہیں، پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

۱:... سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور وہابی فرقوں کے عقائد میں کیا فرق ہے؟ ان میں کیا اختلافات ہیں؟ ان میں سب سے افضل کون سا فرقہ ہے؟ اور اب کتنے فرقے ہیں؟ ان کے اماموں کے نام مع صفات کے تحریر فرمائیں۔

۲:... نماز میں صرف فرض ادا کرنا کیا صحیح اور درست ہے؟ یہاں کے ایک بہت بڑے خطیب صاحب ہیں (جو مصری ہیں) ان سے میں نے یہ دریافت کیا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں، آپ صرف نماز جمعہ میں دو فرض ہی کیوں ادا کرتے ہیں؟ جبکہ سنت اور نفل بھی ہیں؟ انہوں نے مجھے یہ جواب دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجرہ مسجد نبوی کے اندر ہی تھا، وہ وہاں سے آکر مسجد میں جاتے تھے اور دو فرض نماز جمعہ جماعت کے ساتھ پڑھا کر واپس حجرے میں چلے جاتے تھے، اور حجرے میں جو نماز ادا کرتے تھے؟ یہ کسی کو کچھ معلوم نہیں، اس لئے میں سنت نہیں ادا کرتا ہوں۔

آپ مہربانی کر کے اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں کہ آیا یہ خطیب صاحب درست فرماتے ہیں؟ اگر نہیں تو ٹھیک مسئلہ کیا ہے؟

۳:... زیارت پر فاتحہ خوانی کرنا، گیارہویں شریف دینا اور ختم شریف (یعنی کسی کی مغفرت کے لئے قرآن خوانی یا کروانی کرانا) پڑھانا، جائز ہے؟ قرآن و سنت کے حوالے دے کر واضح کریں۔ پہلے سوال کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ اس کا جواب ہماری زندگیوں کو بدل سکتا ہے، کیونکہ ہم سب اس بات پر متفق ہو گئے ہیں، کیونکہ جو کچھ بھی آپ قرآن و سنت کے مطابق لکھیں گے، ہم اسی پر عمل کریں گے، اس لئے آپ مہربانی فرما کر ہمیں ایک ٹھیک بات بتائیں۔ آپ کا دعاگو

محمد کریم... غزنی (یوسف زئی)۔"

جواب:... آپ اور آپ کے رفقاء کی دین سے دلچسپی لائقِ مبارک باد ہے، مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس دلچسپی کا رُخ بحث و مباحثے سے ہٹا کر دین کے سیکھنے سکھانے اور اس کے عملی تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں کو اپنی اور دوسروں کی زندگی میں لانے کی طرف پھیرنا چاہئے۔

اور میرے معروضہ کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ بحث و مباحثے سے انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے۔ مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ:

"مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ." (مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:... "جو قوم ہدایت سے ہٹ کر گمراہ ہو جاتی ہے، اسے جھگڑا دے دیا جاتا ہے۔"

پس کسی قوم کا بحث مباحثوں اور جھگڑوں میں اُلجھ کر رہ جانا اس کے حق میں کسی طرح نیک فال قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بحث و مباحثے میں عام طور سے سمجھنے سمجھانے کا جذبہ مغلوب

besturdubooks.wordpress.com

شیعہ سنی اختلاف

یہ تو آپ کو اور ہر مسلمان کو علم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بابرکت دور میں اُمت میں نظریاتی اختلاف کا کوئی وجود نہیں تھا، یعنی پوری اُمت اسلامیہ اختلاف کی وباء سے محفوظ اور کفر کے مقابلے میں یک جان اور یک قالب تھی۔ نظریاتی اختلاف کی ابتدا پہلی بار سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری زمانہ خلافت میں ہوئی، اور یہی شیعہ مذہب کا نقطۂ آغاز تھا۔ جیسا کہ اس کی بنیاد بہت سادہ تھی یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و قریب ہیں، اس لئے وہی آپ کی خلافت و جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر سادہ اور خوشنما ہونے کے باوجود اسلام کی دعوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے خلاف تھا، اس لئے کہ اسلام نے نسلی امتیاز اور خاندانی غرور کے سارے بتوں کو پاش پاش کرکے عزت و شرافت اور سیادت و بزرگی کا مدار "تقویٰ" پر رکھا تھا، اور تقویٰ کی صفت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چونکہ حضرات صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں سب سے فائق اور سب کے سرتاج تھے (چنانچہ قرآن مجید میں سورۂ واللیل میں انہی کو "الاتقیٰ" یعنی سب سے زیادہ متقی فرمایا گیا ہے) اس لئے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسرِ منبر سوال کیا گیا کہ آپ لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ کیوں بنایا؟ آپ نے فرمایا کہ: دین کے کاموں میں سب سے اہم ترین نماز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ کو ہمارا "امامِ نماز" بنایا تھا، باوجودیکہ میں وہاں موجود تھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میری موجودگی کا علم بھی تھا، مگر آپ کا ...

besturdubooks.wordpress.com

کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پسند نہیں فرمایا، بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو حکم فرمایا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص کو ہمارے دین کی امامت کے لئے منتخب فرمایا تھا، ہم نے دنیا کی امامت وقیادت کے لئے بھی اسی کو چن لیا۔

الغرض! یہی وہ غلط بنیاد ہے جس پر شیعہ نظریات کی عمارت کھڑی کی گئی۔ ان عقائد و نظریات کے اولین موجد وہ یہودی الاصل منافق تھے (عبداللہ بن سبا اور اس کے رفقاء) جو اسلامی فتوحات کی یلغار سے بُری طرح بھن کر کباب ہو گئے تھے، انہیں اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رُخ موڑنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ زہریلے نظریات کا بیج بو کر اُمتِ اسلامیہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ جب مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوں گے تو ان میں کفر کو للکارنے کی جرأت و تاب باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ انہوں نے "حبِ علیؓ" کے خوش نما عنوان سے مکروہ ترین عقائد بکھیر کر نظریاتی اختلاف کا بائیڈروجن بم اسلام کے مرکز پر گرا دینا چاہا، اگر اسلام خدا تعالیٰ کا آخری دین نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے تا قیامت اس کی حفاظت کا وعدہ نہ فرمایا ہوتا تو قریب تھا کہ اسلامی قلعہ بھک سے اُڑ جاتا، اور جس طرح سینٹ پال یہودی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو مسخ کر دیا تھا، اسی طرح یہودی سازش اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کامیاب ہو جاتی، لیکن صحابہؓ و تابعینؒ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شدت سے اس فتنے کی سرکوبی کی، نتیجہ یہ کہ شیعہ عقائد و نظریات "تقیہ" کی نقاب اوڑھنے پر مجبور ہو گئے۔

بعد میں شیعوں میں بہت سے فرقے ہوئے، جن کی تفصیل حضرت پیرانِ پیر شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی کتاب "غنیۃ الطالبین" اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہی میں سے ایک فرقہ "شیعہ امامیہ" یا "شیعہ اثنا عشریہ" کہلاتا ہے، اور یہی فرقہ آج کل عام طور سے "شیعہ" کہلاتا ہے، ان کے عقائد کی تفصیل کا اس وقت موقع نہیں، البتہ ان کے چند اصول حسبِ ذیل ہیں:

۱:۔ نظریۂ امامت:... شیعہ مذہب کی اصل الاصول بنیاد "عقیدۂ امامت" ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث کئے

جاتا تھا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا جائے گا۔ وہ شیعہ عقیدہ میں نبی کی طرح ہر غلطی سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں، ان پر وحی نازل ہوتی ہے، ان کی اطاعت ہر بات میں نبی کی طرح فرض ہے، وہ نبی کی طرح احکامِ شریعت مقرر کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قرآن کریم کے جس حکم کو چاہیں منسوخ یا معطل بھی کر سکتے ہیں۔

گویا اسلامی عقیدے میں جو مفہوم، جو حیثیت اور جو مرتبہ ایک "مستقل صاحبِ شریعت نبی" کا ہے، ٹھیک وہی مفہوم، وہی حیثیت اور وہی مرتبہ شیعوں کے نزدیک "امامِ معصوم" کا ہے۔

شیعوں کا یہ "نظریۂ امامت" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے خلاف ایک بغاوت اور اسلام کی ابدیت کے خلاف ایک کھلی سازش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ قدیم سے لے کر مرزا غلام احمد قادیانی تک، جن جن لوگوں نے نبوت و رسالت کے جھوٹے دعوے کئے، انہوں نے اپنے دعووں کو محض شیعوں کے "نظریۂ امامت" ہی سے مستعار لیا۔

شیعہ مذہب کا نظریۂ امامت فطری طور پر ختم ہونا تھا، یہی وجہ ہے کہ شیعہ مذہب بھی اس کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکا، چنانچہ اس نے "امامت" کا سلسلہ "بارہویں امام" پر ختم کرکے اسے ۲۶۰ھ میں کسی نامعلوم غار (سرمن رائے کے غار) میں ہمیشہ کے لئے غائب کردیا۔ آج ان کو ساڑھے گیارہ سو برس گزر چکے ہیں، کسی کو کچھ خبر نہیں کہ "بارہویں امام" کہاں ہیں؟ اور کس حالت میں ہیں؟

میں شیعہ کے "نظریۂ امامت" پر جتنا غور کرتا ہوں، میرے یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت پر ضرب لگانے اور امت میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کے دعویٰ نبوت و امامت کا چور دروازہ کھولنے کے لئے گھڑا۔ غور فرمایئے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک چھ صدیوں کا طویل عرصہ گزرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جاتا، لیکن جب ختمِ نبوت کا آفتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت تک کی ساری دنیا کو منور

کرنے کے بعد رخصت ہوتا ہے، تو شیعہ عقیدہ کے مطابق خدا ایک دن کیا، ایک لمحے کا وقفہ بھی نہیں کرتا، بلکہ فوراً ایک "امام معصوم" کو کھڑا کر کے اسے شریعت محمدیہ کے حلال، حرام کو بدلنے اور قرآن کو منسوخ کرنے کے اختیارات دے دیتا ہے، اور پھر ایک نہیں لگاتار بارہ امام اسی شان کے بھیجتا رہتا ہے، اور جب اسلام پر اڑھائی صدیوں کا زمانہ گزر جاتا ہے تب تو خدا کہیں "اماموں" کا سلسلہ بند کردیتا ہے، بلکہ بارہواں امام جو بھیجا جاچکا تھا اسے بھی دو سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے غائب کردیتا ہے۔ کیا ایک ایسا شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر ایمان رکھتا ہو، جس کے نزدیک اسلام مٹنے، بدلنے اور مسخ ہونے کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک اپنی اصلی حالت میں باقی رہنے اور چمکنے کے لئے آیا ہو، وہ شیعوں کے "نظریہ امامت" کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرسکتا ہے...؟

شیعہ مذہب جن اکابر کو "امام معصوم" کہتا ہے، انہوں نے کبھی "امامت" کا دعویٰ کیا، نہ مخلوقِ خدا کو اپنی اطاعت کی دعوت دی، بلکہ وہ سب کے سب اہل سنت کے اکابر اور مسلمانوں کی آنکھوں کا نور تھے، ان کا دین، مذہب، ان کا طور طریق اور ان کی عبادت بھی شیعوں کے اصول و عقائد کے مطابق نہیں ہوتی، بلکہ وہ سب صحابہ و تابعین کے طریقے پر تھے، وہی دین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے اور جس پر ساری دنیا کے مسلمان چل رہے تھے۔ یہ اکابر بھی ساری دنیا کے سامنے اسی پر عمل کرتے تھے، مگر شیعہ مذہب کہتا ہے کہ اندر سے ان کے عقائد کچھ اور تھے، مگر ازراہِ تقیہ وہ مسلمانوں کے مطابق عمل کرتے تھے۔ غرض شیعوں کے نزدیک خدا نے "امام معصوم" بنا کر بھیجے بھی تو ایسے لوگوں کو جو دنیا کو کوئی ہدایت نہ دے سکے بلکہ ساری عمر اپنی تقیہ میں چھپے رہے، اور بارہویں امام تو ایسے غائب ہوئے کہ آج تک ان کا کہیں سراغ نہیں، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ شیعوں کا نظریہ امامت نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر ضرب لگاتا ہے، بلکہ یہ سراسر عقل کے بھی خلاف ہے، اور یہ خدائی تعلیم نہیں بلکہ کسی یہودی دماغ کی ایجاد ہے۔

۲- شیعوں کا دوسرا سب سے بڑا اصول صحابہ کرامؓ سے بغض و عداوت ہے۔ شیعوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ جنھوں نے حضرت ابوبکر

besturdubooks.wordpress.com

کون ہے؟ آپ کا جواب ہوگا: "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ"۔۔۔ نعوذ باللہ! استغفر اللہ!

بہرحال شیعوں کا نظریۂ امامت، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے خلاف ایک بغاوت تھا تو ان کا "نظریۂ تبرا" خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے، اور کوئی شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو، یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی پوری جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنکھیں بند کرتے ہی... نعوذ باللہ... گمراہ اور مرتد ہوگئی تھی۔

۳:... شیعوں کا تیسرا عقیدہ اول الذکر دونوں عقیدوں سے بڑھ کر "دو دونی چار" کی طرح اول الذکر دو عقیدوں کا لازمی نتیجہ ہے، اور وہ ہے تحریف قرآن۔

مسلمان تو مسلمان آج تک کسی بدتر سے بدتر کافر کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی ... اور نہ ہی کوئی عقل و خرد والا ایسی جرأت کر سکتا ہے... کہ مسلمانوں کے پاس "قرآن مجید" کے نام سے جو مقدس کتاب محفوظ چلی آتی ہے، اور جس کے ہر زمانے میں ہزاروں نہیں، لاکھوں حافظ موجود رہے ہیں، وہ وہ صحیفہ ہی کی کتاب نہیں جو مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، لیکن آفرین ہے شیعہ مذہب کے موجدوں کو، انہوں نے یہ عقیدہ بھی شیعوں سے منوایا، شیعہ مذہب کہتا ہے کہ قرآن کریم جو موجودہ شکل میں مسلمانوں کے پاس ہے، یہ وہ اصل قرآن نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا، بلکہ یہ صحیفہ عثمانی ہے، "اصلی اور پورا قرآن" بارہویں امام کے ساتھ کسی نامعلوم غار میں چھپا ہوا ہے۔ شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سوائے دو چار کے، ان کے تمام ائمہ مجتہدین و علماء اس کو مانتے آئے ہیں، اور ان کی کتابوں میں ان کے "معصوم اماموں" کی دو ہزار سے زیادہ روایتیں اس پر متفق ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا، کیونکہ جب شیعوں کے بقول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد... معاذ اللہ... سارے صحابہ مرتد ہوگئے تھے تو ان کے ذریعے سے حاصل شدہ قرآن کریم پر ایمان کیسے ہوسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جن دو چار شیعہ علماء نے یہ کہا کہ قرآن صحیح سالم محفوظ چلا آتا ہے، ان کو سب سے پہلے صحابہ کرام بشمول حضرت عمر کی عظمت و بزرگی پر ایمان لانا پڑا۔ گویا شیعہ مذہب کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوئے کوئی شخص قرآن پر ایمان لا ہی نہیں سکتا، اور

کسی شیعہ کا قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن ہے۔

شیعوں کے عقائد و نظریات اور بھی بہت ہیں، اور میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف انہی تین عقیدوں پر غور کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ شیعہ مذہب کو اسلام سے کیا نسبت ہے...؟

میں نے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دینے کے لئے ایک خط کھینچ کر فرمایا کہ "یہ تو خدا کا راستہ ہے" اور اس کے اردگرد کچھ خطوط کھینچ کر فرمایا کہ "یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو اس کی دعوت دے رہا ہے۔"

اس ارشاد کی روشنی میں عرض کروں گا کہ شیعہ مذہب، خدا تعالیٰ کے راستے کے مقابلے میں وہ سب سے پہلا راستہ ہے جو شیطان نے خدا کی مخلوق کو گمراہ کرنے کے لئے اپنے یہودی ایجنٹوں کے ذریعے ایجاد کیا۔

شیعہ مذہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پہلے دن سے امت کا تعلق اس کے مقدس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کاٹ دینا چاہا، اس نے اسلام کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، اور اسلام کے بالمقابل ایک نیا دین تصنیف کر ڈالا۔ آپ سن چکے ہوں گے کہ شیعہ مذہب اسلام کے کلمے پر راضی نہیں، بلکہ اس میں "علی ولی اللہ، وصی رسول اللہ و خلیفتہ بلا فصل" کی پیوندکاری کرتا ہے۔ بتائیے! جب اسلام کا کلمہ اور قرآن بھی شیعوں کے لئے لائق تسلیم نہ ہو تو کس چیز کی کسر باقی رہ جاتی ہے...؟ اور ساری نبوت کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض و عداوت کی، جس سے ہر مومن کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے مخاطب ہیں، ان کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک حصہ ہے، ان کے اخلاق و کردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہیں، وہ بعد میں آنے والی پوری امت کے معلم اور مرشد ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کی امانت ان کے سپرد کر کے دنیا

سے رحمت فرما ہوئے، اور بعد میں آنے والی امت کو جو چیز ملی ہے وہ انہی کے طفیل اور انہی کی محنتوں کے صدقے سے ملی۔ اس لئے صحابہ کرام سے محبت دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تعلق کی بنا پر ہے، اور صحابہ کرام سے عداوت دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت ہے۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے، اور ان کی شان میں گستاخی نہ صرف محرومی کی بات ہے بلکہ سلب ایمان کا موجب ہے۔ اس لئے میرا عقیدہ اہل سنت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آل و اصحاب دونوں کی خاک پا کو اکسیر سعادت اور تبرک سمجھا جائے۔

جس شخص کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا بھی تعلق ہوگا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کو محبوب رکھے گا۔ چہ جائیکہ وہ اکابر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار ہوئے اور جن کو انہی کی قربانیوں کے طفیل دولت ایمان نصیب ہوئی۔ اس لئے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنانے والے میرے نزدیک گمراہ ہیں، اسی طرح میں ان لوگوں کی رائے کو بھی صریح گمراہی سمجھتا ہوں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کسی گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یا یزید کی حمایت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں یاوہ گوئی کرتے ہیں۔ میں تمام آل و اصحاب کی محبت و عظمت کو جزو ایمان سمجھتا ہوں، اور ان میں سے کسی ایک بزرگ کی تنقیص، خواہ اشارے کنائے کے رنگ میں ہو، اسے سلب ایمان کی علامت سمجھتا ہوں۔ یہ میرا عقیدہ ہے اور میں اسی عقیدے پر اپنے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

دونوں فریقوں میں سے جس کی جو تحقیق ہو اس کے لئے اسی پر عمل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر اہل حدیث حضرات کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق پر اطمینان نہیں، تو انہیں اس پر کیوں مجبور کیا جائے؟ اسی طرح اگر حنفی مسلک کے نزدیک اہل حدیث حضرات کی تحقیق لائق اطمینان نہیں تو کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان کی تحقیق پر ہی عمل کریں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ یہ فروعی اختلاف حضرات صحابہ کرام، سلف صالحین اور ائمہ ہدیٰ کے درمیان بھی رہے ہیں، اور یہ اختلاف اگر اپنی حد کے اندر رہے تو سراپا رحمت ہے کہ امت کے کسی نہ کسی فرد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت کو کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن میں ان مسائل میں تشدد کو روا نہیں سمجھتا، جس کے ذریعہ ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف زبان طعن دراز کرے، اور ان فروعی مسائل کی بنا پر ایک دوسرے کو گمراہ سمجھا جائے۔ اس تشدد کے بعد یہ اختلاف رحمت نہیں رہے گا بلکہ زحمت بن جائے گا، اور امت کی ساری توجہ ان فروعی مسائل میں غرق ہوکر ختم ہو جائے گی۔ ہر ایک چیز اپنی حد کے اندر ہے تو اچھی لگتی ہے، اور جب اپنی حد سے نکل جائے تو وہ مذموم بن جاتی ہے، یہی حال ان فروعیات کا ہے۔

فقہی و مذہبی اختلاف کی دوسری قسم وہ ہے جس کو میں "نظریاتی اختلاف" سمجھتا ہوں، اور اس میں میری رائے اہل حدیث حضرات (جن کو آپ نے "وہابی" لکھا ہے، اور عام طور پر انہیں "غیر مقلد" کہا جاتا ہے) کے ساتھ متفق نہیں، بلکہ میں ان کے موقف کو غلط سمجھتا ہوں۔ اصولی طور پر یہ اختلاف دو نکتوں میں ہے، اول یہ کہ اہل حدیث حضرات کے نزدیک کسی معین امام کی اقتدا نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ہر شخص کو قرآن و حدیث سے جو بات سمجھ آئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ یہ مسئلہ "تقلید اور ترک تقلید" کے عنوان سے مشہور ہے، اور ایک بہت بڑی معرکۃ الآرا بحث ہے، اور جس پر دونوں طرف سے بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، مگر میں اس سلسلے میں چند معروضات پیش کردینا کافی سمجھتا ہوں۔

۱:... تقلید کے معنی ہیں: "کسی لائق اعتماد کی بات کو بغیر مطالبۂ دلیل تسلیم کرلینا" جس آدمی کی بات نقل کی جارہی ہے، اگر وہ ہمارے نزدیک لائق اعتماد نہیں تو ظاہر ہے

besturdubooks.wordpress.com

کہ اس کی بات ماننا ہی غلط ہوگا، اور اگر وہ اپنے فن کا ماہر ہے تو ایک عام آدمی کا اس سے دلیل کا مطالبہ کرنا غلط ہوگا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے کہ آپ کسی طبیب یا ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، اور وہ آپ کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرتا ہے، اگر وہ طبیب اپنے فن کا ماہر ہی نہیں، بلکہ محض عطائی ہے تو آپ کا اس کے پاس تشریف لے جانا ہی غلط ہوگا، اور اگر وہ اپنے فن کا مستند ماہر ہے تو اس کے تجویز کردہ نسخے کی ایک ایک چیز کے اجزاء کے بارے میں آپ کا بحث کرنا، اور ایک ایک بات کے لئے دلیل کا مطالبہ کرنا قطعاً نادرست اور نا روا ہوگا۔

وجہ یہ کہ ایک عام آدمی کسی ماہر کے پاس جاتا ہی اس وقت ہے جب وہ مسئلہ اس کی عقل وفہم کی سطح سے اونچا ہو، ٹھیک اسی طرح دین و شریعت کا معاملہ سمجھنا چاہئے۔ دین کے وہ مسائل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آرہے ہیں، اور جن کو ہر شخص جانتا ہے کہ دین کا مسئلہ یہ ہے، اس کے بارے میں کسی مسلمان کو نہ کسی عالم کے پاس جانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور نہ کوئی جاتا ہے۔ دینی مسائل میں اہل علم کی طرف رجوع کی ضرورت اسی وقت لاحق ہوتی ہے جبکہ ہم ایسے عامی لوگوں کی ذہنی سطح سے وہ مسئلہ اونچا ہو۔ ایسی حالت میں دو صورتیں ممکن ہیں، ایک تو یہ کہ ہم خود قرآن و حدیث کھول کر بیٹھ جائیں اور ہماری اپنی عقل وفہم میں جو بات آئے اسے "دین" سمجھ کر اس پر عمل کرنے لگیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ جو حضرات قرآن و سنت کے ماہر ہیں، ان سے رجوع کریں اور انہوں نے اپنی مہارت، وسیع تجربہ اور خداداد بصیرت سے قرآن و حدیث میں غور کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس پر اعتماد کریں، پہلی صورت خود رائی کی ہے، اور دوسری صورت کو "تقلید" کہا جاتا ہے جو عین تقاضائے عقل و فطرت کے مطابق ہے۔

ماہرین شریعت کی تحقیقات سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک ایک مسئلے کے لئے قرآن و حدیث میں غور کرنے والے عامی شخص کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی شخص بہت سی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جائے، اور ماہرین فن سے رجوع کرنے کے بجائے یہ سوچے کہ میں بھی انسان ہوں، اور اس مشکل کا حل وہ یہ تجویز کرے کہ طب کی مستند اور اونچی اونچی کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ شروع کردے، اور پھر اپنے ناقص مطالعہ کا تجربہ خود اپنی ذات پر کرنے لگے، [illegible]

سمجھا جانے لگا، اس زمانے میں یہی خیر کی بات تھی، اس لئے کہ اب لوگوں میں دین و تقویٰ کی کمی آگئی تھی، اگر ایک معین امام کی تقلید کی پابندی نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی پسند کے مسائل چن چن کر ان پر عمل کیا کرتا اور دین ایک کھلونا بن کر رہ جاتا۔ پس اس خودرائی کا ایک ہی علاج تھا کہ شخص کو کسی ایک ماہر شریعت کے فتویٰ پر عمل کرنے کا پابند کیا جائے، اور اسی کا نام "تقلید شخصی" ہے۔

۵:... اہل حدیث حضرات کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ چونکہ تقلید کا رواج تین صدیوں بعد ہوا ہے، اس لئے وہ "بدعت" ہے۔ مگر تقلید کو بدعت کہنا ان کی غلطی ہے، اس لئے کہ اول تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ان اہل حدیث حضرات کے سوا، جن کا وجود تیرہویں صدی میں بھی نہیں تھا، باقی پوری امت محمدیہ گمراہ ہوگی... نعوذ باللہ... اور یہ ٹھیک وہی نظریہ ہے جو شیعہ مذہب حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں پیش کرتا ہے، اور چونکہ اسلام قیامت تک کے لئے آیا ہے، اس لئے پوری امت کا ایک لمحے کے لئے بھی گمراہی پر متفق ہونا باطل ہے۔

دوسرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی یہ دستور تھا کہ ناواقف اور عامی لوگ اہل علم سے مسائل پوچھتے اور ان کے فتویٰ پر بغیر طلب دلیل عمل کرتے تھے، اور اسی کو تقلید کہا جاتا ہے، گویا "تقلید" کا لفظ اس وقت اگرچہ استعمال نہیں ہوتا تھا مگر تقلید کے معنی پر لوگ اس وقت بھی عمل کرتے تھے۔ سو آپ اس کا نام اب بھی تقلید نہ رکھئے، "اقتدا و اتباع" رکھ لیجئے۔

تیسرے، فرض کرو اس وقت تقلید کا رواج نہیں تھا، تب بھی اس کو بدعت نہیں کہا جاسکتا ہے، اس لئے کہ دین و شریعت پر چلنا تو فرض ہے، اور میں اوپر بتا چکا ہوں کہ آج جو شخص "تقلید" کے بغیر شریعت پر چلنے کی کوشش کرے گا، وہ کبھی نفس و شیطان کے مکر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے غیر مجتہد حضرات کے دین پر چلنے کا یہی ایک ذریعہ ہے، اور وہ ہے کسی ایک ماہر شریعت امام کی پیروی۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو اہل حدیث حضرات بھی معدودے چند مسائل کے سوا، اپنے علماء محدثین کی ہی پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے تو

besturdubooks.wordpress.com

دیوبندی بریلوی اختلاف

تیسرا اختلاف جس کے بارے میں آپ نے میری رائے طلب کی ہے، وہ "دیوبندی بریلوی اختلاف" ہے، اور آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے؟ میرے نزدیک "دیوبندی بریلوی اختلاف" کا لفظ ہی موجبِ حیرت ہے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ شیعہ سنی اختلاف تو صحابہ کرامؓ کو ماننے نہ ماننے کے مسئلے پر پیدا ہوا، اور حنفی وہابی اختلاف ائمہ مجتہدینؒ کی پیروی کرنے نہ کرنے پر پیدا ہوا۔ لیکن "دیوبندی بریلوی اختلاف" کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے، اس لئے کہ یہ دونوں فریق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، عقائد میں دونوں فریق امام ابوالحسن اشعری اور امام ابومنصور ماتریدی رحمہما اللہ کو امام و مقتدا مانتے ہیں، تصوف و سلوک میں دونوں فریق اولیاء اللہ کے چاروں سلسلوں قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی میں بیعت کرتے کراتے ہیں۔

الغرض یہ دونوں فریق اہلِ سنت والجماعت کے تمام اصول و فروع میں متفق ہیں، صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کی عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مقلد اور مجدد الف ثانیؒ و شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تک سب اکابر کے عقیدت مند ہیں، اور اکابر اولیاء اللہ کی کفش برداری کو سعادتِ دارین جانتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان مجھے اختلاف کی کوئی صحیح بنیاد نظر نہیں آتی، تاہم میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ان کے درمیان چند امور میں اختلاف ہے، اس مسئلے میں کسی فریق کی مذمت کے بجائے قرآن و سنت اور فقہ حنفی کی تصریحات کی روشنی میں ان کے مختلف فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کردینا کافی سمجھتا ہوں۔

ان دونوں کے درمیان جن نکات میں اختلاف ہے، وہ یہ ہیں:

besturdubooks.wordpress.com

۱:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے یا بشر؟
۲:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے یا نہیں؟
۳:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟
۴:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کل ہیں یا نہیں؟ اس کائنات کے تمام اختیارات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں ہیں یا اللہ تعالیٰ کے قبضے میں؟

ان مسائل میں جس فریق کا عقیدہ قرآنِ کریم، ارشاداتِ نبوی، تعامل صحابہؓ اور فقہ حنفی کے مطابق ہوگا، میں اسے حق پر سمجھتا ہوں، اور دوسرے کو غلطی پر۔ اب میں نہایت اختصار کے ساتھ ان متنازع فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں۔

۱:... نور اور بشر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لحاظ سے نہ صرف نوعِ بشر میں داخل ہیں، بلکہ افضل البشر ہیں، نہ صرف انسان ہیں، بلکہ نوعِ انسان کے سردار ہیں، نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، بلکہ آدم و اولادِ آدم کے لئے سرمایۂ صد افتخار ہیں... صلی اللہ علیہ وسلم... خود ارشاد نبوی ہے:

"انا سید ولد اٰدم یوم القیامۃ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۱۱)

ترجمہ: "میں اولادِ آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن۔"

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بشر، انسان اور آدمی ہونا نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فخر و افتخار ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر ہونے سے انسانیت و بشریت رشکِ ملائکہ ہے۔

جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نوع کے اعتبار سے بشر ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفتِ ہدایت کے لحاظ سے ساری انسانیت کے لئے مینارۂ نور ہیں، یہی "نور" ہے جس کی روشنی میں انسانیت کو خدا تعالیٰ کا راستہ مل سکتا ہے، اور جس کی روشنی ابد تک درخشندہ و تابندہ رہے گی، لہٰذا میرے عقیدے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت نور

besturdubooks.wordpress.com

سے کم کیا ہے۔"

اور یہ مثال بھی محض سمجھانے کے لئے ہے، ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم کے ساتھ کیا نسبت؟ (حاشیہ صحیح بخاری ج:۱ ص:۲۳۸) یہی سبب ہے کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ "عالم الغیب" کا لفظ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اور بہت سی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کی گئی ہے، بیسویں پارے کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفاتِ الوہیت ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا:

"قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ
إِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ." (النمل:۶۵)

ترجمہ... "فرما دیجئے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جتنی
مخلوق بھی موجود ہے، ان میں سے کوئی غیب نہیں جانتا، اللہ کے سوا،
اور ان کو خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے؟"

اسی طرح بہت سی احادیث میں بھی یہ مضمون ارشاد ہوا ہے، ان آیات و احادیث کو نقل کیا جائے تو ان کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں ہوگی، اور ہمارے تمام ائمہ اہل سنت اور اکابر احناف رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو "عالم الغیب" کہنا صحیح نہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ: "جو شخص یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے، اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا۔"

(صحیح بخاری، مشکوٰۃ شریف ص:۵۰۱)

اور فقہ حنفی کی مشہور کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ: "جس شخص نے کسی عورت سے گواہوں کے بغیر نکاح کیا، اور یہ کہا کہ: "ہم خدا اور رسول کو گواہ بناتے ہیں" تو وہ کافر ہو جائے گا۔" (فتاویٰ عالمگیری ج:۲ ص:۲۸۲) اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "عالم الغیب" سمجھا، اور ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔

(فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ج:۱ ص:۳۳۳، بحرالرائق ج:۳ ص:۹۹)

بعض لوگ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں بلکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں" یہ کلمہ کفر ہی کہہ کر تحقیق کفر کے مرتکب ہو جاتے ہیں دراصل یہ حضرات یہی نہیں جانتے کہ "علم غیب" کسے کہتے ہیں؟ ہمارے ائمہ احناف کی مشہور تفسیر "مدارک" میں لکھا ہے:

"والغیب: ھو ما لم یقم علیہ دلیل ولا اطلع علیہ مخلوق۔"

ترجمہ:... "یعنی "غیب" ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن پر کوئی دلیل قائم نہیں، اور نہ کسی مخلوق کو ان کی اطلاع ہے۔"

پس جن امور کا علم انبیائے کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی عطا کر دیا جاتا ہے یا جو چیزیں اولیائے کرام کو بذریعہ الہام یا کشف معلوم ہو جاتی ہیں، ان پر "غیب" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم مبارکہ اس قدر ہیں کہ ان کی وسعت کا اندازہ کسی انسان، کسی جن اور کسی فرشتے کو نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم علم الٰہی کے مساوی نہیں، اور نہ قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ حنفی کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو "عالم الغیب" کہنا صحیح ہے۔

۳:... حاضر و ناظر

اس نکتے پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے "حاضر و ناظر" کا مطلب سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ دونوں عربی کے لفظ ہیں، جن کے معنی ہیں: "موجود اور دیکھنے والا" اور جب ان دونوں کو ملا کر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے: "وہ شخصیت جس کا وجود کسی خاص جگہ میں نہیں، بلکہ اس کا وجود بیک وقت ساری کائنات کو محیط ہے، اور کائنات کی ایک ایک چیز کے تمام حالات اول سے آخر تک اس کی نظر میں ہیں۔" میرا عقیدہ یہ ہے کہ "حاضر و ناظر" کا یہ مفہوم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر صادق آتا ہے، اور یہ صرف اسی کی شان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روضہ اطہر میں استراحت فرما ہیں، اور دنیا بھر کے مشتاقان زیارت وہاں حاضری دیتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ کہ آپ کسی اجتماع

وسلم ہر جگہ موجود ہیں، اور کائنات کی ایک ایک چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ہے، یہ بات عقل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں، چہ جائیکہ یہ شرعاً درست ہو۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور اس کو کسی دوسری شخصیت کے لئے ثابت کرنا غلط ہے۔

اور اگر "حاضر و ناظر" ماننے والوں کا یہ مطلب ہے کہ اس دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ طیبہ کو اجازت ہے کہ جہاں چاہیں تشریف لے جائیں، تو اول تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر جگہ "حاضر و ناظر" ہونا ثابت نہیں ہوتا، پاکستان کے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ ملک کے جس حصے میں جب چاہے جاسکتا ہے، کیا اس اجازت کا کوئی شخص یہ مطلب سمجھے گا کہ پاکستان کا ہر شہری پاکستان میں "حاضر و ناظر" ہے؟ کسی جگہ جانے کی اجازت ہونے سے وہاں واقعتاً حاضر ہونا تو لازم نہیں آتا۔ اس کے علاوہ جب کسی خاص جگہ (مثلاً کراچی) کے بارے میں کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں حاضر ہیں، تو یہ ایک مستقل دعویٰ ہے، جس کی دلیل کی ضرورت ہوگی، چونکہ اس کی کوئی دلیلِ شرعی موجود نہیں، اس لئے بغیر دلیلِ شرعی کے اس کا عقیدہ رکھنا ناجائز ہوگا۔ بعض لوگ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں، بلکہ تمام اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں، مجھے ان حضرات کی سخاوت پر تعجب ہوتا ہے کہ دریا دلی فیاضی سے اللہ تعالیٰ شانہ کی صفات اس کی مخلوق میں تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ بہرحال ائمہ اہلِ سنت کے نزدیک یہ جسارت قابلِ برداشت نہیں، فتاویٰ بزازیہ میں فرماتے ہیں:

"قال علماؤنا: من قال: أرواح المشايخ حاضرة تعلم، يكفر." (بزازیہ برحاشیہ ہندیہ ج:٦ ص:٣٢٦)

ترجمہ:... "ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ بزرگوں کی روحیں حاضر ہیں اور وہ سب کچھ جانتی ہیں، ایسا شخص کافر ہے۔"

٣:... مختارِ کل:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدائی صفات ثابت کرنے کا صاف صاف نتیجہ

یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدائی اختیارات میں بھی حصہ دار تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ فاضل بریلوی نے یہ عقیدہ بڑی شد ومد سے پیش کیا ہے کہ پوری کائنات عالم کے تصرف واختیارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختیارات عطا کر دیئے ہیں۔

اسی لئے یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "مختار کل" کا خطاب دیتے ہیں۔

لیکن قرآن کریم، حدیث نبوی اور عقائد اہل سنت میں اس عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے کل یا بعض اختیارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور کو دے دیئے ہیں۔ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ عزت، ذلت، موت، حیات، صحت و مرض، عطا و بخشش سب اسی کے ہاتھ میں ہے، یہی وجہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجائیں اور دعائیں کرتے اور اسی کو ہر قسم کے نفع ونقصان کا مالک سمجھتے رہے ہیں، یہی حال تمام اکابر اولیاء اللہ کا ہے، کسی نبی، ولی اور صدیق وشہید نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے کائنات میں تصرف کا حق دے دیا گیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں جو عقیدہ تھا وہ یہ ہے:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا اے لڑکے! تو اللہ کے حقوق کی حفاظت کر، اللہ تیری حفاظت کرے گا، تو اللہ کے حقوق کی حفاظت کر تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، اور جب تجھے مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ، اور جب مدد کی ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر، اور یقین رکھ کہ ساری امت اگر تجھے کوئی نفع پہنچانے پر جمع ہو جائے تو تجھے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی، سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے، اور اگر ساری جماعت تجھے کوئی نقصان پہنچانے پر جمع

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہو جائے تو تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، سوائے اس کے جو اللہ
تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔" (مشکوٰۃ شریف ص ۴۵۳)

شیخ علی القاری رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اللہ سے مانگ، یعنی صرف اللہ تعالیٰ سے مانگ، اس
لئے کہ عطیات کے خزانے اسی کے پاس ہیں، اور عطا و بخشش کی
کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر نعمت یا رحمت خواہ دنیوی ہو یا
آخرت کی، جو بندے کو پہنچتی ہے، یا اس سے دفع ہوتی ہے، وہ بغیر
کسی شائبہ غرض یا شمولِ علت کے صرف اسی کی رحمت سے ہوتی ہے،
کیونکہ وہ جوادِ مطلق ہے، اور وہ ایسا غنی ہے کہ کسی کا محتاج نہیں، اس
لئے امید صرف اسی کی رحمت سے ہونی چاہئے، اور اسی کی نقمت
سے ڈرنا چاہئے، بڑی بڑی مہمات میں التجا اسی کی بارگاہ میں ہونی
چاہئے، اور تمام امور میں اعتماد اسی کی ذات پر رکھنا چاہئے۔ اس کے
سوا کسی سے نہ مانگے، کیونکہ اس کے سوا کوئی نہ دعا سننے پر قادر
ہے، نہ دینے پر، نہ مصیبت ٹالنے پر، نہ نفع پہنچانے پر، کیونکہ اس
کے سوا خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، اور نہ وہ
موت و حیات اور جی اٹھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔"

اور آگے "ساری امت" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سب مخلوق ساری امت، یعنی تمام مخلوق، خاص و عام،
انبیاء و اولیاء، اور ساری امت بالفرض اس بات پر متفق ہو جائیں کہ
دنیا یا آخرت کے کسی معاملے میں تجھے کسی چیز کا نفع پہنچائیں تو تجھے
نفع پہنچانے پر قادر نہیں۔" (مرقاۃ المفاتیح ج:۵ ص:۹۱)

اور حضرت پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ "الفتح الربانی" کی مجلس نمبر:۱۱
میں فرماتے ہیں:

"إن الخلق عجز عنده، لا ملك بأيديهم ولا ملك، لا غنى بأيديهم ولا فقر، ولا ضر بأيديهم ولا نفع، ولا ملك عندهم إلا لله عز وجل. لا قادر غيره، ولا معطي ولا مانع ولا ضار ولا نافع غيره، ولا محيي ولا مميت غيره۔"

ترجمہ: "بے شک مخلوق عاجز اور معدوم محض ہے، نہ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے اور نہ ملک، نہ مالداری ان کے قبضے میں ہے، نہ فقر، نہ نقصان ان کے ہاتھ میں ہے اور نہ نفع، نہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے پاس کوئی ملک ہے اور نہ اس کے سوا کوئی قادر ہے، نہ اس کے سوا کوئی دینے والا ہے، نہ روکنے والا، نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ نفع دے سکتا ہے، نہ اس کے سوا کوئی زندگی دینے والا ہے، نہ موت۔"

یہی عقیدہ تمام اولیاء اللہ کا اور تمام اکابر اہل سنت کا ہے، اور حق تعالیٰ شانہ انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاتھ پر بطور معجزہ کے، اور اولیاء اللہ کے ہاتھ پر بطور کرامت کے جو چیزیں ظاہر فرماتے ہیں وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے، اسی لئے اس کو "معجزہ" اور "کرامت" کہا جاتا ہے۔ معجزہ اور کرامت کو دیکھ کر ان کو خدائی میں شریک اور کائنات کا مالک و مختار سمجھ لینا حماقت ہے۔ یہی حماقت عیسائیوں سے سرزد ہوئی، جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر (مثلاً مردوں کو زندہ کرنے کے) ان کو خود خدائی کا مالک سمجھ لیا۔ قرآن کریم کی دعوت کا سب سے اہم ترین موضوع اور انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد حق تعالیٰ کی توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال ہے۔ قرآن کریم نے حق تعالیٰ شانہ کی الوہیت کے جو دلائل بار بار مختلف پیرایوں میں بیان فرمائے ہیں ان میں سب سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ بتاؤ! کائنات میں متصرف کون ہے؟ رزق کون دیتا ہے؟ موت و حیات اور صحت و مرض کس کے قبضے میں ہے؟ نفع و نقصان کا کون مالک ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو اگر دوسروں کے لئے ثابت کیا

جائے تو قرآن کریم کا تقریباً ایک تہائی حصہ باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو احکام صادر ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تشریعی احکام، جو انبیائے کرام علیہم السلام کی معرفت بندوں کو دیئے گئے ہیں۔ اور دوسرے تکوینی احکام، جو کائنات کی ہر چیز پر حاوی ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے تشریعی احکام سے کوئی مکلف مستثنیٰ نہیں، خواہ وہ خدا تعالیٰ کا کتنا ہی مقرب ہو، اسی طرح اس کے تکوینی احکام سے کوئی مخلوق خارج نہیں، خواہ وہ کون سی مخلوق ہو، یہاں تک کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام ہوں یا خدا تعالیٰ کے فرشتے، ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کی پابند اور اس کی قضا و قدر کے تحت ہے۔ لوگ انبیاء و اولیاء کو کائنات کے اختیارات تفویض کرتے ہیں، حالانکہ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت نصیب فرمائی ہے، وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے ہاتھ میں "مردہ بدست زندہ" کی طرح سمجھتے ہیں، اور ہم جیسے محجوب لوگ جو اپنی خود مختاری پر ناز کرتے ہیں، حضرات عارفین تو اس سے بھی براءت کا اظہار کرتے ہیں، اس لئے انبیاء و اولیاء کو کائنات میں متصرف سمجھنا خود ان اکابر کے ذوق و مسلک اور ان کی دعوت کے خلاف ہے۔

یہ چار تو وہ اہم ترین مسائل ہیں، جن کا تعلق عقیدے سے ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور امور میں بھی جھگڑا ہے، میں ان کے بارے میں بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کئے دیتا ہوں۔

غیر اللہ کو پکارنا:

ان میں سے ایک مشہور مسئلہ یہ ہے کہ "یا رسول اللہ" کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں میری رائے یہ ہے کہ "یا رسول اللہ" کہنے کی کئی صورتیں ہیں، اور سب کا حکم ایک نہیں۔ مثلاً: ایک صورت یہ ہے کہ شعراء اپنے تخیل میں جس طرح باد صبا کو خطاب کرتے ہیں، اور کبھی پہاڑوں اور جنگلوں کو، کبھی حیوانات اور پرندوں کو، ان میں سے کسی کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ جن کو وہ خطاب کر رہے ہیں، وہ ان کی بات کو سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں، بلکہ یہ محض ایک ذہنی پرواز اور تخیل کی چیز ہوتی ہے، جس پر اخلاقی احکام جاری نہیں ہوتے۔ اسی طرح شعراء کے کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دیگر مقبولانِ الٰہی

تو خیالی طور پر یہ خطاب کیا جاتا ہے، میں اس کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح عشاق اپنے محبوبوں کو خطاب کرتے ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض غلبۂ محبت کی وجہ سے خطاب کیا جائے، اور تخاطب مقصود نہ ہو، یا جس طرح کسی دکھی شخص کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اپنی ماں کا نام لے کر پکارتی ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کی آواز اس کی ماں تک نہیں پہنچ رہی، اس کے باوجود وہ اپنی مامتا کی وجہ سے ایسا کرنے پر گویا مجبور ہے۔ اسی طرح جو عشاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عشق میں وارفتہ حال ہو چکے ہوں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے ہیں تو کسی کیفیت جذب کی بنا پر ہو، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی آواز براہ راست وہاں تک نہیں پہنچتی، ان کا "یا رسول اللہ" کہنا بھی جائز ہوگا، بشرطیکہ عقیدے میں فساد نہ ہو۔

ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" کے صیغے سے درود شریف پڑھتا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اس درود کو بارگاہِ اقدس میں پہنچا دیں گے، اس کے اس فعل کو بھی ناجائز نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهٗ وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ نَائِیًا اُبْلِغْتُهٗ۔" (مشکوٰۃ ص:۸۷)

ترجمہ: "جو شخص مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے، میں اسے خود سنتا ہوں، اور جو شخص مجھ پر دور سے درود شریف پڑھے، وہ مجھے پہنچایا جائے گا۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

"اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْاَرْضِ يُبَلِّغُوْنِيْ مِنْ اُمَّتِي السَّلَامَ۔" (مشکوٰۃ ص:۸۶)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے زمین میں پھرتے رہتے ہیں، وہ میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

"لا تجعلوا بيوتكم قبورا ولا تجعلوا قبري عيدا وصلّوا عليّ فان صلوتكم تبلغني حيث كنتم."

(مشکوٰۃ ص ۸۶)

ترجمہ: "اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ، اور میری قبر کو میلہ نہ بنا لینا، اور مجھ پر درود شریف پڑھا کرو، کیونکہ تم جہاں سے بھی درود پڑھو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔"

اگرچہ اس کے لئے بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ درود و سلام بھیجنے کا جو طریقہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اسی کو اختیار کرے، تاہم اگر درود میں خطاب کا صیغہ استعمال کرے، اس کے باوجود اگر اس کے عقیدے میں کسی قسم کا فساد نہیں، یا اس کے کہنے سے کسی دوسرے کے عقیدے میں بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں تو اس کے "یا رسول اللہ" کہنے کو ناجائز نہیں کہا جائے گا، ہاں! اگر فسادِ عقیدہ کا اندیشہ ہو تو ناجائز کے حکم میں ہوگا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اس نیت سے "یا رسول اللہ" کہتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر شخص کی بات سنتے ہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حاضر ناظر ہیں اور ہر شخص کی بات سنتے ہیں، پس اس صورت کو شرک کہا جائے گا۔

یہ عقیدہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، غلط ہے، اور قرآن کریم، حدیث نبوی اور عقل میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ عوام حدود کی رعایت نہیں کیا کرتے ہیں، اس لئے سلف صالحین اس معاملے میں بڑی احتیاط فرماتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے، ہم التحیات میں "السلام علیک ایہا النبی" پڑھا کرتے تھے، پھر جب آپ کا وصال ہوگیا تو ہم اس کے بجائے "السلام علی

النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کہتے تھے۔" (ج: ۳ ص: ۹۲۹)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا مقصد اس سے یہ جتانا تھا کہ "التحیات" میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کے صیغے سے سلام کیا جاتا ہے، وہ اس عقیدے پر مبنی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و موجود ہیں، اور ہر شخص کے سلام کو خود سماعت فرماتے ہیں، نہیں! بلکہ یہ خطاب کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے سلام کی حکایت ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں فرمایا تھا۔

"یا رسول اللہ" کہنے کی پانچویں صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوکر مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہوکر پڑھے: "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ اطہر میں حیات ہیں، اور زائرین کے سلام کو سماعت فرماتے اور اس کا جواب مرحمت فرماتے ہیں، اس لئے وہاں حاضر خطاب کرنا نہ صرف جائز بلکہ احسن ہے۔

یہ ہیں وہ چند صورتیں، جن میں سے ہر ایک کا حکم میں عرض کرچکا ہوں۔ اب ہمارے یہاں جو لوگ "یا رسول اللہ" کہتے ہیں، وہ کس نیت؟ کس کیفیت؟ اور کس مقصد سے کہتے ہیں؟ اس کا فیصلہ آپ خود کرسکتے ہیں۔ البتہ یہاں دو مسئلے اور عرض کردینا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ شیعہ صاحبان نے "نعرۂ حیدری: یا علی!" ایجاد کیا تھا، بعض لوگوں نے ان کی تقلید میں "نعرۂ رسالت: یا رسول اللہ!" اور "نعرۂ غوثیہ: یا غوث!" ایجاد کرلیا۔ مگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور ائمہ ہدیٰ کی زندگی میں کہیں نظر نہیں آیا کہ "اللہ اکبر" کے سوا مسلمانوں نے کسی اور نام کا نعرہ لگایا ہو، نہ قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ کی کسی کتاب میں اس کا ذکر ہے۔ اس لئے میں اسے شیعوں کی تقلید سمجھتا ہوں، جس سے اہل سنت والجماعت بالکل بری ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح بطور وظیفہ و تقرب حق تعالیٰ کو پکارا جاتا ہے، اور اس کے پاک نام کا وظیفہ پڑھا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور بزرگ ہستی کو پکارنا اور اس کے نام کا وظیفہ پڑھنا اسلام نے جائز نہیں رکھا، کیونکہ یہ فعل عبادت کے زمرے میں

besturdubooks.wordpress.com

میری یہ دُعا قبول فرما، یا میری فلاں مراد پوری فرمادے۔

بعض علماء نے اس توسل کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اپنے کسی نیک عمل کا حوالہ دے کر اور اس کو وسیلہ بنا کر دُعا کرنا تو صحیح ہے، جیسا کہ "حدیثِ اغار" میں تین شخصوں کے اپنے اپنے عمل سے توسل کرنے کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (صحیح بخاری ج:۱ ص:۴۹۳)، مگر کسی شخصیت کے وسیلے سے دُعا کرنا صحیح نہیں۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کسی زندہ شخصیت کے وسیلے سے دُعا کرنا تو جائز ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے دُعا فرمائی تھی (صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۳۷)، مگر جو حضرات اس دُنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں، ان کے توسل سے دُعا کرنا صحیح نہیں۔

مگر میں ان حضرات کی رائے سے متفق نہیں ہوں، کیونکہ توسل میں دُعا تو کسی سے نہیں کی جاتی، بلکہ براہِ راست خدا تعالیٰ سے کی جاتی ہے، پس جب کسی ایسے مقبول بندے کے توسل سے دُعا کرنا جائز ہے جو اس دُنیا میں موجود ہو، تو ان مقبولانِ الٰہی کے توسل سے دُعا کرنا بھی صحیح ہوگا جو اس دُنیا سے رُخصت فرماگئے۔

نیز جب اپنے نیک عمل کے توسل سے دُعا کرنا جائز ہے تو کسی مقبولِ بارگاہِ خداوندی کے توسل سے بھی دُعا کرنا صحیح ہے، کیونکہ اس کی حقیقت دراصل یہ دُعا کرنا ہے کہ: "یا اللہ! میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں، جس کو میں آپ کی بارگاہِ عالی میں پیش کرکے اس کے وسیلے سے دُعا کروں، البتہ فلاں بندہ آپ کی بارگاہ میں مقبول ہے، اور مجھے اس سے محبت و عقیدت کا تعلق ہے، پس اے اللہ! آپ اس تعلق کی لاج رکھتے ہوئے، جو مجھے آپ کے نیک بندوں سے ہے، میری یہ درخواست قبول فرمالیجئے" تو دراصل یہ اپنے اس تعلق کے ذریعے توسل ہے جو اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندوں سے ہے، بلکہ میرے نزدیک اس توسل میں تواضع اور عبدیت کی شان زیادہ پائی جاتی ہے کہ آدمی کو اپنے کسی عمل پر نظر نہ ہو، اور وہ اپنے کسی نیک عمل کو اس لائق نہ سمجھے کہ اسے بارگاہِ خداوندی میں پیش کرے۔

بہرحال توسل کی یہ صورت صحیح اور بزرگانِ دین سے منقول اور ان کا معمول رہی ہے، شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر کس کو یاد نہیں ہوگا:

(المعروف بہ داتا گنج بخش) ، سلطان الہند خواجہ نظام الدین دہلوی اور دیگر اکابر اولیاء اللہ (قدس اللہ اسرارہم) کے مزارات پر لوگوں کو ان بزرگوں سے دعا کرتے ہوئے دیکھا ہے وہ بھی اس فعل کو خالص حاجت سمجھتے ہیں۔ اور یہ دراصل دو غلطیوں کا مجموعہ ہے۔

ایک یہ کہ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی بارگاہ عالی کو بھی دنیا کے شاہی درباروں پر قیاس کر لیا ہے۔ گویا جس طرح دنیا کے بادشاہوں تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی، بلکہ امراء و وزراء کی وساطت اور چپراسیوں اور دربانوں کی منت کشی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح خدا کے دربار میں کوئی شخص براہ راست عرض معروض نہیں کر سکتا، بلکہ بیچ کو درمیانی واسطوں کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔

مگر خدا تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرنا سراسر غلط ہے، اس لئے کہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان واسطوں کی ضرورت تو اس لئے پیش آتی ہے کہ وہ رعایا کی داد و فریاد خود نہیں سن سکتے، اور نہ ہر شخص اپنی آواز براہ راست ان تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے برعکس حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ دنیا کے سارے انسانوں، فرشتوں، جنات اور حیوانات میں سے ایک ایک کی آواز وہ اس طرح سنتے ہیں کہ گویا باقی ساری کائنات خاموش ہے اور صرف وہی ایک گفتگو کر رہا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ نہایت تاریک رات میں سنگ سیاہ پر چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی خدا تعالیٰ سنتے ہیں۔

پھر دنیا کے بادشاہوں تک ہر آدمی کی رسائی ممکن نہیں، مگر خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے اس کی رگ گردن سے بھی قریب ہیں۔ ایک بار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

"اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فننادیہ؟"

(قرطبی ج ۲ ص ۳۰۸)

ترجمہ... "ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ ہم اسے آہستہ پکاریں یا دور ہے کہ زور سے پکاریں؟"

اس پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

besturdubooks.wordpress.com

یہ اختیارات نبیوں، ولیوں، اماموں اور شہیدوں کو عطا کر دیئے ہیں، اور خدائی کے جو شعبے یا علاقے انہی ان بزرگوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں، وہ ان میں خود مختار ہیں، جو چاہیں کریں اور جس کو چاہیں دے دیں۔

لیکن یہ غلطی بھی پہلی غلطی سے بدتر ہے، اس لئے کہ دنیا کے بادشاہ یا سربراہِ مملکت جو اختیارات اپنے ماتحت وزیروں یا افسروں کے حوالے کر دیتے ہیں اس کی وجہ ان کا عجز و قصور ہے کہ وہ اپنی قلمرو کے ہر چھوٹے بڑے کام کو خود کرنے سے قاصر اور دوسروں کے محتاج ہیں، وہ اپنے وزیروں اور افسروں کی مدد کے بغیر نظامِ مملکت نہیں چلا سکتے۔ اس کے برعکس حق تعالیٰ شانہٗ کی شان یہ ہے کہ اسے کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم بھی ہے اور اس پر قدرت بھی، کائنات کی کوئی چھوٹی بڑی چیز نہ اس کے علم سے باہر ہے، نہ اس کے حکمِ قضا و قدر سے آزاد ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا علم، اس کا ارادہ، اس کی مشیت، اس کی قدرت اور اس کی تکوین زمین و آسمان کی ایک ایک چیز پر حاوی اور کائنات کے ایک ایک ذرے کو محیط ہے، درخت کا ایک پتہ بھی اس کے علم و ارادہ اور حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا، اس لئے وہ کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی وزیر، مشیر کا نہ کسی معاون کا محتاج نہیں، نہ اس کے انتظام میں اس کا کوئی شریک ہے، نہ ہو سکتا ہے، نہ اس نے کائنات میں تصرف کے اختیارات کسی کو سونپے ہیں، نہ خدائی اختیارات کسی کو عطا کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مسئلہ:… اگر کسے گوید کہ خدا و رسول برین عمل گواہ اند کافر شود، اولیاء قادر نیستند بر ایجاد معدوم یا اعدام موجود، پس نسبت کردن ایجاد و اعدام و اعطائے رزق یا اولاد و دفع بلا و مرض وغیرہ آں بسوئے ایشاں کفر است۔ قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ، یعنی بگو اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مالک نیستم برائے خویشتن نفع را و نہ ضرر را مگر آنچہ خدا خواہد۔" (ارشاد الطالبین ص ۱۸)

ترجمہ:… "مسئلہ:… اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اس بات پر

besturdubooks.wordpress.com

خدا اور رسول کو اولیاء اللہ کا ہمسر بنا دیا ہے) تو کافر ہو جائے گا (کیونکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب سمجھا) اولیاء اللہ کی غیر موجودگی میں وجود عطا کرنے، اور کسی موجود کو معدوم کر دینے پر قدرت نہیں، یعنی وجود دینے نہ دینے، رزق یا اولاد دینے اور مصیبت اور بیماری ہٹانے وغیرہ کی نسبت ان کی طرف کرنا کفر ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے (بھی) نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا، مگر جو کچھ خدا چاہے۔"

اس لئے یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ مخلوق اپنے خالق کے سامنے عرضیاں پیش کرنے کے بجائے اس کے کسی نائب کے سامنے پیش کرے۔

الغرض وسیلہ پکڑنے کے یہ معنی کہ ہم بزرگوں کی خدمت میں عرضیاں پیش کیا کریں، اور ان سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگا کریں، بالکل غلط اور قطعاً ناروا ہے۔ قرآن کریم نے مخلوق کو پکارنے اور اس سے دعائیں مانگنے کو سب سے بدترین گمراہی قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

"وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ."

(الاحقاف: ۵)

ترجمہ:... "اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے، اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو۔" (ترجمہ حضرت تھانوی)

بزرگوں سے مرادیں مانگنا اور ان سے اپنی حاجات کے لئے دعائیں کرنا اس لئے بھی غلط ہے کہ دعا اعلیٰ ترین عبادت ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" (ترمذی، مشکوٰۃ ص:۱۹۴) (دعا عبادت کا مغز ہے)۔

ایک اور حدیث میں ہے:

عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ، یا خواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً للہ، جو
نہایت شرک و کفر است، مگر یا الٰہی بحرمت خواجہ شمس الدین پانی پتی
حاجت من روا کن گوید مضائقہ ندارد، حق تعالیٰ نے فرمایا ہے "والذین
تدعون من دون اللہ عباد امثالکم" یعنی آنانکہ می خوانید ایشاں را
سوائے خدا آنہا بندگانند مانند شما، آنہا را چہ قدرت است کہ حاجت
کسے برآرند" (ارشاد الطالبین فارسی ص ۱۸، مجتبائی دہلی ۱۹۰۵ء)

ترجمہ: "مسئلہ: فوت شدہ بزرگوں سے اور
انبیائے کرام علیہم السلام سے دعا نہیں مانگنا چاہئے، رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "دعا ہی اصل عبادت ہے" پھر آپ صلی
اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ
مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری
عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ جہنم میں ذلیل و خوار ہو کر داخل ہوں
گے" اور یہ جو جاہل لوگ کہتے ہیں: "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ"
"یا خواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً للہ" جائز نہیں، بلکہ شرک و کفر ہے،
اور اگر یوں کہے کہ: "یا الٰہی! بطفیل خواجہ شمس الدین پانی پتی میرا یہ
کام کردے" تو کوئی مضائقہ نہیں، اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "خدا
کے سوا تم جن لوگوں کو پکارتے ہو، وہ بھی تمہاری طرح بندے ہیں،
ان کو کیا قدرت ہے کہ کسی کی حاجت روا اور پوری کرسکیں۔"

وسیلے کی تیسری صورت:

وسیلہ پکڑنے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ براہِ راست بزرگوں سے تو اپنی
حاجت نہ مانگی جائے، مگر ان کی خدمت میں یہ درخواست کی جائے کہ وہ حق تعالیٰ کے دربار
میں ہماری حاجت براری کے لئے دعا فرمائیں، یہ صورت پہلی اور دوسری صورت کے
درمیان درمیان ہے، کیونکہ پہلی صورت میں تو مانگنا براہِ راست خدا تعالیٰ سے

"یا اخی لا تنسانا من دعائک"

(مسند احمد ج:۱ ص:۲۹، ج:۲ ص:۵۹)

ترجمہ: "میرے بھائی! ہمیں اپنی دعا میں نہ بھولنا۔"

مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کسی نبی و صدیق کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی فرمائش کی ہو۔ اسی طرح صحابہؓ و تابعینؒ بھی ایک دوسرے سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے، مگر کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے کسی شخص کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کی ہو۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہے:

"استمداد از اموات خواہ نزدیک قبور باشد یا غائبانہ بے شبہ بدعت است، در زمانہ صحابہؓ و تابعینؒ نبود لیکن اختلاف است در آں کہ ایں بدعت سیئہ است یا حسنہ، و نیز حکم مختلف می شود باختلاف طریق استمداد۔" (فتاویٰ عزیزی ج:۱ ص:۸۹)

ترجمہ: "مردوں سے مدد طلب کرنا خواہ ان کی قبروں پر جا کر کی جائے یا غائبانہ، بلاشبہ بدعت ہے، صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں یہ معمول نہیں تھا لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ بدعت سیئہ ہے یا حسنہ؟ نیز استمداد کے مختلف طریقوں کی بنا پر حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے۔"

سوم: ... یہ کہ جب اس کے جواز و عدم جواز میں بھی کلام ہے، اور سلف صالحین کا معمول بھی یہ نہیں تھا تو کیا اس کو مستحسن سمجھ کر اس کی اجازت دے دی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی چیز "بدعت" کہلاتی ہے، اسی بنا پر حضرت شاہ صاحب نے اس کو "بلاشبہ بدعت است" فرمایا ہے۔ اور میں "سنت و بدعت" کے بارے میں تو شاید آگے چل کر کچھ عرض کر سکوں، مگر مختصراً اتنا یہاں بھی عرض کر دیتا ہوں کہ جن چیزوں کو سلف صالحین نے مستحسن نہیں سمجھا اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ ایسے امور کے بارے میں امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ:

"ایں فقیر در ہیچ بدعت از ایں بدعتہا حسن و نورانیت

besturdubooks.wordpress.com

مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اجازت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عورتوں کی ممانعت اس بنا پر کی گئی ہے کہ یہ کم صبری اور کم علمی کی بنا پر وہاں جاکر جزع فزع، بدعات اور غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں رہ سکتیں، چونکہ ان کے جانے میں فتنے کا احتمال غالب تھا، اس لئے ان کو خصوصیت سے منع کر دیا گیا۔ تاہم اگر کوئی عورت وہاں جاکر کسی بدعت اور کسی غیر شرعی حرکت کی مرتکب نہ ہو تو اس کو اجازت ہے، مگر بوڑھی عورتیں جاسکتی ہیں، جوان عورتوں کو نہیں جانا چاہئے۔ (فتاویٰ شامی ج:۲ ص:۲۴۲ طبع جدید مصر)

دوم یہ کہ صرف اپنے شہر کے قبرستان کی زیارت کے لئے جانا ہی صحیح ہے یا دوسرے شہروں میں اولیاء اللہ اور صالحین کی قبروں کی زیارت کے لئے جانے کی بھی اجازت ہے؟ بعض اکابر کا ارشاد ہے کہ آدمی دوسرے شہر میں گیا ہوا ہو تو وہاں کی قبور کی زیارت بھی کرسکتا ہے، مگر صرف زیارت قبور کے ارادے سے جانا صحیح نہیں، لیکن امام غزالی رحمہ اللہ اور دوسرے بہت سے اکابر فرماتے ہیں کہ اس کی بھی اجازت ہے، اور یہی صحیح ہے، بشرطیکہ شرط یہ ہے کہ وہاں جاکر کوئی خلافِ شرع کام نہ کرے۔ (حوالہ بالا)

۳:… آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارتِ قبور کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ جب آدمی قبرستان جائے تو اہلِ قبور کو ان الفاظ میں سلام کہے:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ، اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَّنَحْنُ لَکُمْ تَبَعٌ، وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ، نَسْأَلُ اللہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَةَ۔" (مشکوٰۃ شریف ص:۱۵۴)

اس کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرے اور کچھ پڑھ کر ان کو ایصالِ ثواب کرے، احادیث شریفہ میں بعض خاص خاص سورتوں کے خاص فضائل بھی آئے ہیں، اسی طرح درود شریف کے فضائل بھی آئے ہیں، بہرحال درود شریف، سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی، سورۂ اخلاص اور دیگر جتنی سورتیں چاہے پڑھ کر ان کا ثواب بخشے۔ قبر پر دعا بغیر ہاتھ اٹھائے کرنی چاہئے، یا قبر کی طرف پشت اور قبلے کی طرف منہ کرکے دعا کی جائے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج:۵ ص:۳۵۰ کتاب الکراہیۃ)

صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس مہم پر روانہ فرمایا تھا کہ جس تصویر یا مورتی کو دیکھوں اسے مٹا دوں، اور جس قبر کو اونچا دیکھوں اسے برابر کر دوں۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۸)

ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پختہ قبریں بنانا، ان پر قبے تعمیر کرنا جائز نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں رفقاء (حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی قبور شریفہ بھی پختہ نہیں بنائی گئیں۔(۱) (مشکوٰۃ شریف ص ۱۵۴)

۵:... اب ان اعمال کا جائزہ لیجئے جو ہمارے ناواقف عوام اولیاء اللہ کی قبروں پر بجا لاتے ہیں، مثلاً: قبروں پر غلاف ڈالنا، ان پر چراغ جلانا، ان کو سجدہ کرنا، ان کا طواف کرنا، ان کو چومنا، ان پر پیشانی اور ناک گھسنا، ان کے سامنے دست بستہ اس طرح کھڑے ہونا جس طرح نمازی خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے، ان کے سامنے رکوع کی طرح جھکنا، ان پر منتیں ماننا اور چڑھاوے چڑھانا وغیرہ وغیرہ۔ اگر آپ کو بھی بزرگوں کے مزارات پر جانے کا اتفاق ہوا ہوگا تو آپ نے یہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے، حالانکہ ہمارے اہل سنت اور ائمہ احناف کی کتابوں میں ان تمام امور کو ناجائز لکھا ہے۔

پختہ مزارات اور ان کے قبے:

قبروں کو پختہ کرنے کی ممانعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اوپر نقل کر چکا ہوں، ہمارے ائمہ اہل سنت نے انہی ارشادات کی روشنی میں اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ (جو ہمارے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد اور ان کے مذہب کے مدون ہیں) فرماتے ہیں:

"ولا نرى أن يُزاد على ما خرج منه ونكره أن يُجصّص أو يُطيّن ... أن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم نهى عن تربيع القبور وتجصيصها، قال محمد: وبه نأخذ وهو قول أبي حنيفة." (کتاب الآثار ص ۹۶)

ترجمہ:... اور ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلے

---

(۱) اور قبر مبارک پر قبہ ساتویں صدی کے بعد تعمیر ہوا ہے۔ جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

besturdubooks.wordpress.com

اس سے زیادہ دو والی جو سنن داری ہم قبروں پر چھت بنانے اور ان کی لپائی کو
مکروہ سمجھتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر عمارت بنانے
اور انہیں پختہ کرنے سے منع فرمایا ہے، ہمارا یہی مذہب ہے اور یہی
حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے۔"

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اونچی قبروں کو منہدم کرنے اور برابر کرنے کا حکم دیا تھا، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق میں نے مکہ مکرمہ میں اُمراء کو قبروں پر بنائی گئی عمارتوں کے منہدم کرنے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا۔ (شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۳۱۲)

اس سے معلوم ہوگا کہ حضرات اولیاء اللہ کے مزارات پر جو گنبد اور قبے بنے ہوئے ہیں، وہ اکابر اس سے بالکل بری ہیں، انہوں نے نہ اس فعل کا حکم فرمایا، نہ اس کی اجازت دی ہے اور نہ اس کی وصیت فرمائی ہے، اس کی ذمہ داری ان دنیادار امراء و سلاطین پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مقدسہ کی مخالفت کرکے یہ فعل شنیع کروایا تھا، اور اب تو لوگوں نے قبر کے پختہ ہونے اور اس پر شاندار روضہ تعمیر ہونے کو ولایت کا معیار سمجھ لیا ہے، ایسے بہت سے واقعات آپ کے علم میں ہوں گے کہ کسی مجذوب نے خواب یا الہام کا حوالہ دے کر کسی جگہ جعلی قبر بنا ڈالی اور لوگوں نے اس کی پرستش شروع کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! بہرحال حنفی مذہب کی قریباً تمام معتبر کتابوں مثلاً عالمگیری، قاضی خان، ہدایہ، درمختار، بحر الرائق وغیرہ میں اس فعل کو ناجائز لکھا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اما البناء فلم ار من اختار جوازه"

(فتاوی شامی ج ۱ ص [illegible] طبع مصر)

ترجمہ... "میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے اس کے جواز کو
اختیار کیا ہو۔"

اور حضرت قاضی ثناء اللہ حقی پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وآنچہ بر قبور اولیاء عمارتہائے رفیع بنا کنند و چراغان روشن کنند و ازیں قبیل ہر چہ می کنند حرام است۔"

(مالا بد منہ ص ۸۳ مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۱ھ)

ترجمہ:... "اور یہ جو اولیاء اللہ کی قبروں پر اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں، اور اسی قسم کے اور کام جو کرتے ہیں، یہ سب حرام ہیں۔"

قبروں پر غلاف چڑھانا:

قبروں پر غلاف چڑھانا بھی جائز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ کے مبارک زمانے میں کسی کی قبر پر چادر نہیں چڑھائی گئی۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فی الأحکام عن الحجۃ تکرہ الستور علی القبور۔"

(رد المحتار ج ۲ ص: ۲۳۸)

ترجمہ:... "الاحکام میں "الحجۃ" سے نقل کیا ہے کہ قبروں پر چادر ڈالنا مکروہ ہے۔"

قبروں پر چراغ جلانا:

قبر پر چراغ اور قندیل روشن کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ممانعت فرمائی ہے، بلکہ ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسرج۔"

(مشکوٰۃ شریف ص ۷۱)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ان عورتوں پر جو قبروں پر جاتی ہیں، اور ان لوگوں پر جو قبروں کو

besturdubooks.wordpress.com

سجدہ گاہ بناتے ہیں اور اس پر چراغ جلاتے ہیں۔"

علامہ علی القاری حنفی رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

"والنهي عن اتخاذ السرج لما فيه من تضييع المال، لأنه لا نفع لأحد من السراج، ولأنها من آثار جهنم، وإما للاحتراز عن تعظيم القبور كالنهي عن اتخاذ القبور مساجد" (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۷۱)

ترجمہ: "قبر پر چراغ جلانے کی ممانعت یا تو اس لئے ہے کہ اس میں مال کو بے فائدہ ضائع کرنا ہے، کیونکہ اس کا کسی کو نفع نہیں، اور اس لئے کہ آگ تو جہنم کے آثار میں سے ہے (اس کو قبروں سے دور رکھنا چاہئے) اور یا یہ ممانعت قبروں کی تعظیم سے بچانے کے لئے ہے، جیسا کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت بھی اسی بنا پر ہے۔"

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قبور اولیاء بلند کردن، و گنبد برآں ساختن، و عرس و امثال آں، و چراغاں کردن ہمہ بدعت است، بعضے ازاں حرام است، و بعضے مکروہ، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر شمع افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگان را لعنت گفتہ، و فرمودہ کہ قبر مرا عید و مسجد نکنید۔ و در مسجد سجدہ میکنند، و روز عید ساختہ مجمع میشوند، ہر سال مقرر کردہ شدہ، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) علی رضی اللہ عنہ را فرستاد کہ قبور مشرفہ را برابر کند، و ہر جا کہ تصویرے بیند آں را محو کند۔" (ارشاد الطالبین ص ۲۰)

ترجمہ: "اولیاء اللہ کی قبروں کو اونچا کرنا، ان پر گنبد بنانا، ان کا عرس وغیرہ کرنا، چراغ روشن کرنا، یہ ساری چیزیں بدعت ہیں، ان میں بعض حرام ہیں، اور بعض مکروہ۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر شمع جلانے والوں اور سجدہ کرنے والوں پر لعنت

besturdubooks.wordpress.com

فرمائی ہے، اور فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید اور مسجد نہ بنالینا۔ مسجد میں سجدہ کیا کرتے ہیں اور عید کا دن مجمع کے لئے سال میں ایک دن مقرر کیا گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مقصد کے لئے بھیجا تھا کہ اونچی قبروں کو برابر کردیں، اور جہاں تصویر دیکھیں اسے مٹاڈالیں۔"

قبروں پر طواف اور سجدہ وغیرہ:

ناواقف لوگ قبروں کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کا طواف کرتے ہیں، ان کے آستانے کو چومتے ہیں، یہ تمام افعال شرعاً ناجائز ہیں۔ اور ہمارے ائمہ اہلِ سنت نے ان کے حرام و ناجائز ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس لئے کہ طواف، سجدہ، رکوع، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا یہ سب عبادت کی شکلیں ہیں، اور ہماری شریعت نے قبروں کی ایسی تعظیم کی اجازت نہیں دی ہے کہ پوجا کی حد تک پہنچ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ پچھلی امتیں اسی غلو سے گمراہ ہوئی ہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان افعال سے بچنے کی تاکید اور وصیت فرمائی ہے۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری ایام میں فرماتے تھے:

"لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی! اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ مَسَاجِدَ۔" (مشکوٰۃ شریف ص:۶۹)

ترجمہ:... "اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر! کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔"

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ: "سنو! تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں، ولیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا کرتے تھے، خبردار! تم قبروں کو سجدے کی جگہ نہ بنانا، میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔" (حوالہ بالا)

ایک اور حدیث میں ہے:

"اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ، اِشْتَدَّ غَضَبُ

besturdubooks.wordpress.com

اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔"
(مشکوٰۃ شریف ص:۷۲)

ترجمہ:... "اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا، جس کو پوجا جائے، اللہ کا غضب سخت بھڑکتا ہے اس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنائے۔"

قیس بن سعد صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں حیرہ گیا، وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے جی میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اپنا یہ خیال ظاہر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِيْ اَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ؟ فَقُلْتُ: لَا! فَقَالَ: لَا تَفْعَلُوْا، لَوْ كُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَاءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ لِمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ۔" (مشکوٰۃ شریف ص:۲۸۲)

ترجمہ:... "دیکھو! اگر تم میری قبر کے پاس سے گزرتے تو کیا اس کو سجدہ کرتے؟ میں نے عرض کیا: ہرگز نہیں! فرمایا: پھر (زندگی میں بھی) نہ کرو، اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی مخلوق کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، بوجہ اس حق کے جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کا ان پر رکھا۔"

ان احادیثِ طیبہ پر غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے بارے میں قبرپرستی کا خطرہ کتنی شدت سے محسوس فرماتے ہیں، اور پھر کیسی سختی کے ساتھ اس سے ممانعت فرماتے ہیں، جس قبر کو سجدہ کیا جائے اسے بت قرار دے کر سجدہ کرنے والوں پر لعنت فرماتے ہیں اور اسے غضبِ خداوندی کے بھڑکنے کا سبب ٹھہراتے ہیں۔

ان احادیث کی بنا پر علمائے اہلِ سنت نے قبر پر سجدہ کرنے کو شرکِ جلی فرمایا ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ حدیث "لعن اللہ الیہود والنصاریٰ" کی شرح میں فرماتے ہیں:

besturdubooks.wordpress.com

"یہود و نصاریٰ کے ملعون ہونے کا سبب یا تو یہ تھا کہ وہ انبیاء کی تعظیم کی خاطر ان کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے، اور یہ شرکِ جلی ہے، یا اس لئے کہ وہ انبیاء کے مدفن میں اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھتے تھے۔ اور نماز کی حالت میں قبروں کی طرف منہ کرتے، نیز اس پر سجدہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بیک وقت دو نیک کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی اور انبیائے کرام کی تعظیم میں مبالغہ بھی، اور یہ شرکِ خفی تھا۔ کیونکہ یہ فعل مخلوق کی ایسی تعظیم کو متضمن تھا جس کی اجازت نہیں دی گئی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس سے منع فرمایا، یا تو اس لئے کہ یہ فعل یہودیوں کی سنت کے مشابہ ہے، یا اس لئے کہ اس میں شرکِ خفی پایا جاتا ہے۔" (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۶۹)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ "الفوز الکبیر" میں فرماتے ہیں:

"اگر تم مشرکین کے عقائد و اعمال کی پوری تصویر دیکھنا چاہو تو اس زمانے کے عوام اور جہلا کو دیکھو کہ وہ مزارات و آثار پر جا کر طرح طرح سے شرک کا ارتکاب کس طرح کرتے ہیں۔ اس زمانے کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جس میں اس زمانے میں کوئی نہ کوئی قوم مبتلا نہیں، ان سے مثل اعتقاد نہیں رکھتی، خدا تعالیٰ ہمیں ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔"

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سجدہ کردن بسوئے قبور انبیاء و اولیاء و طواف گرد قبور کردن و دعا از آنہا خواستن و نذر برائے آنہا قبول کردن حرام است، بلکہ چیزہا ازاں بکفر میرساند، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بر آنہا لعنت گفتہ، وازاں منع فرمودہ، وگفتہ کہ قبر مرا بت نہ کنند۔" (مالابدمنہ ص ۸۸)

ترجمہ: "اولیاء کی قبروں کو سجدہ کرنا، قبروں کے گرد

پھیرنے اور اس کو بوسہ دینے سے، کیونکہ یہ عیسائیوں کی عادت ہے۔"

اس فتویٰ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی قبر پر ہاتھ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اسے سنت یا اچھی بات نہ سمجھا جائے، لیکن اس پر ہاتھ پھیرنے کو باعثِ برکت سمجھنا، اس کو چومنا اور بوسہ دینا "بدعت" ہے، یہ سلفِ صالحین کا طریقہ نہیں تھا، بلکہ نصاریٰ کا معمول ہے۔

قبروں پر منتیں اور چڑھاوے:

بہت سے لوگ تصرفِ اولیاء کے معتقد ہیں، وہ ان سے مرادیں مانگتے ہیں، بلکہ ان کی منتیں بھی مانتے ہیں کہ اگر ان کا فلاں کام ہوجائے تو ان کی قبر پر غلاف یا شیرینی چڑھائیں گے، یا اتنی رقم ان کی نذر کریں گے، اس سلسلے میں چند مسائل معلوم کرلینا ضروری ہے۔

۱:... منت ماننا اور نذر دینا بھی عبادت ہے، اور غیراللہ کی عبادت جائز نہیں،

ہمارے حنفی مذہب کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

"واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یؤخذ من الدراہم والشمع والزیت ونحوہا الی ضرائح الاولیاء الکرام تقربا الیہم فہو بالاجماع باطل وحرام، ما لم یقصدوا صرفہا لفقراء الانام، وقد ابتلی الناس بذلک، لا سیما فی ہذہ الاعصار، وقد بسطہ العلامۃ قاسم فی شرح درر البحار۔"

(درمختار قبیل باب الاعتکاف)

ترجمہ:... "جاننا چاہئے کہ اکثر عوام کی طرف سے مردوں کے نام کی جو نذر دی جاتی ہے، اور بزرگوں کی قبروں پر روپے پیسے، شمع، تیل وغیرہ، ان کے تقرب کی خاطر چڑھائے جاتے ہیں، وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے، اور لوگ اس میں بکثرت مبتلا ہیں، خصوصاً اس زمانے میں، اور اس مسئلے کو علامہ قاسم نے "درر البحار" کی شرح میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔"

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "ایسی نذر کے باطل اور حرام ہونے کی کئی وجوہ ہیں، ایک یہ کہ یہ نذر مخلوق کے لئے ہے، اور مخلوق کے نام کی منت ماننا جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے، اور عبادت مخلوق کی نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ جس کے نام کی منت مانی گئی ہے وہ میت ہے، اور مردہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ سوم یہ کہ اگر نذر ماننے والے کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مرا ہوا شخص بھی تکوینی امور میں تصرف رکھتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ کفر ہے۔" (رد المحتار ج:۲ ص:۱۳۹)

اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عبادت مر غیر خدا را جائز نیست، و نہ مدد خواستن از غیر خدا..... پس نذر کردن برائے اولیاء جائز نیست کہ نذر عبادت است۔" (ارشاد الطالبین ص:۱۸)

ترجمہ:... "عبادت غیرِ خدا کی جائز نہیں، اور نہ غیرِ خدا سے مدد مانگنی جائز ہے..... پس اولیاء اللہ کے نام کی نذر ماننا جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے۔"

الغرض یہ مسئلہ حنفی مذہب کی بڑی بڑی سب کتابوں میں لکھا ہے کہ نذر عبادت ہے اور عبادت غیر اللہ کی جائز نہیں، اس لئے اولیاء اللہ کے مزارات پر منتیں ماننا اور چڑھاوے چڑھانا بالاجماع حرام اور باطل ہے۔

۲:... اگر کسی شخص نے ایسی نذر مان لی ہو تو اس کا پورا کرنا جائز نہیں، اگر پورا کرے گا تو گناہگار ہوگا۔ فتاویٰ عالمگیری، بحر الرائق اور دیگر فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ اگر کسی معصیت کی نذر مانی ہو تو وہ صحیح نہیں، اور نہ اس کا پورا کرنا صحیح ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج:۱ ص:۲۰۸) بلکہ اس سے توبہ کرنا لازم ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"و اگر کسے نذر کرد وفائے نذر نکند کہ احتراز از معصیت بقدر امکان واجب است۔" (ارشاد الطالبین ص:۱۸)

ترجمہ:... "اور اگر کسی نے ایسی نذر مان لی ہو تو اسے پورا

نذر سے، کیونکہ جہاں تک ہو سکے گناہ سے پرہیز کرنا واجب ہے۔"
مطلب یہ کہ ایسی نذر ماننا بھی گناہ تھا، اب اس کو پورا کرنا ایک مستقل گناہ ہوگا، اس لئے پہلے گناہ سے توبہ کرے اور دوسرے گناہ کی حماقت نہ کرے۔

۳:... اگر کسی شخص نے ایسی نذر مانی اور اسے پورا بھی کردیا تو وہ چیز غیر اللہ کے لئے نامزد ہونے کی وجہ سے حرام ہوگئی، اور اس کا استعمال کسی شخص کے لئے بھی جائز نہیں ہوگا۔ البتہ جس شخص نے یہ چڑھاوا چڑھایا ہے جب تک وہ چیز اپنی اصل حالت میں موجود ہو وہ اپنی منت سے توبہ کرکے اسے واپس لے سکتا ہے۔ یہی حکم اس جانور کا ہے جو غیر اللہ کے لئے چڑھاوے کے طور پر نامزد کیا گیا ہو، کہ جب تک وہ جانور زندہ ہے منت ماننے والا اپنی منت سے توبہ کرکے اس کو واپس لے سکتا ہے، لیکن اگر وہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کردیا گیا، خواہ بوقتِ ذبح اس پر بسم اللہ پڑھی گئی ہو، اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ مکتوبات شریف دفتر سوم مکتوب ۴۱ میں تحریر فرماتے ہیں:

"حیوانات را از مشائخ می کشند و بر سر قبرہائے ایشاں رفتہ
آں حیوانات را ذبح می نمایند، در روایاتِ فقہیہ ایں امر را نیز داخل
شرک ساختہ اند، و دریں باب مبالغہ نمودہ اند، ایں ذبح را از جنس ذبائح جن انگاشتہ
اند کہ ممنوع شرعی است و داخل دائرۂ شرک است۔"

ترجمہ:... "جو جانور کہ بزرگوں کے نام پر دیتے ہیں اور ان کی قبروں پر جاکر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، فقہی روایات میں اس امر کو بھی شرک میں داخل کیا ہے اور اس سے بچنے کی بہت ہی تاکید کی ہے، اور اس ذبح کو ان ذبیحوں کی جنس میں شمار کیا ہے جو جنات کے نام پر ذبح کئے جاتے ہیں، اور جو شرعاً ممنوع اور شرک کے دائرے میں داخل ہیں۔"

۴:... اگر کسی شخص نے منت اللہ تعالیٰ کے لئے مانی ہو اور محض اس بزرگ کی روح کو ایصالِ ثواب مقصود ہو، یا وہاں کے فقراء کو نفع پہنچانا مقصود ہو تو یہ نذر حرام اور شرک

جائے، اور دیکھنے والے کو نظر آئے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ خیر سے ہر مجلس و محفل کو معمور و معطر کیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت اعمال و اخلاق اور طریقوں کا تذکرہ کیا جائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر نقشِ قدم پر مرمٹنے کی کوشش کی جائے۔ سلف صالحین صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ ان دونوں طریقوں پر عامل تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو اپنے عمل سے زندہ کرتے تھے اور ہر محفل و مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا تذکرہ کرتے تھے۔ آپ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ سنا ہوگا کہ ان کے آخری لمحاتِ حیات میں ایک نوجوان ان کی عیادت کے لئے آیا، واپس جانے لگا تو حضرتؓ نے فرمایا: ”برخوردار، تمہاری چادر ٹخنوں سے نیچی ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔“ ان کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اپنانے کا اس قدر شوق تھا کہ جب حج پر تشریف لے جاتے تو جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفرِ حج میں پڑاؤ کیا تھا وہاں اترتے، جس درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا، اس درخت کے نیچے آرام کرتے، اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طبعی ضرورت کے لئے اترے تھے خواہ تقاضا نہ ہوتا تب بھی وہاں اترتے، اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے اسی کی نقل اتارتے۔ رضی اللہ عنہ۔ یہی عاشقانِ رسول تھے جن کے دم قدم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ صرف اوراق و کتب کی زینت نہیں رہی، بلکہ جیتی جاگتی زندگی میں جلوہ گر ہوئی اور ان کی بدولت تیرہ بختیوں نے مشامِ عالم کو معطر کیا۔ صحابہ کرام اور تابعینؒ ہجرت کرکے ایسے ممالک میں پہنچے جن کی زبان نہیں جانتے تھے، نہ وہاں کی لغت سے آشنا تھے، مگر ان کی شکل و صورت، اخلاق و کردار اور اعمال و معاملات کو دیکھ کر علاقوں کے علاقے اسلام کے حلقہ بگوش اور جمالِ محمدی کے غلام بے دام بن گئے۔ یہ سیرتِ نبوی کی کشش تھی جس کا پیغام ہر مسلمان اپنے عمل سے دیتا تھا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

۴:... سلف صالحین نے کبھی سیرت النبی کے جلسے نہیں کئے اور نہ میلاد کی محفلیں

سے پہلے ۶۰۴ھ میں سلطان ابوسعید مظفر اور ابوالخطاب ابن دحیہ نے ایجاد کی، جس میں تین چیزیں بطور خاص ملحوظ تھیں:

۱:- بارہ ربیع الاوّل کی تاریخ کا تعین۔

۲:- علماء و صلحاء کا اجتماع۔

۳:- اور ختم محفل پر طعام کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پُرفتوح کو ایصالِ ثواب۔

ان دونوں صاحبوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کس قماش کے آدمی تھے؟ بعض مؤرخین نے ان کو فاسق و کذاب لکھا ہے، اور بعض نے عادل و ثقہ، واللہ اعلم!

جب یہ نئی رسم نکلی تو علمائے امت کے درمیان اس کے جواز و عدمِ جواز کی بحث چلی، علامہ فاکہانی رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء نے ان خود ساختہ قیود کی بنا پر اس میں شرکت سے عذر کیا اور اسے "بدعتِ سیئہ" قرار دیا، اور دیگر علماء نے سلطان کی ہم نوائی کی اور ان قیود کو مباح سمجھ کر اس کے جواز و استحسان کا فتویٰ دیا۔ پھر جب ایک بار یہ رسم چل نکلی تو یہ صرف "علماء و صلحاء کے اجتماع" تک محدود نہ رہی، بلکہ عوام کے دائرے میں آکر ان کی نئی نئی اختراعات کا تختۂ مشق بنتی چلی گئی، آج ہمارے سامنے عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو ترقی یافتہ شکل موجود ہے (اور ابھی خدا بہتر جانتا ہے کہ اس میں مزید کتنی ترقی مقدر ہے) اب ہمیں اس کا جائزہ لینا ہے۔

۱:... سب سے پہلے دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ جو فعل صحابہ و تابعینؒ کے زمانے میں کبھی نہیں ہوا بلکہ جس کے وجود سے اسلام کی چھ صدیاں خالی گئی ہیں، آج وہ "اسلام کا شعار" کہلاتا ہے، اس شعارِ اسلام کو زندہ کرنے والے "عاشقانِ رسول" کہلاتے ہیں، اور جو لوگ اس نوایجاد شعارِ اسلام سے نا آشنا ہوں ان کو "دشمنانِ رسول" تصور کیا جاتا ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

کاش! ان حضرات نے کبھی یہ سوچا ہوتا کہ چھ صدیوں کے جو مسلمان ان کے اس خود تراشیدہ شعارِ اسلام سے محروم رہے ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کیا وہ

besturdubooks.wordpress.com

سب ... نعوذ باللہ ... دشمنانِ رسول تھے؟ اور پھر انہوں نے اس بات پر بھی غور کیا ہوتا کہ اسلام کی تکمیل کا اعلان تو حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن ہو گیا تھا، اس کے بعد وہ کونسا پیغمبر آیا جس نے ایک ایسی چیز کو ان کے لئے شعارِ اسلام بنا دیا جس سے چھ صدیوں کے مسلمان نا آشنا تھے؟ کیا اسلام میرے یا کسی کے ابا کے گھر کی چیز ہے کہ جب چاہا اس کی کچھ چیزیں حذف کر دو اور جب چاہا اس میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ کر ڈالو...؟

ے:... دراصل اسلام سے پہلے قوموں میں اپنے بزرگوں اور بانیانِ مذہب کی برسی منانے کا معمول ہے، جیسا کہ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ ولادت پر "عید میلاد" منائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے برسی منانے کی رسم کو ختم کر دیا تھا، اور اس میں دو حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سالگرہ کے موقع پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ اسلام کی دعوت اور اس کی روح و مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، اسلام اس ظاہری ٹیپ ٹاپ، نمود و نمائش اور نعرہ بازی کا قائل نہیں، وہ اس شور و شغب اور ہاؤ ہو سے ہٹ کر اپنی دعوت کا آغاز دلوں کی تبدیلی سے کرتا ہے، اور عقائدِ حقہ، اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کی تربیت سے "انسان سازی" کا کام کرتا ہے، اس کی نظر میں یہ ظاہری مظاہرے ایک کوڑی کی قیمت بھی نہیں رکھتے جن کے بارے میں کہا گیا ہے:

"تکلف سے تصنع سے بری ہے شانِ محبوبی"

دوسری حکمت یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح کسی خاص موسم میں برگ و بار نہیں لاتا، بلکہ وہ تو ایسا سدا بہار شجرۂ طوبیٰ ہے جس کا پھل اور سایہ دائم و قائم ہے، گویا اس کے بارے میں قرآنی الفاظ میں "اُکُلُھَا دَائِمٌ وَّ ظِلُّھَا" کہا جا سکتا ہے، اس کی دعوت اور اس کا پیغام کسی خاص تاریخ کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ آفاق و ازمان کو محیط ہے۔

اور پھر دوسری قوموں کے پاس تو وہ چار ہستیاں ہوں گی جن کی سالگرہ منا کر وہ فارغ ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے دامن میں ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ایسی قدآور ہستیاں موجود ہیں جو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، اور جن کی عظمت کے سامنے آسمان کی بلندیاں ہیچ اور نورانی فرشتوں کا تقدس گرد راہ ہے۔ اسلام کے پاس کم و بیش سوا

ان کی تعداد تو ان انبیاء علیہم السلام کی ہے جو انسانیت کے ہیرو ہیں، اور جن میں سے ہر ایک کا وجود کائنات کی ساری چیزوں پر بھاری ہے۔ پھر انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قافلہ ہے، ان کی تعداد بھی سوا لاکھ سے کیا کم ہوگی؟ پھر ان کے بعد ہر صدی کے وہ لاکھوں اکابر اولیاء اللہ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں رشد و ہدایت کے مینارۂ نور تھے اور جن کے آگے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں، اب اگر اسلام شخصیتوں کی یادگار منانے کا دروازہ کھول دیتا تو غور کیجئے اس امت کو سال بھر میں سالگرہوں کے علاوہ کسی اور کام کے لئے ایک لمحہ کی بھی فرصت ہوتی...؟

چونکہ یہ چیز اسلام کی روح اور دین کے مزاج کے خلاف تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد چھ صدیوں تک امت کا مزاج اس کو قبول نہ کرسکا، اگر آپ نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی تاریخ میں چھٹی صدی وہ دور ہے جس میں فرزندانِ تثلیث نے صلیبی جنگیں لڑیں، اور مسیحیت کے ناپاک اور منحوس قدموں نے عالمِ اسلام کو روند ڈالا۔ ادھر مسلمانوں کا اسلامی مزاج داخلی و خارجی فتنوں کی مسلسل یلغار سے کمزور پڑ گیا تھا، ادھر مسیحیت کا عالمِ اسلام پر فاتحانہ حملہ ہوا، اور مسلمانوں میں مفتوح قوم کا سا احساسِ کمتری پیدا ہوا، اس لئے عیسائیوں کی تقلید میں یہ قوم بھی سال بسال اپنے مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "یوم ولادت" کا جشن منانے لگی، یہ قوم کے کمزور اعصاب کی تسکین کا ذریعہ تھا، مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، امت کے مجموعی مزاج نے اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ ساتویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک امت نے اسے "بدعت" قرار دیا اور اسے "ہر بدعت گمراہی ہے" کے زمرے میں شمار کیا۔

۸: اگرچہ "میلاد" کی رسم ساتویں صدی کے آغاز سے شروع ہوگئی تھی، اور لوگوں نے اس میں بہت سے امور کے اضافے بھی کئے، لیکن کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اسے "عید" کا نام دیتے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: "میری قبر کو "عید" نہ بنانا۔" اور میں اوپر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کے حوالے سے بتاچکا ہوں کہ "عید" بنانے کی ممانعت کیوں فرمائی گئی تھی؟ مگر اب چند سالوں سے اس سالگرہ کو

besturdubooks.wordpress.com

"عید میلاد النبی" کہلانے کا شرف بھی حاصل ہو گیا ہے۔

دنیا کا کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے "عید" کے دو دن مقرر کئے ہیں: عید الفطر اور عید الاضحی۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو بھی "عید" کہنا صحیح ہوتا، اور اسلام کے مزاج سے یہ چیز کوئی مناسبت رکھتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کو "عید" قرار دے سکتے تھے، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ پسندیدہ چیز ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ سہی، خلفائے راشدینؓ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو "عید" کہہ کر "جشن عید میلاد النبی" کی طرح ڈالتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس سے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں، یا یہ کہ ہم اس کو "عید" کہنے میں غلطی پر ہیں، یا یہ کہ نعوذ باللہ... ہمیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی خوشی ہے، مگر صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ کو کوئی خوشی نہیں تھی، انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا عشق بھی نہیں تھا، جتنا ہمیں ہے۔ ستم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں تو اختلاف ہے، بعض ۹ ربیع الاول بتاتے ہیں، بعض ۸ ربیع الاول، اور مشہور بارہ ربیع الاول ہے، لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ ۱۲ ربیع الاول ہی کو ہوئی۔ گویا ہم نے "جشن عید" کے لئے دن بھی تجویز کیا تو وہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے داغ مفارقت دے گئے۔ اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے کہ تم لوگ "جشن عید" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ پر مناتے ہو؟ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خوشی میں؟ نعوذ باللہ... تو شاید ہمیں اس کا جواب دینا بھی مشکل ہوگا۔

بہرحال! میں اس دن کو "عید" کہنا معمولی بات نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو صاف صاف تحریف فی الدین سمجھتا ہوں، اس لئے کہ "عید" اسلامی اصطلاح ہے، اور اسلامی اصطلاحات کو اپنی خود رائی سے غیر منقول جگہوں پر استعمال کرنا دین میں تحریف ہے۔

۹... اور پھر یہ "عید" جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مطابق منائی جاتی ہے، وہ بھی لائق شرم ہے، بے ریش لڑکے غلط سلط نعتیں پڑھتے ہیں، موضوع

اور من گھڑت قصے کہانیاں جن کا حدیث و سیرت کی کسی کتاب میں کوئی وجود نہیں، بیان کی جاتی ہیں، شور و شغب ہوتا ہے، نمازیں غارت ہوتی ہیں، اور نہ معلوم کیا کیا ہوتا ہے؟ کاش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جو "بدعت" ایجاد کی گئی تھی اس میں کم از کم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و تقدس ہی کا لحاظ رکھا جاتا۔

غضب یہ کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان خرافاتی مجلسوں میں بنفس نفیس تشریف بھی لاتے ہیں۔ یا غربۃ الاسلام! (ہائے اسلام کی بیچارگی!)۔

۱۰:... اب میں اس "عید میلاد النبی" کا آخری کارنامہ عرض کرتا ہوں۔ کچھ عرصے سے ہمارے کراچی میں "عید میلاد النبی" کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنائی جاتی ہے، اور جگہ جگہ بڑے بڑے چوکوں میں سانچے بنا کر رکھے جاتے ہیں، لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے ہیں اور "بیت اللہ" کی خودساختہ شبیہ کا طواف بھی کرتے ہیں، اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں اور علماء کی نگرانی میں کرایا جارہا ہے، فیا اسفاہ!

"جشن عید میلاد" کی باقی ساری چیزوں کو چھوڑ کر یہی ایک منظر کافی ہے، دیکھئے کہ اس میں کتنی قباحتوں کو سمیٹ کر جمع کردیا گیا ہے۔

اوّل:... اس پر جو ہزاروں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، یہ محض اسراف و تبذیر اور فضول خرچی ہے۔ آپ ملا علی قاری رحمہ اللہ کے حوالے سے سن چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر چراغ اور شمع جلانے والوں پر اس لئے لعنت فرمائی ہے کہ یہ فعل عبث ہے اور خدا کے دیئے ہوئے مال کو مفت ضائع کرنا ہے۔ ذرا سوچئے! جو مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر ایک چراغ جلانے کو فضول خرچی کی وجہ سے ممنوع اور ایسا کرنے والوں کو ملعون قرار دیتا ہے، اس کا ارشاد ان ہزاروں لاکھوں روپے کی فضول خرچی کرنے والوں کے بارے میں کیا ہوگا؟ اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ فضول خرچی وہ غربت زدہ قوم کر رہی ہے جو روٹی کپڑا اور مکان کے عوض دیمان تک کا سودا کرنے کو تیار ہے۔ اس فضول خرچی کے بجائے اگر یہی رقم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصالِ ثواب کے لئے غرباء و مساکین کو چپکے سے نقد دے دی جاتی تو کتنا ثواب

بلاشبہ نہ ہوتی مگر اس رقم سے سینکڑوں اجڑے گھر آباد ہو سکتے تھے، ان سینکڑوں بچیوں کے ہاتھ
پیلے کئے جا سکتے تھے جو اپنے والدین کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہیں، کیا یہ فضول خرچی اس
قوم کے شایانِ شان ہے جس کے بہت سے افراد خاندان نانِ شبینہ سے محروم اور جان و تن کا
رشتہ قائم رکھنے سے قاصر ہوں؟ اور پھر یہ سب کچھ کیا بھی جا رہا ہے کس ہستی کے نام پر؟ جو خود تو
پیٹ پر پتھر بھی باندھ لیتے تھے مگر جو خود دنوں تک جو کی روٹی کو ترس جاتے تھے، آج
کمیونزم اور لادینیت، سوشلزم اور اسلام کو دعوت دے رہا ہے، جب ہم دنیا کی مقدس ترین ہستی کے نام
پر یوں دولت کا کھیل کھیلیں گے تو لادینی جذبے، دین کے دشمن کیا تاثر لیں گے؟ فضول خرچی
کرنے والوں کو قرآن کریم نے "اخوان الشیاطین" فرمایا تھا، مگر ہماری قومی جہالت نے اس کو
اعلیٰ ترین نیکی اور اسلامی شعار بنا ڈالا ہے:

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

دوسرے:... اس عمل میں شیعوں اور رافضیوں کی تقلید ہے، آپ کو معلوم ہے کہ
رافضی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سالانہ برسی منایا کرتے ہیں اور اس موقع پر تعزیہ، علم،
ذوالجناح وغیرہ بنایا کرتے ہیں، انہوں نے جو کچھ حسین اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے
نام پر کیا وہی ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کرنا شروع کر دیا۔ انصاف
کیجئے! کیا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر اور بیت اللہ شریف کا سوانگ بنا کر
اسے بازاروں میں پھرانا اور اس کے ساتھ روضۂ اطہر اور بیت اللہ کا معاملہ کرنا صحیح ہے تو
روافض کا تعزیہ اور ذوالجناح کا سوانگ رچانا کیوں غلط ہے؟ افسوس ہے کہ جو مصنوعی بدعت
رافضیوں نے ایجاد کی تھی، ہم نے ان کی تقلید کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی کوشش کی۔

تیسرے:... اس بات پر بھی غور کیجئے کہ روضۂ اطہر اور بیت اللہ کی جو شبیہ بنائی
جاتی ہے، وہ شیعوں کے تعزیے کی طرح محض جعلی اور مصنوعی ہے، جسے آج بنایا جاتا ہے اور
کل توڑ دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس مصنوعی سوانگ میں اصل روضۂ اطہر اور بیت اللہ کی
کوئی خیر و برکت منتقل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اس چیز میں کسی
درجے میں تقدس پیدا ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اگر اس میں کوئی تقدس اور کوئی برکت نہیں تو اس

besturdubooks.wordpress.com

فعل کے لغو و عبث ہونے میں کیا شک ہے؟ اور اگر اس میں تقدس و برکت کا پہلو پایا جاتا ہے تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اور کسی معقول اور نقلی حجت میں روضہ مقدس اور بیت اللہ شریف سے تقدس و برکت کا اعتقاد رکھنا اسلام کی علامت ہے یا جاہلیت کی؟ اور پھر روضہ شریف اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنا کر اسے گلی کوچوں میں پھرانا کیا ان کی توہین نہیں...؟ آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ کی تصویر بادشاہ نہیں ہوتی، نہ کسی عاقل کے نزدیک اس میں بادشاہ کا کوئی کمال ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بادشاہ کی تصویر کی توہین قانون کی نظر میں لائق تعزیر جرم تصور کیا جاتا ہے اور اسے بادشاہ سے بغاوت پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن آج روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنا کر گلی کوچوں میں پھرانے والوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اسلامی شعائر کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

چوتھے:... جس طرح شیعہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تعزیے پر چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں، اب رفتہ رفتہ عوام کالانعام اس نو ایجاد "بدعت" کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے لگے ہیں۔ روضہ اطہر کی شبیہ پر نذر و صدقہ پیش کیا جاتا ہے اور بیت اللہ شریف کی شبیہ کا باقاعدہ طواف ہونے لگا ہے۔ گویا مسلمانوں کو حج و عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ جانے کی ضرورت نہیں، ہمارے ان دوستوں نے گھر گھر میں روضے اور بیت اللہ بنا دیئے ہیں، جہاں سلام بھی پڑھا جاتا ہے اور طواف بھی ہوتا ہے۔ میرے قلم میں طاقت نہیں کہ میں اس فعل کی قباحت و شناعت اور طوفان بدتمیزی کو بیان کر سکوں، شیعہ دوستوں سے پوچھئے کہ ائمہ اہل سنت کے نزدیک یہ فعل کس قدر قبیح ہے؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہے، وہ یہ کہ ایک زمانے میں ایک بدعت ایجاد ہوئی تھی کہ عرفہ کے دن جب حاجی حضرات عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں تو ان کی مشابہت کے لئے لوگ اپنے شہر کے کھلے میدان میں نکل کر جمع ہوتے اور حاجیوں کی طرح سارا دن ذکر و دعا و تضرع و گریہ و زاری اور توبہ استغفار میں گزارتے۔ اس رسم کا نام "تعریف" یعنی عرفہ منانا رکھا گیا تھا۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں تھی، بلکہ یہ ایک اچھی چیز تھی کہ اگر اس کا رواج عام ہو جاتا تو تمام مسلمان اللہ تعالیٰ

ان تصریحات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روضۂ اطہر اور کعبہ شریف کا ماڈل بنا کر ان کے ساتھ اصل کا سا جو معاملہ کیا جاتا ہے ہمارے اکابر اہلِ سنت کی نظر میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

خلاصہ یہ کہ "جشنِ عید میلاد" کے نام پر جو خرافات رائج کردی گئی ہیں، اور جن میں ہر آئے سال مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے، یہ اسلام کی دعوت، اس کی روح اور اس کے مزاج کے یکسر منافی ہیں۔ میں اس تصور سے پریشان ہو جاتا ہوں کہ ہماری ان خرافات کی رُوداد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں پیش ہوتی ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی؟ اور اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ان چیزوں کو دیکھ کر ان کا کیا حال ہوتا؟ بہرحال میں اس کو صرف "بدعت" بلکہ "تحریف فی الدین" تصور کرتا ہوں، اور اس بحث کو امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے ایک ارشاد پر ختم کرتا ہوں، جو انہوں نے اسی مسئلے میں اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ کے بارے میں فرمایا ہے:

> "بنظر انصاف بینند کہ اگر فرضاً حضرت ایشاں درین اوان در دنیا زندہ می بودند و این مجلس و اجتماع منعقد می شد، آیا بایں امر راضی می شدند و این اجتماع را می پسندیدند یا نہ؟ یقینِ فقیر آن است کہ ہرگز این معنی را تجویز نمی فرمودند، بلکہ انکار می نمودند۔ مقصودِ فقیر اعلام بود، قبول کنند یا نکنند ہیچ مضائقہ نیست و گنجائشِ مشاجرہ نہ۔"
>
> (دفتر اول مکتوب ۲۷۳)
>
> ترجمہ... "انصاف کی نظر سے دیکھئے کہ اگر بالفرض حضرت ایشاں اس وقت دنیا میں تشریف فرما ہوتے اور یہ مجلس اور یہ اجتماع منعقد ہوتا، آیا آپ اس پر راضی ہوتے، اور اس اجتماع کو پسند فرماتے یا نہیں؟ فقیر کا یقین یہ ہے کہ اس کو ہرگز جائز نہ رکھتے بلکہ اس پر نکیر فرماتے۔ فقیر کا مقصود صرف امرِ حق کا اظہار ہے، قبول کریں یا نہ کریں، کوئی پروا نہیں، اور نہ کسی جھگڑے کی گنجائش۔"

besturdubooks.wordpress.com

سنت اور اہلِ سنت:

"دیوبندی بریلوی اختلاف" کے اہم مسائل پر کتاب "سنت اور اہلِ سنت" کا خلاصہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ چونکہ گزشتہ سطور میں کئی جگہ "سنت" اور "بدعت" کا لفظ آیا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ میں سنت و بدعت کے بارے میں چند امور عرض کردوں تاکہ آپ کو یہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہ آئے کہ اہلِ سنت کون ہیں؟

۱... سنت و بدعت باہم متقابل ہیں، جب یہ کہا جائے کہ "فلاں چیز سنت ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ "بدعت" نہیں، اور جب کہا جائے کہ "یہ چیز بدعت ہے" تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ چیز خلافِ سنت ہے۔

۲... میرا، آپ کا اور تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ایک طرف گزشتہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی شریعتیں منسوخ ہوگئیں، تو دوسری طرف آئندہ قیامت تک کے لئے نبوت کا دروازہ بند کردیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے جس کے ذریعے حق تعالیٰ شانہ کی پسند و ناپسند معلوم ہوسکتی ہے، اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسند و ناپسند کا جو آئین دیا اسی کا نام دین و شریعت ہے، جس کی تکمیل کا اعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے تین مہینے پہلے میدانِ عرفات میں کردیا گیا۔ اب نہ اس دین میں کمی ہوسکتی ہے اور نہ کسی اضافے کی گنجائش ہے۔

۳... "سنت" طریقے کو کہتے ہیں، اور اسلامی اصطلاح میں سنت سے طریقۂ نبوی مراد ہوتا ہے، پس عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت اور معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ اپنایا وہ "سنت" ہے اور اس کے خلاف "بدعت" ہے۔ طریقۂ نبوی کا علم ہمیں قرآن کریم اور احادیثِ طیبہ سے ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے (یہ حدیث میں اس مضمون میں نقل کرچکا ہوں)، اس لئے خلفائے راشدین کی سنت بھی سنتِ نبوی کا حکم رکھتی ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے بہت سے فضائل بیان فرمائے

تین زمانوں کو بعد کے مقابلے میں بہتر اور افضل فرمایا ہے، ایک حدیث میں ارشاد ہے:

"اکرموا اصحابی فانہم خیارکم ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم، ثم یظہر الکذب۔ الحدیث۔"

(مشکوٰۃ ص ۵۵۴)

ترجمہ: "میرے صحابہ کی عزت کرو، کیونکہ وہ تم میں سب سے بہتر لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے، اس کے بعد جھوٹ کا ظہور ہوگا۔"

ایک حدیث میں ہے کہ: "میرا جو صحابی کسی زمین میں فوت ہوگا، وہ قیامت کے دن لوگوں کا قائد اور نور بن کر اٹھے گا۔" (حوالہ بالا)

یہ مضمون بہت سی احادیث میں ارشاد ہوا ہے، بلکہ قرآن کریم نے جماعت صحابہؓ کو "المؤمنین" اور "خیر امت" کا خطاب دے کر ان کے راستے پر چلنے کا حکم دیا ہے، اور جو شخص ان کے راستے سے ہٹ جائے اسے گمراہ قرار دے کر اس کو جہنم میں جھونکنے کی وعید سنائی ہے، اور بہت سی آیات کریمہ میں صحابہ کرام کو رحمت و رضوان کے مژدے سنائے گئے ہیں، اس لئے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی سنت بھی دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی تفسیر ہے۔ جو کام ان اکابر نے بالاتفاق کیا ہو، یا جس کام کو بالاتفاق ترک کر دیا ہو، وہ قطعی ہے، اور اس سے انحراف کسی کے لئے جائز نہیں، اور جو کام بعض صحابہؓ نے کیا، اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی، وہ بھی بلاشبہ حق و صواب ہے، اور اس میں کسی شک و ارتیاب کی گنجائش نہیں۔

الغرض کسی چیز پر صحابہ کرام کا تعامل اس کے سنت ہونے کی دلیل ہے، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین زمانے کے لوگوں کو خیر القرون کے لوگ فرمایا ہے، یعنی صحابہ کرامؓ، ان کے شاگرد، اور ان کے شاگردوں کے شاگرد (ان کو تابعین اور تبع تابعین کہا جاتا ہے) اس لئے ان تین زمانوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے کسی چیز پر مسلمانوں کا عمل رہا ہو، وہ سنت کے دائرے میں آتی ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com

۳:... "سنت" کی اس تشریح سے "بدعت" کی حقیقت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے، یعنی جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں معمول اور مروّج نہ رہی ہو، اس کو دین کی بات سمجھ کر کرنا "بدعت" کہلاتا ہے، مگر اس کی مزید تشریح کے لئے چند چیزوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اوّل:... یہ کہ جس مسئلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سے زیادہ صورتیں منقول ہوں، وہ سب "سنت" کہلائیں گی، ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرکے دوسری کو "بدعت" کہنا جائز نہیں۔ الا یہ کہ ان میں سے ایک منسوخ ہو، مثلاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آمین بالجہر بھی ثابت ہے اور آہستہ بھی، لہٰذا یہ دونوں سنت ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو "بدعت" کہہ کر اس کی مخالفت جائز نہیں۔

دوم:... ایک کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول تھا، مگر دوسرا کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک آدھ مرتبہ کیا، اس صورت میں اصل "سنت" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول ہوگا، مگر دوسرے کام کو بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیانِ جواز کے لئے کیا، "بدعت" کہنا صحیح نہیں ہوگا، اسے "جائز" کہیں گے، اگرچہ اصل سنت وہی ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عمل فرمایا۔

سوم:... ان تین زمانوں کے بعد جو چیزیں وجود میں آئی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کو خود مقصود سمجھا جاتا ہے، دوسری وہ جو خود مقصود بالذات نہیں، بلکہ کسی مامور شرعی کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر ان کو کیا جاتا ہے۔ مثلاً: قرآن کریم اور حدیث نبوی میں دین کا علم سیکھنے سکھانے اور پڑھنے پڑھانے کے بے شمار فضائل آئے ہیں اور اس کی نہایت تاکید فرمائی گئی ہے، اب حصولِ علم کے وہ ذرائع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے کے بعد ایجاد ہوئے، ان کو اختیار کرنا بدعت نہیں کہلائے گا (بشرطیکہ وہ بذاتِ خود جائز ہوں)، کیونکہ یہ ذرائع خود مقصود بالذات نہیں، بلکہ مامور شرعی کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً: قرآن کریم اور حدیث نبوی میں جہاد کے بہت سے فضائل آئے ہیں، جن جن ذرائع سے جہاد کیا جاتا ہے، اور جو ہتھیار جہاد میں استعمال کئے جاتے ہیں، ان کو

اعتقادی بدعت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ایسے عقائد و نظریات رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے خلاف ہوں۔ "ظلمات بعضها فوق بعض" کے مطابق آگے ان کی بہت سی قسمیں بن جاتی ہیں، بعض صریح کفر ہیں، جیسے قادیانیوں کا یہ عقیدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی... نعوذ باللہ... نبوت کا دروازہ کھلا ہے، یا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے ہیں، وغیرہ۔ اور بعض اعتقادی بدعتیں کفر تو نہیں مگر ان کو ضلالت و گمراہی کہا جائے گا۔

عملی بدعت یہ کہ کسی عقیدے میں تو تبدیلی نہ ہو، مگر عملی طور پر ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جو سلف صالحین سے منقول نہیں۔

۳... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "بدعت" کی جتنی مذمت فرمائی ہے، شاید کفر و شرک کے بعد کسی اور چیز کی اتنی مذمت نہیں بیان فرمائی۔ اس سلسلہ کی ایک دو حدیثیں مضمون کے شروع میں نقل کرچکا ہوں، اور اگر مزید نقل کروں گا تو یہ مضمون زیادہ طویل ہوجائے گا، ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ بدعت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردود و ملعون اور ضلالت و گمراہی فرمایا ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص بدعت ایجاد کرے یا اس میں مبتلا ہو، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں کس قدر لائق نفرین ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کا کوئی فرض و نفل، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی صاحبِ بدعت کی توقیر کی اس نے اسلام کو ڈھانے میں مدد کی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص "الجماعت" سے ایک بالشت بھی دور ہٹا اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ (مشکوٰۃ شریف ص:۳۱)

ان ارشادات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدعتیوں کی بدعت سے بھی کس قدر نفرت تھی...؟

رہا یہ کہ "بدعت" اس قدر مبغوض چیز کیوں ہے؟ اکابر امت نے اس پر بہت خوب کلام کیا ہے، میں نہایت اختصار کے ساتھ یہاں چند وجوہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اوّل:... یہ کہ دینِ اسلام کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوچکی اور

besturdubooks.wordpress.com

وہ تمام باتیں جن سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب و رضا حاصل ہو سکتی تھی، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا، اب جو شخص دین کے نام پر کوئی بدعت گھڑ کر لوگوں کو اس کی دعوت دیتا ہے وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین... نعوذ باللہ... ناقص ہے، اور قرب و رضائے خداوندی کا جو راستہ اس احمق کو معلوم ہوا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو... نعوذ باللہ... معلوم نہیں ہوا، یا وہ کہنا چاہتا ہے کہ شریعت کا جو علم، قرب و رضائے خداوندی کا جو ادراک اس مبتدع کو ہوا ہے وہ نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا اور نہ صحابہ و تابعین کو... نعوذ باللہ!!

الغرض جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین نے نہیں کیا، آج جو شخص اس کو عبادت اور دین بناتا ہے، وہ نہ صرف سلف صالحین پر بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر حملہ کرتا ہے، پس ایسے شخص کے مردود ہونے میں کیا شبہ ہے؟

دوم:... بدعت کے علاوہ آدمی جو گناہ بھی کرتا ہے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ایک غلط کام کر رہا ہوں، وہ اس گناہ پر پشیمان ہوتا ہے اور اس سے توبہ کر لیتا ہے، مگر "بدعت" ایسا منحوس گناہ ہے کہ کرنے والا اس کو غلطی سمجھتا نہیں، بلکہ نیک "اچھائی" سمجھ کر کرتا ہے، اور شیطان اس گناہ کو اس کی نظر میں ایسا خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے کہ اسے اپنی غلط روی کا کبھی احساس ہی نہیں ہو پاتا، اور وہ مرتے دم تک توبہ سے محروم رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے گناہ گاروں اور پاپیوں کو توبہ کی توفیق ہو جاتی ہے مگر بدعت کے مریض کو کبھی شفا نصیب نہیں ہوتی، الا یہ کہ خدا تعالیٰ کی خاص رحمت اس کی دستگیری کرے اور اس کی برائی اس کے سامنے کھل جائے۔

سوم:... آدمی کو بدعت کی نحوست اور تاریکی سنت کے نور سے محروم کر دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسك بسنة خير من احداث بدعة."

(رواہ احمد، مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:... "جب کوئی قوم کوئی سی بدعت ایجاد کرتی

besturdubooks.wordpress.com

ہے تو اس کی مثل سنت اس سے اٹھالی جاتی ہے، اس لئے چھوٹی سے چھوٹی سنت پر عمل کرنا بڑی سے اچھی بدعت ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے:

"ما ابتدع قوم بدعة في دينهم الا نزع الله من سنتهم مثلها ثم لا يعيدها اليهم الى يوم القيامة."

(رواہ الدارمی عن حسان، مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ..."جب کوئی قوم اپنے دین میں کوئی بدعت گھڑ لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسی کی بقدر سنت اس سے چھین لیتے ہیں، اور پھر قیامت تک اسے ان کی طرف واپس نہیں لوٹاتے۔"

اور سنت سے اس محرومی کا سبب یہ ہے کہ بدعت میں مبتلا ہونے کے بعد قلب کی نورانیت وصلاحیت زائل ہوجاتی ہے، آدمی حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے، اس کی مثال اس اناڑی کی سی ہوجاتی ہے جس کو کسی نوسرباز نے روپیہ بڑھانے کا جھانسہ دے کر اس سے اصلی نوٹ چھین لئے ہوں اور جعلی نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھمادی ہو، وہ احمق خوش ہے کہ ایک کے بدلے میں دو مل گئے مگر یہ خوشی اسی وقت تک ہے جب تک وہ انہیں لے کر بازار کا رخ نہیں کرتا، بازار جاتے ہی اس کو صراف کا نقد کہ ان بے قیمت پرزوں کی حقیقت معلوم ہوجائے گی، بلکہ جعلی کرنسی کے الزام میں اسے ہتھکڑی بھی لگادی جائے گی۔ خوب سمجھ لیجئے! کہ آخرت کے بازار میں صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا سکہ چلے گا، اور جن لوگوں نے بدعتوں کی جعلی کرنسیوں کے انبار لگا رکھے ہیں، وہاں ان کی قیمت ایک کوڑی بھی نہ ہوگی، بلکہ سنت محمدی کے مقابلے میں جعلی کرنسی بنانے اور رکھنے کے الزام میں پابند سلاسل کردیئے جائیں گے، حدیث نبوی میں ارشاد ہے کہ:

"میں حوض کوثر پر تم سے پہلے موجود ہوں گا، جو شخص میرے پاس آئے گا وہ اس کا پانی پیئے گا اور جو ایک بار پی لے گا پھر

سے کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔ کچھ لوگ میرے پاس وہاں آئیں گے، جن کو میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، مگر میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ پیدا کردی جائے گی، میں کہوں گا کہ یہ تو میرے آدمی ہیں، مجھے جواب ملے گا کہ: آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا۔ یہ جواب سن کر میں کہوں گا "سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ" (پھٹکار! پھٹکار! ان لوگوں کے لئے جنہوں نے میرے بعد میرا طریقہ بدل ڈالا)۔" (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۴۸۸)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ کر دین میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کرلی ہیں، وہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوضِ کوثر سے محروم رہیں گے، اس سے بڑی محرومی کیا ہوسکتی ہے...؟ یہی سبب ہے کہ اکابرِ امت کو "بدعت" سے سخت نفرت تھی۔ امام غزالی رحمہ اللہ امورِ عادیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباعِ سنت کی تاکید کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"جو کچھ ہم نے بیان کیا، وہ امورِ عادیہ میں اتباعِ سنت کی ترغیب کے لئے بیان کیا تھا، اور جن اعمال کو عبادت سے تعلق ہے اور ان کا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے، ان میں بلاعذر اتباعِ سنت چھوڑ دینے کی تو سوائے کفرِ خفی یا حماقتِ جلی کے، کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔" (تبلیغِ دین ترجمہ اربعین ص:۴۲)

اور امام ربانی مجدد الفِ ثانی قدس سرہ لکھتے ہیں:

"از حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ بتضرع و زاری و التجاء و افتقار و ذلّ و انکسار در سر و جہار مسألت می نماید کہ ہر چہ در دین محدث شدہ است و مبتدع گشتہ کہ در زمان خیر البشر و خلفائے راشدین او نبودہ ... علیہ وعلیہم الصلوات والتسلیمات ... اگرچہ آں چیز در روشنی مثل فلق صبح بود، ایں ضعیف را با جمعے کہ باو منسوب اند گرفتار عمل

besturdubooks.wordpress.com

آں بدعت گرفتار نہ فرماید و مفتون حسن آں مبتدع نکند، بحرمت سید المختار والہ الابرار علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔" (دفتر اول، مکتوب:۱۸۶)

ترجمہ:... "بندہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے تضرع اور زاری، التجاء و بے نوائی اور ذلت و انکسار کے ساتھ خفیہ اور علانیہ درخواست کرتا ہے کہ دین میں جو بات بھی نئی پیدا کی گئی ہے، اور جو بدعت بھی گھڑی گئی ہے، جو کہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں نہیں تھی، اگرچہ وہ چیز روشنی میں سپیدۂ صبح کی طرح ہو، اللہ تعالیٰ اس بندۂ ضعیف اور اس کے متعلقین کو اس نئے ایجاد شدہ کام میں گرفتار نہ فرمائے، اور اس کے حسن پر فریفتہ نہ کرے، بہ طفیل سید المختار اور آپ کی آل ابرار کے، علیہ الصلوٰۃ والسلام۔"

یہ ناکارہ حضرت مجدد رحمہ اللہ کی یہ دعا اپنے لئے، آپ کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے دہراتا ہے۔

چہارم:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا ارشاد گرامی "سحقاً سحقاً لمن غیر بعدی" (پھٹکار پھٹکار ان لوگوں پر جنھوں نے میرے بعد میرا طریقہ بدل دیا) سے "بدعت" کے مذموم ہونے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوئی، اور وہ یہ کہ "بدعت" سے دین میں تحریف وتغییر لازم آتی ہے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے یہ دین قیامت تک کے لئے نازل کیا ہے، اور قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کو اس کا مکلف کیا ہے، یہ تکلیف اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب یہ دین اپنی اصلی شکل میں محفوظ بھی ہو، ورنہ جس طرح پہلے دین لوگوں کی آراء وخواہشات کی نذر ہوکر مسخ ہوگئے اور ان کا حلیہ ہی بگڑ گیا، اس دین کو بھی یہ حادثہ پیش آتا۔

پس جو لوگ بدعات ایجاد کرتے ہیں، وہ درحقیقت دین اسلام کے چہرے کو مسخ کرتے ہیں اور اس میں تحریف اور تغییر وتبدیل کا راستہ کھولتے ہیں، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا خود وعدہ فرمایا ہے، اس لئے اس نے اپنی رحمت سے اس بات کا تکوینی

besturdubooks.wordpress.com

انتظام فرمادیا ہے کہ یہ دین ہر دور میں انسانی خواہشات کی آمیزش اور بدعات کی آلودگی سے پاک رہے، اور اہل بدعت جب بھی اس کے حسین چہرے پر بدعات کا گرد و غبار ڈالنے کی کوشش کریں، علمائے ربانیین کی ایک جماعت فوراً اسے جھاڑ پونچھ کر صاف کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین۔" (مشکوٰۃ ص:۳۶)

ترجمہ:... "ہر آئندہ نسل میں اس علم کے حامل ایسے عادل لوگ ہوتے رہیں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کے غلط دعووں اور جاہلوں کی تاویلوں کو صاف کرتے رہیں گے۔"

اس لئے الحمدللہ! اس کا تو اطمینان ہے کہ اہل باطل اس دین کے حسین چہرے کو مسخ کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے اس کا خود کار انتظام پیدا فرمادیا ہے، البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ نئی نئی گمراہیاں اور بدعتیں ایجاد کر کے نہ صرف اپنی شقاوت میں اضافہ کرتے ہیں، بلکہ بہت سے جاہلوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

۲:... شاید آپ دریافت کریں گے کہ یہ لوگ دین میں نئی نئی بدعتیں کیوں نکالتے ہیں؟ اور ان کو خدا کا خوف اس سے کیوں مانع نہیں ہوتا؟ اس کو سمجھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ایجادِ بدعت کے اسباب و محرکات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے۔

اوّل:... ایجادِ بدعت کا پہلا سبب جہل ہے، تشریح اس کی یہ ہے کہ بدعت میں ایک ظاہری اور نمائشی حسن ہوتا ہے، اور آدمی اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے، اور نفس یہ تاویل سمجھا دیتا ہے کہ یہ تو بڑی اچھی چیز ہے، شریعت میں اس کی ممانعت کیسے ہوسکتی ہے؟ بس اس کے ظاہری حسن اور اپنی پسند کو معیار بناکر آدمی اس پر ریجھ جاتا ہے، اور اس کے باطن میں جو قباحتیں اور خرابیاں ہیں، ان پر اس کی نظر نہیں جاتی۔ اس کی مثال بالکل ایسی سمجھئے کہ کسی بدصورت مہرو کو اچھا لباس پہنادیا جائے تو جو لوگ

besturdubooks.wordpress.com

ان کی اندرونی کیفیت سے نا واقف ہیں، ان کے خوش نما لباس کو دیکھ کر اسے جنت کی حور تصور کریں گے اور دور ہی سے اس کی خوبصورتی کے دلدادہ عاشق ہو جائیں گے۔ عوام کی نظریں چونکہ ظاہری سطح تک محدود ہوتی ہیں، اس لئے وہ سنتِ نبوی کے اتنے عاشق نہیں ہوتے جس قدر کہ بدعات و خرافات پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ عوام کی اس نفسیاتی کمزوری سے آگاہ ہیں، انہیں بدعات کی ایجاد کے لئے تیار شدہ فصل مل جاتی ہے۔

دوم... دوسرا سبب شیطان کی تسویل و تزویر ہے۔ آپ کو علم ہے کہ شیطان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں سے سب سے زیادہ دشمنی ہے، وہ جانتا ہے کہ اولادِ آدم کے جنت میں جانے کا یہی ایک راستہ ہے، وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ بڑی محنت و جانفشانی سے وہ لوگوں کو بہکا بہکا کر ان سے گناہ کرواتا ہے، مگر گناہ کا نشان ان کے دل سے کسی طرح نہیں نکل پاتا اور وہ ایک بار اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر سچی توبہ کر لیتے ہیں تو اس کے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ شیطان جب راندۂ درگاہ ہوا تو اس لعین نے قسم کھا کر کہا کہ یا اللہ! آپ نے آدم (علیہ السلام) کی وجہ سے مجھے مردود بنا دیا ہے، میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے، اس کی اولاد کو گمراہ کروں گا۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس کے جواب میں فرمایا: میں بھی اپنی عزت اور بلندیٔ مرتبت کی قسم کھاتا ہوں! کہ جنہوں نے خواہ کتنے ہی بڑے بڑے گناہ کئے ہوں، جب تک میری بارگاہ میں آکر معافی مانگتے رہیں گے کہ "یا اللہ! ہم سے حماقت ہوئی، معاف کردیجئے" میں ان کو معاف کرتا رہوں گا۔ (مشکوٰۃ ص:۲۰۴)

الغرض! توبہ و استغفار نے شیطان کی کمر توڑ رکھی تھی، اور اسے بڑے بڑے پاپ کرانے کے بعد بھی انسانوں کے بارے میں یہ خطرہ رہتا تھا کہ وہ سچی توبہ کرکے گناہوں سے پاک صاف نہ ہو جائیں:

تر دامنی پہ اپنی اے زاہد نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اس لئے شیطان نے انسانیت کو گمراہ کرنے کے لئے "بدعت" کا بے خوف و خطر

راستہ ایجاد کیا، جس سے انہیں کبھی توبہ کی توفیق نہ ہو۔

شیطان، معلم ملکوت رہ چکا ہے، اور وہ ہر جائز کو ناجائز، اور ہر ناروا کو روا ثابت کرنے کی اتنی تاویلیں جانتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی ذریت بھی اس کو استاد مان جائے۔ اور پھر وہ ہر شخص کی نفسیات کا ماہر ہے، وہ ہر طبقے، ہر گروہ اور ہر فرد کو الگ انداز میں گمراہ کرتا ہے، جیسا کہ آج کے دور میں آپ دیکھتے ہیں کہ پروپیگنڈے کے زور سے کس طرح سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دیا جاتا ہے، ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنا دیا جاتا ہے۔ حق کو باطل اور باطل کو حق دکھایا جاتا ہے، یہ شیطان کے کرتب کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوا کرتی ہے کہ دین کی وہ باتیں جن کا ثبوت آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن ہے، لوگ بڑی ڈھٹائی سے ان کا انکار کر دیتے ہیں اور ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا دفتر کھول دیتے ہیں، لیکن ایسی باتیں جن کا خلافِ دین اور خلافِ عقل ہونا ایسی بدیہی بات ہے کہ ایک بچہ بھی اسے سمجھ سکتا ہے، اس کو قرآن و حدیث کھول کھول کر لوگ دین ثابت کرتے ہیں، اب اس کو شیطان کی تسویل کے سوا اور کس چیز کا نام دیا جائے؟ قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ" کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے سامنے آراستہ کر دیا ہے۔

الغرض! دینِ حق کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا، اور نئی نئی نظریاتی اور عملی بدعتوں کو ان کی نظر میں مزین کر دینا، یہ شیطان کا وہ کاری حربہ ہے جس سے وہ اللہ کی مخلوق کو بلا خوف و خطر گمراہ کر سکتا ہے۔ یہ نکتہ ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہے، اور امام غزالی، امام ابن جوزی اور امام شعرانی رحمہم اللہ جیسے اکابر نے اس پر مستقل رسائل اور کتابیں لکھی ہیں۔

سوم:... بدعات کی ایجاد کا تیسرا سبب حبِ جاہ اور شہرت پسندی کا مرض ہے، یہ ایک نفسیاتی چیز ہے کہ لوگ جدت پسندی میں دلچسپی لیتے ہیں اور ہر نئی چیز کو (بشرطیکہ اس پر کوئی خوش نما غلاف چڑھا دیا جائے) دوڑ کر اچکتے ہیں، اس لئے شہرت پسندی کے مریض دین کے معاملے میں بھی نئی نئی جدتیں تراشتے رہتے ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ:

"آخری زمانے میں بہت سے جھوٹے دجال (فریبی) ہوں گے، وہ تمہیں ایسی باتیں سنائیں گے جو نہ کبھی تم نے سنی ہوں گی، نہ تمہارے باپ دادا نے، ان سے بچتے رہنا، وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں، اور فتنے میں نہ ڈال دیں۔" (مشکوٰۃ ص ۲۸)

چہارم:... بدعات کی اختراع و ایجاد کا ایک اہم سبب غیر اقوام کی تقلید ہے۔ تمدن و معاشرت کا یہ ایک فطری اصول ہے کہ جب مختلف تہذیبوں کا اختلاط ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر ایک دوسری کو متاثر کرتی ہیں، جو قوم اپنے تہذیبی خصائص کے تحفظ کا اہتمام نہیں کرتی، وہ اپنے بہت سے امتیازی اوصاف کو کھو بیٹھتی ہے، خصوصیت کے ساتھ جو تہذیب مفتوح و مغلوب ہو، وہ غالب تہذیب کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے۔ مسلمان جب تک غالب و فاتح تھے اور ان میں اپنے تہذیبی خصائص کے تحفظ کی تب و تاب تھی، اس وقت تک وہ دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہوتے رہے، لیکن جب ان کی ایمانی حرارت ٹھنڈی ہوگئی، دلوں کی انگیٹھیاں سرد پڑ گئیں اور ان میں من حیث القوم اپنے خصائص کے تحفظ کا ولولہ نہ رہا تو وہ خود دوسری تہذیبوں سے متاثر ہونے لگے۔ دورِ جدید میں مسلمانوں کا انگریزی تہذیب سے متاثر ہونا اس کی کافی شہادت ہے۔ اس اجنبی اثر پذیری کا نتیجہ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ غیر اقوام کے رسوم و رواج کو دینی حیثیت دے دی گئی، اور ان کے جواز و استحسان کے ثبوت پیش کئے جانے لگے۔ یہی راز ہے کہ ہر علاقے کے مسلمانوں میں الگ الگ بدعات رائج ہیں، ہندوستان میں جو بدعات رائج ہیں، وہ عرب علاقوں میں نہیں، اور مصر و شام کی بہت سی بدعات ہندوستان میں رائج نہیں ہوسکیں۔

ہندوستان میں اسلام بڑی کثرت سے پھیلا، مگر افسوس ہے کہ ان نومسلموں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہ ہوسکا، اس لئے وہ لوگ جو ہندو مذہب چھوڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، اپنے سابقہ رسم و رواج سے آزاد نہ ہوسکے، بلکہ ہندو معاشرے سے شدید اختلاط کی بنا پر ان مسلمانوں میں بھی، جو ہندوستان میں باہر سے آئے تھے، یہ ہندوانہ رسوم و رواج در آئے۔ چنانچہ شادی اور مرگ کے موقع پر ہندوستان کے مسلمانوں میں جو خلافِ شرع رسمیں رائج ہیں، اور جن کو مردوں سے زیادہ عورتیں جانتی ہیں، وہ سب ہندو مذہب

besturdubooks.wordpress.com

کے جاتے ہیں، جیسا کہ ایک تو مسلم عالم مولانا عبید اللہ نے "تحفۃ الہند" میں تحریر فرمایا ہے۔
میرا مقصد یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہندوستانی مسلمانوں کی ساری چیزیں ہندوانہ ہیں، اور نہ یہ
مطلب ہے کہ سارے مسلمان ان میں مبتلا ہیں، بلکہ میری مراد ان رسوم و عادات سے ہے
جن کا ثبوت ہماری اسلامی شریعت میں نہیں، بلکہ ہندو معاشرے میں ملتا ہے۔ بہت سے
ایسے علاقے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی مسلمان وہاں بہت ہی قلیل تعداد میں تھے اور ان
کو اسلامی تعلیم و تربیت کا موقع میسر نہیں آتا تھا، ان کے نام تک ہندوانہ تھے، وہ سر میں چوٹی
تک رکھتے تھے، ظاہر ہے جن لوگوں کی یہ حالت ہو، وہ بے چارے ہندوانہ بدعات میں مبتلا
نہ ہوتے تو اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ اس سے دوسرے ممالک کے مغلوب مسلمانوں کی حالت
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور پھر چونکہ یہ رسوم و عادات گویا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہیں،
اس لئے وہ اسلامی تعلیمات کو ایک نئی چیز سمجھتے ہیں، بہت سی عورتیں اور ناواقف مردوں کو
جب اسلامی مسائل سے مطلع کیا جائے تو انہیں یہ کہتے سنا گیا ہے: "نئے نئے مولوی، نئے
نئے مسئلے!" گویا وہ رسم و رواج جو ہندو معاشرے سے وراثت میں ملا ہے، وہ تو ایک مستقل
دین کی حیثیت رکھتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جن سے وہ ہمیشہ غافل
اور ناواقف رہے ہیں ان کے نزدیک ایک نیا دین ہے۔

یہ تھے وہ چند اسباب جو اسلامی معاشرے میں بدعات کے فروغ کا سبب بنے،
اور مجھے افسوس ہے کہ اس میں قصور عوام سے زیادہ ان اہلِ علم کا ہے، جنھوں نے اسلام کی
پاسبانی کا فریضہ انجام دینے اور دینِ قیم کو بدعات کی آلائش سے پاک رکھنے کے بجائے
سیلابِ بدعات میں بہہ جانے کو کمال سمجھ لیا۔

۸:...اب میں چند اصول عرض کرتا ہوں، جن سے سنت و بدعت کے امتیاز میں
مدد مل سکے گی۔ اس کا اصل الاصول تو اوپر عرض کر چکا ہوں، جو چیز سلفِ صالحین کے زمانے
میں نہیں تھی، اسے دین سمجھ کر اختیار کرنا "بدعت" کہلاتا ہے، تاہم اس اصول کو چند ذیلی
اصولوں کے تحت ضبط کیا جا سکتا ہے۔

اوّل:...شریعت نے ایک چیز ایک موقع پر تجویز کی ہے، جب ہم محض اپنی رائے

اس کی ایک مثال قبر پر اذان کہنا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شریعت نے نماز پنج گانہ اور جمعہ کے سوا عیدین، کسوف و خسوف، استسقاء اور جنازے کی نمازوں کے لئے بھی اذان و اقامت تجویز نہیں کی۔ اب اگر کوئی شخص اجتہاد کرے کہ جیسے پانچ نمازوں کے اعلان و اطلاع کے لئے اذان کی ضرورت ہے، وہی ضرورت یہاں بھی موجود ہے لہٰذا ان نمازوں میں اذان کہنی چاہئے، تو اس کا یہ اجتہاد صریح غلط ہوگا۔ اس لئے کہ جو مصلحت اس کی عقل شریف میں آئی ہے، اگر وہ لائق اعتبار ہوتی تو شریعت ان موقعوں پر بھی ضرور اذان کا حکم دیتی۔

یا مثلاً: کوئی شخص یہ اجتہاد کرے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اذان سے شیطان بھاگ جاتا ہے، چونکہ مردے کے پاس سے شیطان کو بھگانا ضروری ہے، اس لئے دفن کے بعد قبر پر بھی اذان کہی جائے۔ تو یہ اجتہاد بھی بالکل غلط سمجھا جائے گا، کیونکہ اول تو شیطان کا اغوا مرنے سے پہلے تک تھا، جو مر گیا شیطان کو اس سے کیا کام؟ دوسرے اگر یہ مصلحت صحیح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کی سمجھ میں بھی آسکتی تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے قبر پر اذان کہنا ثابت نہیں، اسی بنا پر فقہائے اہل سنت نے اس کو "بدعت" کہا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ "باب الاذان" میں لکھتے ہیں: "خیر رملی نے بحر الرائق کے حاشیے میں لکھا ہے کہ بعض شافعیہ نے اذان مولود پر قیاس کرکے دفن میت کے وقت اذان کہنے کو مندوب کہا ہے، مگر ابن حجر نے شرح عباب میں اس قیاس کو رد کیا ہے۔" (رد المحتار ج:۱ ص:۳۸۵ طبع جدید)

اور دفن میت کے بیان میں فرماتے ہیں کہ: "مصنف نے دفن میت کا صرف مسنون طریقہ ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میت کو قبر میں اتارنے کے موقع پر اذان کہنا مسنون نہیں، جیسا کہ آج کل عادت ہوگئی ہے، اور ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں تصریح کی ہے کہ یہ "بدعت" ہے۔" (ج:۲ ص:۲۳۵)

اس کی ایک مثال نمازوں کے بعد مصافحے کا رواج ہے۔ شریعت نے باہر سے آنے والے کے لئے سلام اور مصافحہ مسنون ٹھہرایا ہے، مگر مجلس میں بیٹھے بیٹھے اچانک ایک دوسرے سے مصافحہ و معانقہ کرنے لگیں، سلف صالحین میں اس حرکت کا

ہے مگر وہ بدعت ہونے کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس خاص موقع
پر مصافحہ سلف صالحین سے منقول نہیں۔"

یہاں میں نے اس قاعدے کی چند مثالیں ذکر کی ہیں، ورنہ اس کی بیسیوں مثالیں میرے سامنے موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ شریعت نے جس چیز کا جو موقع تجویز کیا ہے، اس کے بجائے دوسری جگہ اس کا منتقل کرنا "بدعت" ہوگا۔

دوم:... شریعت نے جو چیز مطلق رکھی ہے، اس میں اپنی طرف سے قیود لگانا بھی بدعت ہے۔

مثلاً: شریعت نے زیارتِ قبور کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا، اب کسی بزرگ کی قبر پر جانے کے لئے ایک وقت مقرر کرلینا اور اسی کو ضروری سمجھنا بدعت ہوگا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ زیارتِ قبور کے لئے دن متعین کرنا، یا ان کے عرس پر جانا، جو کہ ایک متعین دن ہوتا ہے، درست ہے یا نہیں؟ جواب میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"برائے زیارتِ قبور روز معین نمودن بدعت است، اصل زیارت جائز... و تعین وقت در سلف نبود، و ایں بدعت از آں قبیل است کہ اصلش جائز است و خصوصیتِ وقت بدعت... مانند مصافحہ بعد عصر کہ در بعضے بلادِ توران وغیرہ رائج است... و روزِ عرس برائے یاد دہانیدن وقت زیارت است، اگر باشد مضائقہ ندارد، لیکن التزام آں روز نیز بدعت است از ہمیں قبیل کہ گذشت۔"

(فتاویٰ عزیزی ج:۱ ص:۹۳)

ترجمہ: "قبروں پر جانے کے لئے دن متعین کرلینا بدعت ہے، اور اصل زیارت جائز ہے... وقت کا تعین سلف صالحین میں نہیں تھا، اور یہ بدعت اس طرح کی ہے کہ اس کی اصل تو جائز ہے مگر خصوصیتِ وقت بدعت ہے، اس کی مثال عصر کی نماز کے بعد مصافحہ

ہے، جس کا حکم تو دیان وغیرہ میں رواج ہے... اور اگر میت کے
لئے دعا کی یاددہانی کی غرض سے کہیں ہو تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کو
لازم کر لینا بھی بدعت ہے، وہ اسی قبیل سے جو ابھی گزرا۔“

اور آج کل بزرگوں کے عرس پر جو خرافات ہوتی ہیں اور جس طرح میلے لگتے ہیں، اس کو تو کوئی عقل مند بھی صحیح اور جائز نہیں کہہ سکتا۔

اسی طرح شریعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، بزرگانِ دین اور عام مسلمانوں کے ایصالِ ثواب کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا، آدمی جب چاہے ایصالِ ثواب کر سکتا ہے، البتہ اس کے لئے خاص خاص اوقات اور خاص خاص صورتیں تجویز کر لینا اور انہی کی پابندی کو ضروری سمجھنا بدعت ہوگا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ ربیع الاول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کے ایصالِ ثواب کے لئے اور محرم میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر اہلِ بیت کے ایصالِ ثواب کے لئے کھانا پکانا صحیح ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

”برائے ایں کار وقت و روز تعیین نمودن و اینہا مقرر بودن
بدعت است، آرے اگر وقتے بفضل آں ممتاز گردد کہ ثواب زیادہ شود
مثل ماہِ رمضان کہ عمل بندۂ مومن دریں ماہ بہ ہفتاد درجہ ثواب زیادہ دارد
مضائقہ نیست زیرا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم برآں ترغیب فرمودہ
اند بقول حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ و در چیزے کہ دراں ترغیب
صاحبِ شرع و تعیینِ وقت نباشد آں تعیین عبث است و مخالفِ سنت سید
الانام...... و مخالفت سنت حرام است، پس چیزے روا نباشد، اگر کسے
خود بخود خیرات کند در ہر روز کہ باشد ثواب حاصل شود۔“

(فتاویٰ عزیزی ص ۹۳)

ترجمہ... ”اس کام کے لئے دن، وقت اور مہینہ مقرر

besturdubooks.wordpress.com

کر لینا بدعت ہے، ہاں اگر ایسے وقت عمل کیا جائے جس میں ثواب زیادہ ہوتا ہے، مثلاً: ماہِ رمضان کہ اس میں بندۂ مومن کا عمل چڑھتا بڑھ جاتا ہے، تو مضائقہ نہیں، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب فرمائی ہے۔ بقول امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو چیز کہ صاحبِ شریعت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی ترغیب نہیں دی اور اس کا وقت مقرر نہیں فرمایا، وہ فعل عبث ہے، اور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مخالف..... اور جو چیز مخالفِ سنت ہو، وہ حرام ہے، ہرگز روا نہ ہوگی، اور اگر کسی کا جی چاہتا ہے تو خفیہ طور پر خیرات کر دے، جس دن بھی چاہے، تاکہ لوگوں کو خبر نہ ہو۔''

اسی قاعدے کی بناء پر علمائے اہلِ سنت نے تیجا، ساتواں، دسواں، چالیسواں کرنے کی رسم کو بدعت کہا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ شرح ''سفر السعادۃ'' میں لکھتے ہیں:

''عادت نبودکہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند، و قرآن خوانند و ختمات خوانند، نہ بر سر گور، نہ غیر آں، و ایں مجموع بدعت است و مکروہ۔ نعم تعزیت اہلِ میت و تسلیہ و صبر فرمودن سنت و مستحب است، اما ایں اجتماع مخصوص روزِ سوم و ارتکاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است و حرام است۔'' (شرح سفر السعادۃ ص:۲۷۴)

ترجمہ:... ''عادت نبوی نہ تھی کہ میت کے لئے وقتِ نماز کے علاوہ جمع ہوں، اور قرآن خوانی کریں، اور ختم پڑھیں، نہ قبر پر اور نہ کسی دوسری جگہ..... یہ ساری چیزیں بدعت اور مکروہ ہیں، ہاں! اہلِ میت کی تعزیت کرنا، ان کو تسلی دلانا اور صبر کی تلقین کرنا سنت و مستحب ہے، لیکن یہ تیسرے دن کا خاص اجتماع اور دوسرے تکلفات اور

مرنے کا مال یتیموں کا حق بن چکا ہے۔ بغیر وصیت کے خرچ کرنا
بدعت اور حرام ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں جو "رسم قل" کی جاتی ہے، بزرگوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں، ختم پڑھا جاتا ہے اور دیگر رسمیں ادا کی جاتی ہیں، یہ رسمیں خلافِ شریعت اور بدعت ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ذکر و تسبیح، تلاوت، درود شریف اور صدقہ و خیرات کے ذریعہ میت کو ایصالِ ثواب جتنا چاہے کرے، اور میت کو ثواب بخشے، یہ بلاشبہ جائز اور درست ہے، لیکن میت کے گھر جمع ہونا، اور اس کے مال سے کھانا تیار کرکے خود بھی کھانا اور دوسروں کو بھی کھلانا شریعت کے خلاف ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وصیت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"بعد مردن من رسوم دنیوی مثل دہم و بستم و چہلم و ششماہی و برسی ہیچ نکنند کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ از سہ روز ماتم کردن جائز نداشتہ اند و حرام ساختہ اند" (مالابد منہ ص:۱۴۰)

ترجمہ... "میرے مرنے کے بعد دنیوی رسمیں، جیسے دسواں، بیسواں، چالیسواں، ششماہی اور برسی، کچھ نہ کریں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زیادہ سوگ کرنے کو جائز نہیں رکھا، بلکہ حرام قرار دیا ہے۔"

علامہ شامی رحمہ اللہ "فتح القدیر" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اھل المیت، لانہ شرع فی السرور لا فی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ روی الامام احمد وابن ماجۃ باسناد صحیح عن جریر بن عبداللہ قال: کنا نعد الاجتماع الی اھل المیت وصنعھم الطعام من النیاحۃ۔" (ردالمحتار ج:۲ ص:۲۴۰)

ترجمہ: "اہلِ میت کی طرف سے کھانے کی دعوت کرنا مکروہ

ظہر، عصر کی نمازوں میں بھی اونچی قراءت کرنے لگے تو اس کا یہ فعل ناجائز اور بدعت ہوگا۔

یا مثلاً جہری نمازوں میں بھی "سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ، اَعُوْذُ بِاللّٰہِ، بِسْمِ اللّٰہِ ..." آہستہ پڑھی جاتی ہے، اگر کوئی شخص ان کو بھی جہراً قراءت کرنے لگے تو یہ جائز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے ان سے دریافت کیا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بلند آواز سے بسم اللہ شریف پڑھی جاتی ہے؟ فرمایا بیٹا! یہ بدعت ہے، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے، وہ بلند آواز سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نہیں پڑھا کرتے تھے۔

یا مثلاً نماز ختم ہونے کے بعد احادیث طیبہ میں مختلف اوراد و اذکار اور دعاؤں کا حکم فرمایا گیا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام یہ اذکار اور دعا بآوازِ بلند نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ ہر شخص اپنے من میں پڑھا کرتا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کو ان اوراد و اذکار اور دعاؤں میں یہی کیفیت مطلوب ہے، اور امت کو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مساجد میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ نماز کے بعد مل کر اونچی آواز سے کلمہ شریف کا ورد کرتے ہیں، یہ طریقہ نبوی اور منشائے شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت ہے۔

چہارم ... جس عبادت کو شریعت نے انفرادی طور پر مشروع فرمایا ہے، اس کو اجتماعی طور پر کرنا بدعت ہے، مثلاً فرض نماز تو اجتماعی طور پر پڑھی جاتی ہے اور شریعت کو اس کا اجتماعی طور پر ادا کرنا ہی مطلوب ہے، مگر نفلی نماز الگ الگ پڑھنے کا حکم دیا ہے، اس لئے نفل نماز اجتماعی طور پر پڑھنے کو ہمارے فقہاء نے مکروہ اور بدعت لکھا ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولذا منعوا عن الاجتماع لصلوٰة الرغائب التي أحدثها بعض المتعبدين، لأنها لم تؤثر على هذه الكيفية في تلك الليالي المخصوصة وإن كانت الصلوٰة خير موضوع۔" (ردالمحتار ج:۲ ص:۴۳۵)

ترجمہ: ... اسی لئے فقہاء نے ممانعت کی نماز "رغائب"

کے لئے جمع ہونے سے منع کیا ہے جو کہ بعض متعبدین نے ایجاد کی ہے، کیونکہ ان مخصوص راتوں میں اس کیفیت سے نماز پڑھنا منقول نہیں، اگرچہ نماز بذاتِ خود خیر کی چیز ہے۔"

اس سے شبِ برات، شبِ معراج اور شبِ قدر میں نمازوں کے لئے جمع ہونے اور ان کو اجتماعی شکل میں ادا کرنے کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔

یا مثلاً: شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو عبادات اجتماعی طور پر ادا کی گئی ہیں ان کے بعد تو دعا اجتماعی طور پر کی جائے، مگر جو عبادت الگ الگ ادا کی گئی ہو، اس کے بعد دعا بھی انفرادی طور پر ہونی چاہئے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین سے یہ منقول نہیں کہ وہ سنن و نوافل کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہوں، اس لئے ہمارے یہاں جو رواج ہے کہ لوگ سنتیں نفل پڑھنے کے بعد امام کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، سنن و نوافل سے فارغ ہونے کے بعد امام دعا کرتا ہے اور لوگ اس پر آمین آمین کہتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔ اگر اتفاقاً کسی بزرگ کی دعا میں شریک ہونے کے لئے ایسا ہو جائے تو مضائقہ نہیں مگر اس کی عادت بنالینا بدعت ہے۔

یا مثلاً: نماز کے علاوہ شریعت نے ذکر، تسبیح اور درود شریف وغیرہ اجتماعی طور پر پڑھنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ہر شخص کو الگ الگ پڑھنا ہوتا ہے، اب ان اذکار کو اجتماعی طور پر مل کر پڑھنا بدعت ہوگا۔

فتاویٰ عالمگیری میں "محیط" سے نقل کیا ہے:

"قراءة الكافرون الى الآخر مع الجمع مكروهة لانها بدعة لم تنقل عن الصحابة ولا عن التابعين۔" (ص: ۳۱۷)

ترجمہ: "سورۃ الکافرون سے آخر تک جمع کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ بدعت ہے، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں۔"

besturdubooks.wordpress.com

فتاویٰ بزازیہ میں فتاویٰ قاضی خان کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"رَفْعُ الصَّوْتِ بِالذِّکْرِ حَرَامٌ وَقَدْ صَحَّ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّہٗ سَمِعَ قَوْمًا اِجْتَمَعُوْا فِیْ مَسْجِدٍ یُھَلِّلُوْنَ وَیُصَلُّوْنَ عَلَیْہِ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ جَھْرًا، فَرَاحَ اِلَیْھِمْ فَقَالَ: مَا عَھِدْنَا ذٰلِکَ عَلٰی عَھْدِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ، وَمَا اَرَاکُمْ اِلَّا مُبْتَدِعِیْنَ، فَمَا زَالَ یَذْکُرُ ذٰلِکَ حَتّٰی اَخْرَجَھُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ۔" (بزازیہ حاشیہ فتاویٰ عالمگیری ج:۶ ص:۳۷۸)

ترجمہ:... "بلند آواز سے ذکر کرنا حرام ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بسندِ صحیح منقول ہے کہ آپ نے سنا کہ کچھ لوگ مسجد میں جمع ہوکر بلند آواز سے کلمہ طیبہ اور درود شریف کا وِرد کر رہے ہیں، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیز نہیں دیکھی، میرا خیال ہے کہ تم بدعت کر رہے ہو، آپ بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ انہیں مسجد سے نکال دیا۔"

اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ آج کل مسجدوں میں زور زور سے کلمہ طیبہ پڑھنے اور کاکا کر درود و سلام پڑھنے کا جو بعض لوگوں نے رواج نکالا، یہ بدعت ہے اور اس سے مساجد کو پاک کرنا لازم ہے۔

پانچواں: شریعت نے نمازِ جنازہ کا ایک خاص طریقہ تجویز فرمایا ہے، مگر نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی طور پر دُعا کرنے کی تعلیم نہیں دی، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ اس موقع پر اجتماعی دُعا کیا کرتے تھے، اس لئے جنازے کے بعد اجتماعی دُعا کرنا اور اس کو ایک سنت بنالینا بدعت ہوگا۔ جنازے کے بعد دُعا کرنی ہو تو صفوں کی ترتیب کو توڑ دیا جائے اور ہر شخص اپنے طور پر بغیر ہاتھ اُٹھائے دُعا کرے تو مضائقہ نہیں۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازے کی جو کیفیت منقول ہے، اس میں ترمیم کرنے کی اجازت نہیں۔

مجھے توقع ہے کہ موٹی موٹی بدعات انہی اصولوں کے تحت آجاتی ہیں، اور ان سب کا اصل الاصول وہی ہے جو پہلے عرض کرچکا ہوں، یعنی جو فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول نہ ہو اسے دین کی حیثیت سے کرنا بدعت ہے۔ اس لئے اسی پر اکتفا کرتے ہوئے یہاں چند ضروری فوائد لکھ دینا چاہتا ہوں۔

اوّل:... بعض لوگ غلط سلط روایات سے بعض بدعات کا جواز ثابت کیا کرتے ہیں، اس لئے وہ قاعدہ یاد رکھنا چاہئے جو صاحب درمختار نے خیر رملیؒ سے اور ابن عابدین شامیؒ نے تقریب سیوطیؒ سے نقل کیا ہے کہ کمزور روایت پر عمل کرنے کی تین شرطیں ہیں، ایک یہ کہ وہ روایت بہت زیادہ کمزور نہ ہو، مثلاً: اس کا کوئی راوی جھوٹا یا تہمت سے متہم ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ چیز شریعت کے کسی عام اصول کے تحت داخل ہو۔ تیسرے یہ کہ اس کو سنت نہ سمجھا جائے۔ (ردالمحتار ج:۱ ص:۱۲۹)

بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اذان و اقامت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سن کر انگوٹھے چومتے ہیں، اور اس کے ثبوت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے، بدقسمتی سے اس میں مذکورہ بالا تینوں شرطوں میں سے ایک بھی نہیں پائی جاتی۔

اوّل تو وہ روایت ایسی مہمل ہے کہ ماہرین علم حدیث نے اس کو موضوع اور من گھڑت کہا ہے۔

دوسرے، یہ روایت اصول دین میں سے کسی اصل کے تحت داخل نہیں۔

تیسرے، اس کو کرنے والے اسے صرف سنت سمجھتے ہیں، بلکہ دین کا اعلیٰ ترین شعار تصور کرتے ہیں، اور علامہ شامیؒ اور دیگر اکابر نے ایسا کرنے کو غیر اصلی اور مجہول قرار دیا ہے۔

جس شخص نے یہ روایت گھڑی ہے، اس نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے یہ نہیں سوچا کہ اذان و اقامت دن میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ روزانہ دس مرتبہ دہرائی جاتی ہے، اب اگر اذان و اقامت کے وقت انگوٹھے چومنا سنت ہوتا تو جس طرح اذان و اقامت مسلمانوں میں متواتر چلی آتی ہے اور ہم تک پہنچی ہے، اسی طرح یہ عمل بھی مسلمانوں میں متواتر

ہوتا، حدیث کی ساری کتابوں میں اس کو درج کیا جاتا اور مشرق سے مغرب تک پوری امت اس پر عمل پیرا ہوتی۔

غرض امت نے تصریح کی ہے کہ امت کے عملی تواتر کے مقابلے میں صحیح ترین حدیث بھی موجود ہو تو اس کو یا تو منسوخ سمجھا جائے گا یا اس کی کوئی مناسب تاویل کی جائے گی۔ بہرحال یک گونہ تواتر عمل کے مقابلے میں کسی روایت پر عمل کرنا صحیح نہیں۔ امام ابوبکر جصاص رازی رحمہ اللہ نے "احکام القرآن" میں اس قاعدے کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور فرماتے ہیں کہ اسی بنا پر ہمارے اصحاب نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر مطلع بالکل صاف ہو تو رمضان اور عید کے چاند کے لئے ایک دو آدمیوں کی شہادت کافی نہیں، بلکہ شہادت دینے والی اتنی بڑی جماعت ہونی چاہئے کہ غلطی کا احتمال نہ رہے، اس لئے کہ اکا دکا آدمی کی شہادت پر اعتماد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس علاقے کے لاکھوں انسانوں کو گویا اندھا فرض کررہے ہیں۔ (احکام القرآن ج:۱ ص:۲۸۲) امام سرخسی رحمہ اللہ کسی روایت کے انقطاعِ معنوی کی چار صورتیں قرار دیتے ہیں:

اول... وہ کتاب اللہ کے مخالف ہو۔

دوم... سنتِ متواترہ یا مشہورہ کے مخالف ہو۔

سوم... ایسے مسئلے میں، جس کی ضرورت ہر خاص و عام کو ہے، وہ امت کے تعامل سے منحرف ہو۔

چہارم... سلف میں یہ متنازعہ بحث رہی ہو مگر کسی نے اس کا حوالہ نہ دیا ہو۔

(اصول سرخسی ج:۱ ص:۳۶۴)

دوسری صورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وكذلك الغريب من أخبار الآحاد إذا خالف السنة المشهورة فهو منقطع في حكم العمل به، لأن ما يكون متواترا في السنة أو مستفيضا أو مجمعا عليه فهو بمنزلة الكتاب في ثبوت علم اليقين، وما فيه شبهة فهو

مَرْدُوْدٌ فِي مُقَابَلَةِ عِلْمِ الْيَقِيْنِ." (ص:۳۶۶)

ترجمہ... "اسی طرح ایسی خبر واحد، جس کا راوی صرف ایک ہو، جب سنت مشہورہ کے خلاف ہو تو (وہ صحیح الاسناد ہونے کے باوجود) عمل کے حق میں منقطع تصور ہوگی، کیونکہ جو سنت کہ متواتر، مستفیض اور مجمع علیہ ہو وہ علم الیقین کے ثبوت میں بمنزلہ کتاب اللہ کے ہے، اور جس چیز میں شبہ ہو وہ علم الیقین کے مقابل مردود ہے۔"

اس ذیل میں امام سرخسی رحمہ اللہ نے بڑے پتے کی بات لکھی ہے، اور دراصل اسی کو یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

"فَفِي هٰذَا النَّوْعِ مِنَ الْاِنْتِقَادِ لِلْحَدِيْثِ عِلْمٌ كَبِيْرٌ وَصِيَانَةٌ لِلدِّيْنِ بَلِيْغَةٌ، فَإِنَّ أَصْلَ الْبِدَعِ وَالْأَهْوَاءِ إِنَّمَا ظَهَرَ مِنْ قِبَلِ تَرْكِ عَرْضِ أَخْبَارِ الْآحَادِ عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ." (ص:۳۶۷)

ترجمہ... "روایات کو ان دونوں طریقوں سے پرکھنا بہت بڑا علم ہے اور دین کی بہترین حفاظت، کیونکہ بدعات وخواہشات کی اصل یہیں سے ظاہر ہوئی کہ ان آحاد کی روایات کو کتاب اللہ اور سنت مشہورہ سے نہیں جانچا گیا۔"

آپ غور کریں گے تو تمام بدعات کا سرچشمہ یہی ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور امت کے عملی تواتر سے آنکھیں بند کرکے ادھر ادھر سے کچی پکی باتوں کو لیا گیا، انہیں دین بنا لیا گیا، اور پھر کتاب وسنت کو اس پر چسپاں کیا جانے لگا۔ امام سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فَإِنَّ قَوْمًا جَعَلُوْهَا أَصْلًا مَعَ الشُّبْهَةِ فِي اتِّصَالِهَا بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَ أَنَّهَا لَا تُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ثُمَّ تَأَوَّلُوْا عَلَيْهَا الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ الْمَشْهُوْرَةَ وَجَعَلُوا التَّبَعَ مَتْبُوْعًا، وَجَعَلُوا الْأَسَاسَ مَا هُوَ

besturdubooks.wordpress.com

غَيْرُ مُتَيَقَّنٍ بِهِ، فَوَقَعُوْا فِي الْأَهْوَاءِ وَالْبِدَعِ۔" (ص:۳۶۷)

ترجمہ:... "چنانچہ کچھ لوگوں نے ان شاذ روایات کو اصل بنالیا، حالانکہ ان کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت مشتبہ تھی، اور باوجودیکہ ان سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا تھا، اور کتاب اللہ اور سنتِ مشہورہ میں تاویلیں کرکے اس پر چسپاں کرنا شروع کردیں، پس انہوں نے تابع کو متبوع اور غیر یقینی چیز کو بنیاد بنایا، اس طرح اہواء و بدعات کے گڑھے میں جاگرے۔"

ٹھیک اسی معیار پر انگوٹھے چومنے کی اس بے اصل روایت کا قصہ بالکل جعلی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس کو صحیح سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام صحابہؓ و تابعینؒ اور بعد کی ساری اُمت کے تعامل کو چھوڑ رہے ہیں، کیونکہ اگر اس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہوتی تو ناممکن تھا کہ صحابہؓ و تابعینؒ کی پوری جماعت دن میں دس مرتبہ اس پر عمل نہ کرتی، اور ناممکن تھا کہ تمام کتبِ حدیث میں اس کو جگہ نہ ملتی۔

دوم:... جو عمل بذاتِ خود مباح ہو، مگر اس میں بدعت کی آمیزش ہو جائے یا اس کو سنت سمجھا جانے لگے تو اس کو ترک کردینا ضروری ہے۔

حدیث و فقہ کی کتابوں میں اس قاعدے کی بہت سی مثالیں مذکور ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے ائمہ احناف نے نمازوں کے بعد سجدۂ شکر ادا کرنے کو مکروہ لکھا ہے۔ (عالمگیری ج:۱ ص:۱۳۶، شامی ج:۱ ص:۱۲۰)

درمختار (قبیل صلوٰۃ المسافر) وغیرہ میں ہے:

"سَجْدَةُ الشُّكْرِ مُسْتَحَبَّةٌ، بِهِ يُفْتٰى، لٰكِنَّهَا تُكْرَهُ بَعْدَ الصَّلٰوةِ، لِأَنَّ الْجَهَلَةَ يَعْتَقِدُوْنَهَا سُنَّةً أَوْ وَاجِبَةً. وَكُلُّ مُبَاحٍ يُؤَدِّيْ إِلَيْهِ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ."

ترجمہ:... "سجدۂ شکر مستحب ہے، اسی پر فتویٰ ہے، لیکن نمازوں کے بعد مکروہ ہے، کیونکہ جاہل لوگ اس کو سنت یا واجب سمجھ

besturdubooks.wordpress.com

کسے دم اندر منع بدعت زند و باحیائے سنت لب کشاید۔

اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہائے بدعت اند ومحو کنندہائے سنت، بدعتہائے پہن شدہ را تعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آن فتویٰ می دہند و مردم را بہ بدعت دلالت می نمایند۔"

(مکتوبات امام ربانی دفتر دوم مکتوب ۵۴)

ترجمہ... "وصول الی اللہ کا نزدیک ترین راستہ (جو ولایت سے بھی قریب تر ہے) اس فقیر کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنا اور بدعت کے نام و رسم سے بھی اجتناب کرنا ہے۔ آدمی جب تک بدعت سیئہ کی طرح بدعت حسنہ سے بھی پرہیز نہ کرے، اس دولت کی بو بھی اس کے مشام جان تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور یہ بات آج کل از بس دشوار ہے، کیونکہ جہان کا جہان دریائے بدعت میں ڈوبا ہوا اور بدعت کی تاریکیوں میں آرام پکڑے ہوئے ہے، کس کی مجال ہے کہ بدعت کی مخالفت کا دم مارے؟ یا کسی سنت کو زندہ کرنے میں لب کشائی کرے!

اس دور کے اکثر علماء بدعات کو رواج دینے والے اور سنت کو مٹانے والے ہیں، جو بدعتیں چاروں طرف پھیل گئی ہیں ان کو مخلوق کا تعامل سمجھ کر ان کے جواز بلکہ استحسان کا فتویٰ دیتے ہیں، اور بدعات کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔"

حق تعالیٰ شانہ مجھے، آپ کو، آپ کے رفقاء اور تمام مسلمانوں کو حضرت مجدد رحمہ اللہ کی اس وصیت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

besturdubooks.wordpress.com

مولانا مودودی

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے رُفقاء میں ایک گروہ مولانا مودودی کا مداح ہے، اور یہ حضرات مولانا موصوف کے سوا کسی کو عالم ہی نہیں جانتے، اس بارے میں بھی آپ میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار اپنے دو مضامین "تنقید اور حقِ تنقید" اور "الامام المجاہد" میں کرچکا ہوں، تاہم آپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں بھی کچھ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

مولانا مودودی کی تمام ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے مجھے موصوف سے بہت سی باتوں میں اختلاف ہے، جزئیات تو بے شمار ہیں، مگر چند کلیات حسبِ ذیل ہیں۔

۱:... مولانا مودودی کے قلم کی کاٹ اور شوخی ان کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، مگر اس ناکارہ کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی شاید یہی ہے، ان کا قلم مؤمن و کافر دونوں کے خلاف یکساں کاٹ کرتا ہے، اور وہ کسی فرق و امتیاز کا روادار نہیں۔ جس طرح وہ ایک لادین سوشلسٹ کے خلاف چلتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک مؤمنِ مخلص اور خادمِ دین کے خلاف بھی، وہ جس جرأت کے ساتھ اپنے کسی معاصر پر تنقید کرتے ہیں (جس کا انہیں کسی درجے میں حق ہے) اسی "جسارت" کے ساتھ وہ سلفِ صالحین کے کارناموں پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ وہ جب تہذیبِ جدید اور الحاد و زندقہ کے خلاف قلم اُٹھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث گفتگو کر رہا ہے، اور دُوسرے ہی لمحے جب وہ انبیاء کے خلاف خامہ فرسائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے مسٹر پرویز یا غلام احمد قادیانی کا قلم چھین لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ نبوّت و رسالت کا مقام کتنا نازک ہے؟

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

کسی نبی (علیہ السلام) کے بارے میں کوئی ایسی تعبیر روا نہیں جو ان کے مقامِ رفیع کے شایانِ شان نہ ہو، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے، پورا ذخیرۂ حدیث دیکھ جائیے، ایک لفظ ایسا نہیں ملے گا جس میں کسی نبی کی شان میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ گستاخی کا شائبہ پایا جاتا ہو، لیکن مولانا مودودی کا قلم حریمِ نبوت تک پہنچ کر بھی ادب ناآشنا رہتا ہے، اور وہ بڑی بے تکلفی سے فرماتے ہیں:

الف:... "موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقے میں بغاوت پھیل جائے۔"(۱) (رسالہ ترجمان القرآن ج:۲۹ عدد:۳ ص:۵)

ب:... "حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متأثر ہوکر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی۔" (تفہیمات حصہ دوم ص:۴۲ طبع دوم)

ج:... "حضرت داؤد علیہ السلام کے فعل میں خواہشِ نفس کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔"
(تفہیم القرآن ج:۴ سورۂ ص، ص:۳۲۷ طبع اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

د:... نوح علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب

(۱) تفہیمات کے نئے ایڈیشن نمبر ۳ صفحہ ۲۶۵ سے حذف ہے۔

ہو جاتا ہے..... لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے
نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لئے اپنا سمجھنا کہ وہ
تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے، محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے، تو وہ
فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اس طرزِ فکر کی طرف پلٹ
آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے۔"(۱)

(تفہیم القرآن ج:۲ ص ۳۴۴ طبع سوم ۱۹۶۴ء)

۲... سیدنا یوسف علیہ السلام کے ارشاد: "اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ"
(مجھے زمینِ مصر کے خزانوں کا نگران مقرر کر دیجئے) کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یہ محض وزیرِ مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا، جیسا
کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ یہ ڈکٹیٹر شپ کا مطالبہ تھا، اور اس کے
نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب
قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے۔"

(تفہیمات حصہ دوم ص ۱۲۲ طبع پنجم ۱۹۷۰ء)

۳... "حضرت یونس سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں
کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں، اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت
اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔"

(تفہیم القرآن ج:۲ سورۂ یونس حاشیہ ص ۳۱۲، ۳۱۳ طبع سوم ۱۹۶۴ء)

ظاہر ہے مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک "جلد بازی"... "خواہشِ نفس کی بنا پر"... "حاکمانہ اقتدار کا نامناسب استعمال"... "بشری کمزوریوں سے مغلوب"... "جذبۂ جاہلیت کا شکار"... "فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں"... اور... "ڈکٹیٹر شپ" جیسے الفاظ میں سوءِ ادب کا کوئی پہلو نہ پایا جاتا ہو، اس لئے وہ انبیاء علیہم

---

(۱) پہلے ایڈیشن میں اس عبارت کا مختصر حصہ ذکر کیا گیا تھا، مناسب معلوم ہوا کہ اس کے بجائے اصل عبارت درج کی جائے۔

besturdubooks.wordpress.com

اسلام کے بارے میں ایسے الفاظ کو استعمال کرنا صحیح سمجھتے ہوں لیکن اس کا فیصلہ بطریقِ احسن تو یوں ہو سکتا ہے کہ ایک یا دو اس قسم کے الفاظ اگر خود مولانا موصوف کے حق میں استعمال کیے جائیں تو ان کو یا ان کے کسی مداح کو ان سے ناگواری تو نہیں ہو گی؟ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ: "مولانا بڑے ہیں اپنے دور کے مفکر اور مصنف ہیں، وہ خود بشری نفس سے کام کرتے ہیں، جذبہ جاہلیت سے مغلوب ہو جاتے ہیں، حالاتِ اقتدار کا نامناسب استعمال کر جاتے ہیں اور انہوں نے اپنے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہیاں کی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ تو میرا خیال ہے کہ مولانا کا کوئی عقیدت مند ان "الزامات" کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اگر یہ الفاظ مولانا مودودی کی ذات سے بالاتر ہیں اور ان کے شایانِ شان نہیں، بلکہ یہ مولانا کی تنقیص اور سوءِ ادب ہے، تو انصاف فرمائیے کہ یہ ایسے الفاظ انبیائے کرام علیہم السلام کی شان میں زیبا اور شایانِ شان ہیں؟ اسی نوعیت کا ایک فقرہ اور سن لیجئے:

> "یہاں اس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے
> جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی ...... بس ایک فوری جذبہ
> نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا
> اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے
> معصیت کی پستی میں جا گرے۔"
>
> (تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۲۳ طبع سوم)

اس عبارت سے سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم گرامی حذف کر کے اس کی جگہ اگر مولانا مودودی کا نام لکھ دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ ان کے حلقے میں کہرام مچ جائے گا، اور پاکستان میں طوفان برپا ہو جائے گا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فقرہ شایانِ شان نہیں، بلکہ تنقیص اور سوءِ ادب ہے۔

اسی کی ایک مثال امہات المومنین کے حق میں موصوف کا یہ فقرہ ہے:

> "وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کچھ زیادہ
> جری ہو گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زبان درازی کرنے لگی

besturdubooks.wordpress.com

تحسین۔۔۔(۱) (ہفت روزہ ایشیا، لاہور، مؤرخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

مولانا موصوف نے یہ فقرہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے کہ "میں اس کو مضاف سے زیادہ مضاف الیہ کے حق میں سوءِ ادب سمجھتا ہوں۔"

یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا محترم کی اہلیہ محترمہ امہات المؤمنین سے بڑھ کر مہذب اور شائستہ نہیں، نہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقدس ہیں، اب اگر ان کا کوئی عقیدت مند یہ کہہ ڈالے کہ: "مولانا کی اہلیہ مولانا کے سامنے زبان درازی کرتی ہیں" تو مولانا اس فقرے میں اپنی ذلت اور ہتکِ عزت محسوس نہیں فرمائیں گے؟ جب یہ فقرہ خود مولانا کے حق میں گستاخی تصور کیا جاتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المؤمنین کے حق میں سوءِ ادب کیوں نہیں...؟

الغرض مولانا موصوف کے قلم سے انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں جو ادبی شہ پارے نکلے ہیں، وہ سوءِ ادب میں داخل ہیں یا نہیں؟ اس کا ایک معیار تو یہی ہے کہ اگر ایسے فقرے خود مولانا کے حق میں سوءِ ادب میں شمار ہوں اور ان کے عقیدت مندوں کی دل آزاری کا موجب ہو سکتے ہیں تو ان کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں بھی سوءِ ادب ہیں، اور جو لوگ نبوت و رسالت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی دل آزاری کا سبب ہیں۔

دوسرا معیار یہ ہو سکتا ہے کہ آیا اردو میں جب یہ فقرے استعمال کئے جائیں تو اہلِ زبان ان کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں؟ اگر ان دونوں معیاروں پر جانچنے کے بعد یہ طے ہو جائے کہ واقعی ان کلمات میں سوءِ ادب ہے، تو مولانا کو ان پر اصرار نہیں کرنا چاہئے، بلکہ ان سے توبہ کرنی چاہئے، کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں ادنیٰ سوءِ ادب بھی سلبِ ایمان کی علامت ہے۔

۲: انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد انسانیت کا سب سے مقدس گروہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے، خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا

---

(۱) اس کی تفصیل تحریر نمبر ۲، صفحہ ۲۹۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔

منصب تو انبیائے کرام علیہم السلام اور امت کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے، ان کے "تجدید و احیائے دین"، "خلافت و ملوکیت" اور "تفہیم القرآن" وغیرہ میں خلیفہ مظلوم سیدنا عثمان ذوالنورین، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ، حضرت معاویہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عمرو بن العاص، حضرت عقیل اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں مولانا مودودی کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے، اور جس کی صحت پر ان کو اصرار ہے، میں اسے خالص رفض و تشیع سمجھتا ہوں، اور مولانا کی ان تحریروں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ جس طرح بارگاہِ نبوت کے ادب ناآشنا ہیں، اسی طرح مقامِ صحابیت کی رفعتوں سے بھی ناآشنا ہیں، کاش! انہوں نے امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا ایک ہی فقرہ پڑھ لیا ہوتا:

"ہیچ ولی بمرتبہ صحابی نرسد، اویس قرنی با آں رفعت شان
کہ بشرف صحبت خیر البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات نرسیدہ
بمرتبہ ادنیٰ صحابی نرسد، شخصے از عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ
پرسید: أیهما أفضل، معاویة أم عمر بن عبدالعزیز؟ در جواب
فرمود: الغبار الذی دخل أنف فرس معاویة مع رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم خیر من عمر بن عبدالعزیز کذا مرة۔"

(مکتوبات، دفتر اول، مکتوب:۲۰۷)

ترجمہ:... "کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا، اویس قرنی رحمہ اللہ اپنی تمام تر بلندیٔ شان کے باوجود چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شرفِ صحبت سے مشرف نہ ہوسکے اس لئے کسی ادنیٰ صحابی کے مرتبے کو بھی نہ پہنچ سکے۔ کسی شخص نے امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ؟ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں

جو غبار داخل ہوا وہ بھی عمر بن عبدالعزیزؒ سے کئی گنا بہتر ہے۔"

یہاں یہ نکتہ عرض کردینا ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و رفاقت کا جو شرف حاصل ہوا ہے، پوری اُمت کے اعمال حسنہ مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ذرا تصور کیجئے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی دو رکعتیں، جن میں صحابہ کرامؓ کو شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، کیا پوری اُمت کی نمازیں مل کر بھی ان دو رکعتوں کے ہم وزن ہوسکتی ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو کسی صحابی نے ایک سیر جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے انہیں شرفِ قبول عطا ہوا، بعد کی اُمت اگر پہاڑ برابر سونا بھی خیرات کردے تو کیا یہ شرف اسے حاصل ہوسکتا ہے؟ باقی تمام حسنات کو اسی پر قیاس کرلیجئے۔

اس شرفِ مصاحبت سے بڑھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسہ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم و ہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جن کا نصاب تعلیم عالم بالا میں مرتب ہوا تھا، جن کی تعلیم و تربیت کی نگرانی براہ راست وحی آسمانی کررہی تھی، اور جن کا امتحان علام الغیوب نے لیا، اور جب ان کی تعلیم و تربیت کا ہر پہلو سے امتحان ہوچکا تو حق تعالیٰ شانہ نے انہیں "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کی ڈگری عطا فرماکر آنے والی پوری انسانیت کی تعلیم و تربیت اور تلقین و ارشاد کا منصب ان کو تفویض کیا، اور "کنتم خیر امة اخرجت للناس" کی سند ان کے لئے جاری فرمائی۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت ایسی ہے جن کی تعلیم و تربیت بھی وحی الٰہی کی نگرانی میں ہوئی اور ان کو سندِ فضیلت بھی خود خداوند قدوس نے عطا فرمائی۔

مولانا مودودی کے عقیدت مند یہ کہہ کر دل بہلا لیتے ہیں کہ: "مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، تاریخ کے حوالوں سے لکھا ہے، اور یہ ان کے قلم کا شاہکار ہے کہ انہوں نے منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مربوط تاریخ مرتب کرڈالی۔" میں ان کی خدمت میں باادب گزارش کروں گا کہ ان کا یہ بہلاوا بہ چند وجوہ غلط ہے۔

اول... مولانا کا یہ فنی شاہکار تاریخی صداقت ہے، نہ صحابہ کرامؓ کی زندگی کی صحیح تصویر، بلکہ یہ ایک "افسانہ" ہے جس میں مولانا کے ذہنی تصورات و نظریات نے رنگ آمیزی کی ہے۔ آج کل "افسانہ نگاری" کا ذوق عام ہے، عام طبائع تاریخی صداقتوں میں اتنی دلچسپی نہیں لیتیں جتنی کہ رنگین افسانوں میں، اس لئے مولانا کی جولانیٔ طبع نے صحابہ کرامؓ پر بھی "خلافت و ملوکیت" کے نام سے ایک افسانہ لکھ دیا، جس کا حقائق کی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ آج اگر کوئی صحابی دنیا میں موجود ہوتا تو شیخ سعدیؒ کی زبان میں مولانا کے قلم سے یہ شکایت ضرور کرتا:

خندید و گفتا آں نہ شکل من است
ولیکن قلم در کف دشمن است

اگر مولانا کو صحابہ کرامؓ کا پاس ادب ملحوظ ہوتا تو قرآن کریم کے صریح اعلان "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کے بعد وہ صحابہ کرامؓ کی بلند و بالا شخصیتوں کو افسانہ نگاری کا موضوع نہ بناتے۔

دوم... یورپ میں اسلام کی نابغہ شخصیتوں کو مسخ کرنے اور ان کی سیرت و کردار کا حلیہ بگاڑنے کا کام بڑی خوبصورتی اور فنکاری سے ہو رہا ہے، اور یہودی مستشرقین کی کھیپ کی کھیپ اس کام پر لگی ہوئی ہے، وہ بھی ٹھیک اسی طرح بزعم خود تاریخ کے منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک فرضی تصویر تیار کرتے ہیں، اور دنیا کو باور کراتے ہیں کہ وہ پوری غیر جانبداری کے ساتھ اور کسی قسم کے تعصب کی آمیزش کے بغیر تاریخی حقائق دنیا کے سامنے لا رہے ہیں، مگر اپنے اس لفظی ادعا کے برعکس وہ جس طرح مسلمہ تاریخی حقائق چھپاتے ہیں، جس طرح بالکل سیدھی بات کی اُلٹی توجیہ کرتے ہیں، جس طرح بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا کر اسے پیش کرتے ہیں، اور جس طرح اپنی بدنیتی یا خوش فہمی سے وہ اس میں رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کرتے ہیں اس سے ان کا تعصب اور اسلام سے ان کی عداوت چھپائے نہیں چھپتی۔

ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ایسا شخص جو خدا و رسول پر ایمان رکھتا ہو ٹھیک ٹھیک مستشرقین کے نقش پا کا تتبع کرے گا، لیکن بدقسمتی سے مولانا مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کو بالکل اسی رنگ و ڈھنگ سے پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ مولانا

besturdubooks.wordpress.com

تاریخی حقائق جمع کر رہے ہیں؟ یا وہ کسی جانبدار تاریخ سے لیا لے رہے ہیں؟ کیا چھوڑ رہے ہیں؟ اور کیا اپنی طرف سے اضافہ فرما رہے ہیں؟ الغرض جس طرح ہزار دل فریبیوں کے باوجود مستشرقین عداوتِ اسلام کے روگ کو چھپانے سے قاصر رہتے ہیں، اسی طرح مولانا مودودی بھی اپنے اس استشراقی شاہکار میں ہزار رکھ رکھاؤ کے باوصف عداوتِ صحابہ کو چھپا نہیں سکتے۔ اب اگر مولانا محترم یا ان کے عقیدت مندوں کی تاویلات صحیح ہیں تو مستشرقین کا کارنامہ ان سے زیادہ صحیح کہلانے کا مستحق ہے، اور اگر یہودی مستشرقین کا طرزِ عمل غلط ہے تو اسی طرزِ عمل سے مولانا مودودی کا رویہ بھی غلط ہے۔

سوم:... کہا جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ انسان ہی تھے فرشتے نہیں تھے، وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے، ان سے لغزشیں اور غلطیاں کیا بڑے بڑے گناہ ہوئے ہیں، یہ کہاں کا دین و ایمان ہے کہ ان کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔

میں پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ مولانا مودودی کو تو صحابہ کرامؓ کی غلطیاں چھانٹنے کے لئے واقدی، کلبی وغیرہ کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی ہے، لیکن خدائے علام الغیوب، صحابہ کرامؓ کے ہر ظاہر و باطن سے باخبر تھے، ان کے قلب کی ایک ایک کیفیت اور ذہن کے ایک ایک خیال سے واقف تھے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ انسان ہیں معصوم نہیں، انہیں یہ بھی علم تھا کہ آئندہ ان سے کیا کیا لغزشیں صادر ہوں گی، ان تمام امور کا علم محیط رکھنے کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے ان کو "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کا طغرائے عزت عطا فرمایا تو ان کی غلطیاں بھی

این خطا از صد صواب اولیٰ تر است

کا مصداق ہیں، اب اس کے بعد مولانا مودودی کو ان اکابر کی خردہ گیری و عیب چینی کا کیا حق پہنچتا ہے؟ کیا یہ خدا تعالیٰ سے صریح مقابلہ نہیں کہ وہ تو ان تمام لغزشوں کے باوجود صحابہ کرامؓ سے اپنی رضائے دائمی کا اعلان فرما رہے ہیں، مگر مولانا مودودی ان اکابر سے راضی ہونے کے لئے تیار نہیں...؟

دوسری گزارش میں یہ کروں گا کہ چلئے! فرض کرلیجئے کہ صحابہ کرامؓ سے غلطیاں ہوئی ہوں گی، مگر سوال یہ ہے کہ آپ چودہ سو سال بعد ان اکابر کے جرائم کی دستاویز مرتب

besturdubooks.wordpress.com

کر کے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں اضافے کے سوا اور کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟
اگر یہ اکابر دنیا میں ہوتے تب تو آپ انہیں ان کی غلطیوں کا نوٹس دے ڈالتے، مگر جو قوم تیرہ چودہ سو سال پہلے گزر چکی ہے اس کے عیوب و نقائص کو غلط سلط حوالوں سے چن چن کر جمع کرنا اور ساری خلافت کا ڈھیر قوم کے سامنے لگا دینا، اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے دل میں صحابہ کرامؓ سے جو حسنِ عقیدت ہے اسے مٹا دیا جائے اور اس کی جگہ قلوب پر صحابہؓ سے بغض و نفرت کے نقوش اُبھارے جائیں؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کس عقل و دانش اور دین و ایمان کا تقاضا ہے...؟

چہارم:... "خلافت و ملوکیت" میں مولانا مودودی نے جس نازک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، اسے ہماری عقائد و کلام کی کتابوں میں "مشاجراتِ صحابہؓ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ باب ایمان کا ایسا پل صراط ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے، اس لئے سلف صالحین نے ہمیشہ یہاں پاسِ ادب ملحوظ رکھنے اور زبان و قلم کو لگام دینے کی وصیت کی ہے، کیونکہ بعد کی نسلیں ہی نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کے زمانے کے بعض لوگ بھی اسی وادی پُرخار میں دامنِ ایمان تار تار کر چکے ہیں، اکابرِ اُمت ہمیشہ ان بدبختوں کے پھیلائے ہوئے کانٹوں کو صاف کرتے آئے ہیں، لیکن مولانا مودودی سلف صالحین کو "وکیلِ صفائی" کہہ کر دھتکار دیتے ہیں، ان کے ارشادات کو "خواہ مخواہ کی سخن سازی" اور "غیر معقول تاویلات" قرار دے کر رَدّ کرتے ہیں، اور ان تمام کانٹوں کو جن میں اُلجھ کر روافض اور خوارج نے اپنا دین و ایمان غارت کیا تھا، سمیٹ کر نئی نسل کے سامنے لا ڈالتے ہیں، انصاف فرمائیے کہ اسے اسلام کی خدمت کہا جائے یا اسے رافضیت و خارجیت میں نئی رُوح پھونکنے کی کوشش کا نام دیا جائے...؟ اور مولانا مودودی اور ان کے معتقدین اس کارنامے کے بعد کیا یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کا حشر اہلِ سنت ہی میں ہوگا، رافضیوں اور خارجیوں میں نہیں ہوگا...؟ میں ہزار بار سوچتا ہوں مگر اس معمے کو حل نہیں کر پاتا کہ مولانا موصوف نے یہ کتاب نئی نسل کی راہ نمائی کے لئے لکھی ہے یا انہیں صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لئے...؟

ترجمہ: ... سب سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ تیرہ چودہ سو سال کے واقعے کی ''تحقیقات'' کے لئے مولانا ''عدالتِ عالیہ'' قائم کرتے ہیں، جس کے صدرنشین وہ خود بنتے ہیں، اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس عدالت میں ملزم کی حیثیت سے لایا جاتا ہے، واقدی، کلبی وغیرہ سے شہادتیں لی جاتی ہیں، صدرِ عدالت خود ہی جج بھی ہے اور خود ہی وکیل استغاثہ بھی، اگر سلف صالحین، اکابر صحابہ کی صفائی میں کچھ عرض معروض کرتے ہیں تو اسے وکیل صفائی کی خواہ مخواہ سخن سازی اور غیر معقول تاویلات کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے، اس طرح یک طرفہ کارروائی کے بعد مولانا اپنی تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرتے ہیں، اور اسے ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے قوم کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔

اس امر سے قطع نظر کہ ان ''تحقیقات'' میں دیانت و امانت کے تقاضوں کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے؟ اس سے قطع نظر کہ شہادتوں کی جرح و قدح میں کہاں تک احتیاط برتی گئی ہے؟ اور اس سے بھی قطع نظر کہ فاضل جج نے خود اپنے ذہنی تصورات کو واقعات کا رنگ دینے میں کس حد تک سلامتی فکر کا مظاہرہ کیا ہے؟ مجھے باادب یہ عرض کرنا ہے کہ آیا مولانا کی اس خود ساختہ عدالت کو اس کیس کی سماعت کا حق حاصل ہے؟ کیا یہ مقدمہ جس کی تیرہ چودہ سو سال بعد مولانا تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرنے بیٹھے ہیں، ان کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے؟ کیا ان کی یہ حیثیت ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کا مقدمہ سننے بیٹھ جائیں۔؟

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کے مداحوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صحابہ کرام کے مقدمے کی سماعت ان سے اوپر کی عدالت ہی کر سکتی ہے اور وہ یا تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا خود احکم الحاکمین، ان کے سوا کسی عدالت کو یہ حق نہیں۔ امت کا کوئی فرد بھی اس کا مجاز نہیں کہ وہ مقدس ہستیوں کے اس گروہ کے معاملے میں مداخلت کرے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے باہمی معاملات میں آج کے کسی بڑے سے بڑے شخص کا منصب صفائی کرنا، اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بچہ بازار میں عدالت جا کر بیٹھ جائے اور وہاں ملک کے معاملات کے بارے میں بچے سے بات فیصلے لوگوں کو

besturdubooks.wordpress.com

سنانے لگے، ایسے موقعوں پر ہی کہا گیا ہے: "ایاز! قدر خود بشناس!"

ششم ..... یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کو حق تعالیٰ شانہ نے امت کے مرشد و مربی اور محبوب و مقتدیٰ کا منصب عطا فرمایا ہے، قرآن و حدیث میں ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے اور ان سے عقیدت و محبت رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور ان کی برائی و عیب جوئی کو ناجائز و حرام، بلکہ موجب لعنت قرار دیا گیا ہے، خود مولانا مودودی کو اعتراف ہے کہ:

"صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں، بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے، من ابغضھم فببغضی ابغضھم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی بنا پر ان سے بغض رکھا)۔" (ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۳ء)

جن لوگوں نے مولانا کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پڑھی ہے وہ شہادت دیں گے کہ اس میں صحابہ کرامؓ کو صاف صاف برا بھلا کہا گیا ہے اور صحابہ کرامؓ سے مصنف کا بغض و نفرت بالکل عیاں ہے، مثلاً "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے زیر عنوان مولانا مودودی لکھتے ہیں:

الف: "ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے گورنر، خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے، اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت

کھلا ہوا ناجائز فعل تھا۔" (خلافت و ملوکیت ص:۱۷۴)

ب:... "مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال لیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے سے تقسیم کیا جائے۔"

(حوالہ بالا)

ج:... "زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی... یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا۔" (ص:۱۷۵)

د:... "حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کردیا۔" (ایضاً)

مولانا مودودی کی ان عبارتوں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے، وہ قطعاً خلافِ واقعہ ہے اور علمائے کرام اس کی حقیقت واضح کرچکے ہیں، مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو لوگ مولانا مودودی کی بات پر ایمان لاکر مولانا کی اس افسانہ طرازی کو حقیقت سمجھیں گے وہ حضرت معاویہؓ اور اس دور کے تمام اکابر صحابہؓ و تابعینؒ سے محبت رکھیں گے یا بغض؟ ان کی اقتدا پر فخر کریں گے یا ان پر لعنت بھیجیں گے؟ اور خود مولانا موصوف نے ان عبارتوں میں حضرت معاویہؓ کو بُرا بھلا نہیں کہا تو کیا ان کی قصیدہ خوانی فرمائی ہے؟ اگر میں یہ گزارش کروں کہ خود انہی کی نقل کی ہوئی حدیث کے

مطابق "وہ فاسق تھے" نہیں، بلکہ ان کا ایمان بھی مشتبہ ہے" تو کیا یہ توقع بے جا ہوں؟ مولانا مودودی سے مجھے توقع نہیں کہ وہ اپنی غلطی پر کبھی نادم ہوں گے، مگر میں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا انجام نہایت خطرناک ہے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ شیعوں کے ایک عالم محقق حلی نے اپنی کتاب "تجرید العقائد" کے آخر میں صحابہ کرامؓ پر تبرا کیا تھا، مرنے لگا تو غلام احمد قادیانی کی طرح منہ کے راستے سے نجاست نکل رہی تھی،(۱) اس کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا: "ایں چیست؟" (یہ کیا ہے؟) کوئی خوش عقیدہ عالم وہاں موجود تھے، بولے:

"ایں ہماں ہرزہ است کہ در آخر تجرید خوردی۔"

ترجمہ:... "یہ وہی گندگی ہے جو تو نے تجرید کے آخر میں کھائی تھی۔"

حق تعالیٰ شانہ ہمیں ان اکابر کے سوءِ ادب سے محفوظ رکھے، آمین!

۳:... جب اسلام کا سب سے مقدس ترین گروہ صحابہ کرام علیہم الرضوان بھی مولانا مودودی کی تنقید سے نہ بچا ہو تو بعد میں سلف صالحین، ائمہ کرام، فقہاء، محدثین اور علماء و صوفیہ کی ان کی بارگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ موصوف نے ائمہ امت پر تنقید کرنے کو اپنے نیازمندوں کے لئے جزوِ ایمان ٹھہرا دیا۔ "دستورِ جماعتِ اسلامی" کی دفعہ ۳ میں کلمہ طیبہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو، اس کو اسی درجے پر رکھے۔" (دستورِ جماعتِ اسلامی ص:۲۴ طبع ۱۹۹۲ء)

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی کی موت وبائی ہیضے سے ہوئی، مرتے وقت ان کے دونوں راستوں سے نجاست خارج ہو رہی تھی۔

besturdubooks.wordpress.com

"ذہنی غلامی" کی اصطلاح مولانا نے "تقلید" کے معنی میں استعمال فرمائی ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کے علم و عمل اور دیانت و تقویٰ پر اس قدر وثوق و اعتماد کر لینا کہ اس کی ہر بات پر طلب دلیل کی حاجت نہ رہے۔ یہ مولانا کے نزدیک "ذہنی غلامی" ہے۔ گویا ان کی جماعت کا کوئی فرد اگر رسول خدا کے سوا کسی جماعت، گروہ یا فرد پر اعتماد کر بیٹھا، اس کے طریقے کو حق سمجھ لیا اور اس پر "تنقید" کا فریضہ ادا نہ کیا، تو مولانا کے نزدیک خدانخواستہ وہ اسلام ہی سے خارج ہے۔ مولانا کے نزدیک اسلام میں داخل ہونے کی شرط اول لیکن یہ ہے کہ ہر شخص خدا کے بتائے ہوئے معیار کامل کو سامنے رکھ کر پوری اُمت اسلامیہ پر تنقید کرے۔ پھر جب مولانا نے یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے اُمت اسلامیہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو انہیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ اُمت صدر اول سے لے کر آج تک بانجھ چلی آتی ہے، اور اس میں ایک بھی "مرد کامل" پیدا نہیں ہوا۔ اپنی مشہور کتاب "تجدید و احیائے دین" میں "خلافت راشدہ" کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:

> "خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ آپ کے بعد ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما، دو ایسے کامل "لیڈر" اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپ کے کام کو جاری رکھا، پھر زمام قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی، اور ابتداءً چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔" (ص ۳۰ طبع ششم ۱۹۶۰ء)

اس کے بعد "جاہلیت کا حملہ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> "مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا، اور دوسری طرف حضرت عثمان، جن پر اس کار عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں، اس

besturdubooks.wordpress.com

لئے ان کے زمانۂ خلافت میں جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی میں
گھس آنے کا موقع مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس
خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ ان کے بعد حضرت
علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو
جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی
قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر خلافت علیٰ منہاج
النبوۃ کا دور ختم ہو گیا، ملک عضوض نے اس کی جگہ لے لی اور اس
طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان
کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع
کر دیئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اس کے ہاتھ
میں تھی، اور اسلام زور حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے اثر و
نفوذ کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ
جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی، بلکہ "مسلمان" بن کر آئی
تھی، کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ
آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے توحید و رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر
عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا
کام کر رہی تھی۔" (تجدید و احیائے دین ص:۳۶-۳۷)

یعنی مولانا موصوف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بیس، پچیس
سال بعد کا نقشہ کھینچ رہے ہیں، جب بقول ان کے "جاہلیت" نے اسلام کا نقاب اوڑھ کر اقتدار
کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور عالم اسلام میں اسلام کے بجائے جاہلیت کا سکہ چلنے لگا
تو اسلام اور مسلمانوں پر کیا گزری؟ اس کی داستان مولانا سے یوں سنتے ہیں:

"جاہلی امارت کی سرپرستی اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر

"مسلمان" کو جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا، وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معنوی انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کردیں اور ان کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

(۱) جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا، نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا، بادشاہوں کو اللہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی، اس لئے "السلطان ظل اللہ" کا بہانہ تراش لیا گیا، اور اس بہانے سے وہی مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو اللہ کی ہوتی ہے۔

(۲) جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو......۔

(۳) جاہلیتِ راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہاد، پاک باز لوگوں پر حملہ کیا، اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کردیں جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف ادبیات و علوم کو متأثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے بہترین عناصر کو "افیون کا انجکشن" دے کر سست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں

مجموعہ اور تشتت خیالی پیدا کی، اور ساری دین داری کو چند خاص مذہبی
اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔" (تجدید و احیائے دین ص ۲۸-۳۰)

مولانا کی اس ساری داستان سرائی کو ایک بار پھر پڑھئے، اور دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے! کہ جب صحابہ و تابعین کی موجودگی میں جاہلیت نے اسلام کو پچھاڑ دیا اور اقتدار کی کنجیاں تب سے اب تک اسلام کو واپس نہیں مل سکیں تو امت مسلمہ سے زیادہ ناکام کوئی امت ہو سکتی ہے؟ آج کے یہ سب ملحد اور لادین عناصر جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، کیا یہ سب کچھ خود مولانا مودودی نہیں فرما رہے ؟

اس کے بعد مولانا "مجدد کی ضرورت" کے زیر عنوان ہمیں بتاتے ہیں کہ

"انہی تینوں اقسام کی جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا
اور پھر سے چمکا دینا، وہ کام تھا جس کے لئے دین کو مجددین کی
ضرورت پیش آئی۔" (ص ۳۰)

اور پھر صفحہ ۳۸ سے ۵۰ تک "کار تجدید" کے عنوان سے مولانا ان شعبوں کی تفصیل بتاتے ہیں جن میں تجدید کا کام ہونا چاہئے، وہ انہی کے الفاظ میں حسب ذیل نو شعبے ہیں: ۱... اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، ۲... اصلاح کی تجویز، ۳... خود اپنے حدود کا تعین، ۴... ذہنی انقلاب، ۵... عملی اصلاح کی کوشش، ۶... اجتہاد فی الدین، ۷... دفاعی جدوجہد، ۸... احیائے نظام اسلامی، ۹... عالمگیر انقلاب کی کوشش۔

ان نو شعبوں کی تشریح کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ:

"ان شعبوں پر غور نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
ابتدائی تین دفعات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لئے ناگزیر ہیں جو
تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی چھ ایسی ہیں جن کا جامع
ہونا مجدد ہونے کے لئے شرط نہیں۔ بلکہ جس نے ایک یا دو یا تین یا چار
شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جا سکتا
ہے، البتہ اس قسم کا مجدد جزوی مجدد ہوگا، کامل مجدد

besturdubooks.wordpress.com

صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے
کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کر دے۔" (ص ۵۰)

سوال یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے نرغے سے نکالنے کے لئے اس اُمت میں کوئی کامل مجدد بھی ہوا یا نہیں؟ اور کسی بندۂ خدا کو بھی "وراثتِ نبوت کا حق" ادا کرنے کی توفیق ملی یا نہیں؟ اس کا جواب مولانا مودودی نفی میں دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی کامل مجدد پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے میں یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجددِ کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو، اسی کا نام "الامام المہدی" ہوگا۔" (ص ۵۱)

یہ ہے وہ خلاصہ جو میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ مولانا مودودی کی تنقیدی نظر میں آج تک کوئی مردِ کامل اس اُمت میں پیدا نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی شخص پر اعتماد تبھی کریں گے جبکہ اسے کسی درجے میں بھی "معیاری آدمی" سمجھیں گے۔ جب مولانا کے نزدیک اُمت میں کوئی معیاری آدمی ہوا ہی نہیں، تو وہ پوری اُمت کو تنقید سے بالاتر کیوں سمجھیں گے؟ اور اس پر اعتماد کیوں کریں گے...؟

البتہ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کی ہمت لائقِ داد ہے! مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے ابتدائی دور سے لے کر اسلام پر جاہلیت کا قبضہ چلا آتا ہے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھے ہیں، عوام مشرکانہ جاہلیت کے دام میں گرفتار ہیں، علماء و مشائخ لوگوں کو "نارفیا" کے انجکشن دے رہے ہیں، اسلام جاہلیت کے چنگل میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ مگر کوئی صحابی، کوئی تابعی، کوئی امام، کوئی محدث، کوئی مجدد ایسا نہیں اُٹھتا جو آگے بڑھ کر جاہلیت سے اقتدار

نسلوں پیچھے سے لے! گویا چودہ سو سال کی پوری امت وراثتِ نبوت کا حق ادا کرنے سے محروم ہے۔ وہ یا تو خود جاہلیت کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتی ہے یا جاہلیت کے فریب اور دھوکے میں مبتلا ہے۔ اس امت میں مجدد بھی آتے ہیں تو بس جزوی قسم کے کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ ان میں کرنے کا اصل کام ایک بھی نہیں کرتا۔ بلکہ مولانا کے بقول پوری امت "وراثتِ نبوت کا حق ادا کرنے" سے محروم رہتی ہے۔ بتائیے! اس سے بڑھ کر اس امت کے اپاہج اور بانجھ ہونے کی کوئی اور تعبیر ہو سکتی ہے...؟ مولانا نے اس امت کی جو تصویر کھینچی ہے، میں دوسروں کی بات نہیں کرتا، کم از کم اپنے اسلاف کے بارے میں مولانا کا مرتب کردہ نقشہ دیکھ کر شرم کے مارے سر جھک جاتا ہے۔ میں مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کی حوصلہ مندی کی داد دیتا ہوں کہ ان ساری باتوں کے باوجود اس اپاہج امت میں اپنے آپ کو شمار کرتے ہوئے انہیں ذرا جھجک اور شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ..

مولانا نے امت مرحومہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان پر مفصل بحث کا موقع نہیں، مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ اگر اس کہانی کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ امت "خیر امت" نہیں رہتی بلکہ... نعوذ باللہ... شر امت بن جاتی ہے۔ اس لئے مولانا کی یہ ساری کہانی ایک تخیلاتی کہانی ہے، جو رافضی طرز فکر سے مستعار لی گئی ہے، اسلاف امت کو بدنام کرنے اور نئی نسل کا ذہنی رابطہ ان سے کاٹنے کے سوا اس کا کوئی مقصد اور کوئی نتیجہ نہیں۔ جو شخص مولانا مودودی کے تصورات و افکار پر ایمان بالغیب رکھتا ہو وہ اسے صحیح سمجھتا ہے تو سمجھا کرے، لیکن جو شخص اسلام کی ابدیت، قرآن و سنت کی نصوص قطعیہ اور نبوت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو، وہ ایک لمحے کے لئے بھی مودودی کی اس ژولیدہ فکری پر ایمان نہیں لا سکتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ گزشتہ صدیوں کی پوری امت فرشتہ صفت رہی اور کسی فرد سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، نہ میں کسی جابر بادشاہوں، کج رو امیروں، کج طبیعت علمائے سوء اور نادان صوفیوں کی وکالت کرنا چاہتا ہوں، میں جس چیز کے خلاف احتجاج کر رہا ہوں وہ مولانا کی یہ منطق ہے کہ یہ امت مجموعی طور پر اسلام کے بجائے جاہلیت کی نمائندہ بن گئی تھی۔

سے ٹکراتا ہے، بدقسمتی سے یہی خدمت مولانا مودودی کے تیز رو قلم نے انجام دی ہے۔

۱۳: پوری امت کو تاریخ اسلام کا مردہ باور کرانے کے بعد امت کے مجدد قائدین کے کارناموں میں کیڑے نکالنا بھی ضروری تھا تاکہ نئی نسل کے دل و دماغ میں کسی بزرگ کی عقیدت و احترام کا داغ دھبہ باقی نہ رہے اور بجز مولانا کا کوئی نیازمند اسلاف امت میں سے کسی کی "ذہنی غلامی" کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ مولانا نے یہ فریضہ بھی بڑی بلند آہنگی سے انجام دیا۔ امت اسلامیہ میں چند ہی افراد ایسے تھے جن کا تجدیدی کارنامہ مولانا کے نزدیک لائق ذکر تھا، یعنی خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز، ائمہ اربعہ (امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل)، امام غزالی، امام ابن تیمیہ، امام ربانی مجدد الف ثانی، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی، امیر المومنین سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید قدس اللہ اسرارہم۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں تو مولانا کا ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ "قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے" ائمہ اربعہ کا کارنامہ ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ انھوں نے اصول دین سے اسلام کے قوانین کو تفصیلی شکل میں مرتب کر دیا لیکن مولانا کے بقول: انبیاء علیہم السلام کے مشن کے لئے انھوں نے کوئی کام نہیں کیا، گویا تجدید کرنے کا جو اصلی کام تھا اس کو انھوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے بارے میں ارشاد ہے کہ

> "امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے۔ دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبے کی وجہ سے تھے، اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے۔"
>
> (تجدید و احیائے دین ص ۵۸)

۔ امام غزالی رحمہ اللہ کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا نام آتا ہے۔ ان کے تجدیدی کام کا اختتام یہاں ہوتا ہے:

"تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضے سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آجاتیں۔" (ص ۸۶)

ابن تیمیہؒ کے بعد مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید رحمہم اللہ کے تجدیدی کارناموں کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ صاحبؒ اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے نفس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے۔ اور اس کی نوعیت احسان سے کچھ مختلف نہیں، لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقے سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔۔۔۔" (ص ۱۳۰)

مولانا کو تصوف کے نام ہی کی اصطلاحات اور اس کے طور طریقوں سے چڑ ہے، وہ ان اکابر کے تصوف کو "غیر اسلامی" کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتے مگر ان کے تصوف کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اس وقت ممنوع

besturdubooks.wordpress.com

ہو جاتی ہے جب وہ مریض کے لئے نقصان دہ ہو، اسی طرح یہ قالب بھی
مباح ہونے کے باوجود اسی بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ
اس کے لباس میں مسلمانوں کو "افیون کا چسکا" لگایا گیا ہے، اور اس کے
قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی "چنیا بیگم" یاد آ جاتی ہے
جو صدیوں تک ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہے۔" (ص:۱۳۲)

"مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد ناواقف
تھے، نہ شاہ صاحب، دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے، مگر
غالباً اس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ
دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض
میں مہلک ثابت ہو چکی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا
حلقہ پھر سے پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا۔" (ص:۱۳۳)

"اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت
کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی جو ابن تیمیہؒ نے کی تھی،
لیکن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود تھا، جس کا
کچھ اثر شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریروں میں بھی باقی رہا، اور پیری مریدی
کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا، اس لئے "مرض
صوفیت" کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی۔" (ص:۱۳۲)

یہ اُمت محمدیہ کے وہ اکابر ہیں جن کو پوری اُمت کے چیدہ اور منتخب افراد کی
حیثیت میں مولانا نے پیش کیا ہے، ان کے بارے میں مولانا نے جو تنقید کی ہے، کوئی احمق
ہی ہوگا جو مولانا کی تنقید کو حق بجانب سمجھنے کے بعد ان اکابر پر اعتماد کرے اور ان کی روش کو
لائق تقلید سمجھے۔ مولانا نے "تجدید" کے جن نو شعبوں کا تذکرہ کیا ہے، اسے ایک بار پھر
پلٹ کر دیکھ لیجئے، ان میں سب سے پہلے نمبر پر مولانا نے "اپنے ماحول کی صحیح تشخیص" کو ذکر
کیا تھا، اور حافظ ابن تیمیہؒ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد امام غزالی سے شاہ اسماعیل شہیدؒ تک تمام

besturdubooks.wordpress.com

اکابر کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے مرض کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا، بلکہ انہیں پھر "مارفیا کے انجکشن" دیتے رہے۔ ان دونوں باتوں کو ایک ساتھ ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات مجدد تو کیا ہوتے اس کی پہلی شرط کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھے، کیونکہ یہ تمام اکابر خود صوفی تھے، اور مولانا کے نزدیک "صوفیت" ہی مسلمانوں کی اصل بیماری ہے۔ گویا یہ حضرات تو خود ہی صوفیت کے مریض تھے اور "چنیا بیگم" سے شغل فرماتے تھے، وہ اُمت کی مسیحائی کیا کرتے! جب اس اُمت کے ان چیدہ و برگزیدہ افراد کا یہ حال ہے جنہیں دُنیا مجددِ اسلام مانتی ہے اور جن کی عظمت کے سامنے خود مولانا کے قلم کا سر بھی خم ہے، تو اُمت کے باقی علماء و صلحاء کا کیا حال ہوگا...؟ اس کا اندازہ مولانا مودودی کے مقلدِ نظر سے خود ہی کر لیجئے:

"قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا"

۵:... جب پوری اُمت کے اکابر مولانا مودودی اور ان کے نیازمندوں کے اعتماد و احترام سے محروم ہوئے تو ان کے ذریعے اور واسطے سے جو اسلامی علوم ہم تک پہنچے ان پر اعتماد کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ مولانا نے علومِ اسلامی میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا، اپنے نیازمندوں کے ذہن میں یہ بات خوب اچھی طرح راسخ کر دی کہ تمام اسلامی علوم میں سے اجتہادی ضرورت ہے، علمِ تفسیر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے، جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو، وہ اپنے لیکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا، پھر بی اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے اور اسلام کی رُوح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔" (تنقیحات ص:۱۸۳ طبع چہارم)

علمِ حدیث کے بارے میں تنقیحات میں صفحہ:۲۸۷ سے صفحہ:۲۹۸ تک "مسلک

اعتدال" کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون ہے، اس میں موصوف نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی حدیث کا "صحیح" ہونا حضرات محدثین کی تصریح پر موقوف نہیں، بلکہ دراصل مزاج شناسئ رسول پر موقوف ہے۔ مشہور منکر حدیث مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ حدیث کے بارے میں میری رائے بھی اس سے زیادہ سخت نہیں جو مولانا نے ظاہر فرمائی ہے۔ مولانا کی رائے کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مُسلّم، یہ بھی مُسلّم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے، وہ صدرِ اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے، کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے؟ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے، انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے، پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟" (تفہیمات ص:۲۹۲ طبع چہارم)

چونکہ مولانا کو صحابہ کرامؓ سے خاص "عقیدت" ہے اس لئے وہ صحابہ کرامؓ پر جرح کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیتے ہیں، احادیث کا مدار چونکہ راویوں پر ہے اور حدیث کے سب سے پہلے راوی چونکہ صحابہ کرامؓ تھے اس لئے حدیث کے سلسلۂ سند کو مشکوک کرنے کے لئے دیگر راویانِ حدیث کے علاوہ خود صحابہ کرامؓ پر خاک اڑانا ضروری تھا، چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

"اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظے اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو ان (راویوں) کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔" (تفہیمات ص:۲۹۳،۲۹۲)

besturdubooks.wordpress.com

اسی ضمن میں آگے لکھتے ہیں:

"ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔" (تفہیمات۔ ص ۲۹۴)

چونکہ مولانا کے نزدیک علم حدیث لائق اعتبار نہیں، جب تک کہ وہ ان کی مزاج شناسی رسول پر پوری نہ اترے، اس لئے وہ صحیح، مستند اور پوری امت کی مسلّمہ احادیث تک کو بلا تکلف ٹھکرا دیتے ہیں، اس کی متعدد مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو قصداً نظر انداز کرتا ہوں۔

علم تفسیر وحدیث کے بعد علوم اسلامیہ میں سب سے اہم اور عظیم الشان علم فقہ ہے، اس سے تو مولانا کو اس حد تک نفرت ہے کہ بعض اوقات وہ اس پر دوزخ کی وعید یں تک سنا دیتے ہیں، "حقوق الزوجین" میں ایک بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنا ہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم وعقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو یسر بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عسر بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا تم پر کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟"(۱)

ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا، تم سے کس

(۱) گویا مولانا نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہے کہ امت اسلامیہ کے سلف صالحین قرآن وحدیث کی پیروی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے فتوے قرآن وحدیث کے خلاف ہوتے تھے، استغفر اللہ!

نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ، اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی
کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس بات پر اس کے جواب میں اُمید نہیں کہ کسی
عالم دین کو کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں
میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہلا کو جواب دہی کرنے کا یہ موقع ضرور مل
جائے گا کہ[1]

رَبَّنَا اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۝
رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۔"

([illegible] ص: ۹۸)

مولانا کی یہ پوری عبارت اسلافِ اُمت اور فقہائے اُمت کے بارے میں ان
کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہے، اس کے ایک ایک لفظ سے بغض و نفرت کی وہ کیفیت ٹپک رہی
ہے، جو کسی مسلمان کو ادنیٰ مسلمان سے نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ اسلافِ اُمت سے؟ قرآن
کریم کی جو دو آیتیں مولانا نے اس مقام پر لکھی ہیں[2] وہ کفار کے بارے میں ہیں کہ وہ
قیامت کے دن خدا کے حضور یہ کہیں گے کہ: "یا اللہ! ہم کو انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر لبیک
کہنے سے ہمارے سرداروں اور بڑوں نے روکا تھا، ہم ان کے زیر اثر تھے، اس لئے اصل
قصور ان کا ہے، انہیں دوہرا عذاب دیجئے اور ان کو سخت لعنت کا مورد بنا دیجئے۔"

اکابرِ اُمت کے بارے میں، میں مولانا کی یہ تحریر پڑھتا ہوں تو مجھے یہ فیصلہ کرنا
مشکل ہو جاتا ہے کہ مولانا یہ عبارت لکھتے وقت غنودگی کی حالت میں تھے، یا وہ خارجیوں کی
طرح اسلافِ اُمت کو واقعتاً خارج از اسلام ہی سمجھتے ہیں؟ کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیری
کے مصنفین تو (اپنی جلالتِ قدر کے باوجود) محض ناقل ہیں، ان کا "جرم" تو بس اتنا ہے کہ

---

(۱) ان دونوں آیتوں کا ترجمہ مولانا مودودی نے "تفہیم القرآن" میں یہ کیا ہے: "اے رب ہمارے، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا، اے رب! ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔" (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۲۳ طبع [illegible] ۱۹۷۶ء)

(۲) نئے ایڈیشن میں یہ آیتیں حذف کر دی گئی ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com

انہوں نے یہ مسائل اپنی اپنی کتابوں میں نقل کر دیئے ہیں، ورنہ یہ مسائل خود ان کے نہیں، بلکہ ائمہ اجتہاد (امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد رحمہم اللہ) کے ہیں، جو انہوں نے قرآن و سنت سے نکالے ہیں۔ کیا مولانا کے نزدیک یہی "اکابر" "کافروں کے سردار" ہیں جن کو زہر اور عذاب دینے اور ان پر لعنت کرنے کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے...؟

صد حیف! کہ آج کا ایک لکھا پڑھا آدمی، جو بدقسمتی سے منصب اجتہاد کی بلندیوں سے ناآشنا ہے، اور جس کے لئے ائمہ سلف کی عبارت کا صحیح سمجھنا اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرنا بھی مشکل ہے، وہ امت کے ائمہ اجتہاد کو "کافروں کے سرداروں" میں شامل کر دیتا ہے، کیوں...؟ محض اس لئے کہ اسے اپنی رائے کی تائید میں ائمہ اجتہاد کا کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ انصاف کیجئے! کیا عقل و دانش کی رو سے صرف اتنی بات اس بات کا جواز پیدا کر دیتی ہے کہ اکابر امت کو اتنی بڑی گالی دے ڈالی جائے...؟

میں قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اس علم نما جہل کے دور میں دین پر ثابت قدم رہنے کے لئے اسلاف امت اور ائمہ مجتہدین کی انگلی پکڑ کر چلنا لازم ہے، یہ سہارا نہ ہو تو آج کا علم آدمی کے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے کافی نہیں، کیونکہ اگر اسلاف امت پر اعتماد نہ کیا جائے تو شیطان بہت جلد آدمی کے نفس امارہ کو علم کے ٹٹو پر سوار کر کے ہوائی و ہوس کی وادیوں میں بھٹکا دیتا ہے، اور کسی کو پرویز، کسی کو چکڑالوی اور کسی کو غلام احمد قادیانی بنا دیتا ہے، لیکن صد حیف! کہ مولانا مودودی، اسلاف امت کی اتباع کو... جو حرز ایمان ہے... بدترین سے بدترین گناہ ٹھہراتے ہیں، وہ "ذہنی غلامی" کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

> "میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے، مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک دبستان کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے، اور تقلید کی قسم کا جمود بالکل دوسری چیز، اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔" (رسائل و مسائل ج:۱ ص:۲۴۴ طبع سوم ۱۹۵۷ء)

مولانا کی یہ رائے بھی خود رائی ہے، اور اس خود رائی کا اصل منشا یہ غلطی ہے کہ

مولانا ہر حرف خواں کو صاحب علم سمجھتے ہیں اور ہر صاحب فکر کو مجتہد کا منصب تفویض کرتے ہیں، مولانا کی یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مولانا نے اگر ذرا بھی غور و تامل سے کام لیا ہوتا تو انہیں نظر آتا کہ اجتہاد کا مقام بہت بلند ہے، یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی کے بعد مجدد الف ثانی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہما اللہ تک پوری امت تقلید پر متفق چلی آتی ہے، کیا یہ سارے اکابر مولانا کے نزدیک "صاحب علم آدمی" نہیں تھے؟ اور کیا وہ ترک اجتہاد کی تقلید کر کے مولانا کے بقول "ناجائز" بلکہ اس سے بھی شدید تر چیز" کے مرتکب تھے...؟

اصل بات وہی ہے جس کو میں عرض کرتا آرہا ہوں کہ مولانا کو صحابہ کرامؓ سے لے کر بعد کی صدیوں تک کے اکابر امت میں سے کسی پر اعتماد نہیں، اس لئے ان کے واسطے سے جو علوم نبوت ہم تک پہنچے ہیں، مولانا ان پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔

علم فقہ کے بعد دین کا ایک اہم ترین شعبہ، جس کو پورے دین کی روح کہنا بے جا نہ ہوگا، علم تصوف ہے، جس کی حدیث جبرئیل میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض نبوت بیان کئے گئے ہیں، ۱:... آیات کی تلاوت، ۲:... کتاب و حکمت کی تعلیم، ۳:... تزکیہ۔ یہ تینوں فرائض اپنی جگہ اہم ترین مقاصد ہیں، مگر ان میں بھی الاہم فالاہم کی ترتیب ہے، چنانچہ تلاوت آیات تمہید ہے تعلیم کتاب و حکمت کی، اور تعلیم کتاب و حکمت تمہید ہے تزکیہ کی۔ گویا نبوت کا کام تلاوت آیات سے شروع اور تزکیہ پر ختم ہوتا ہے، اس لئے مقصد نبوت میں سب سے بالا، سب سے عالی، سب سے اہم اور غایت الغایات مقصد تزکیہ ہے، جسے دوسرے الفاظ میں تعمیر سیرت یا انسان سازی کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ تلاوت آیات بھی ایک اہم مقصد ہے، کوئی شک نہیں کہ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی بہت بڑا عالیشان منصب ہے، لیکن یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ اہم مقصد ہونے کے باوجود تزکیہ کے لئے تمہید اور مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ قرآن کریم میں ان مسلسل فرائض نبوت کا ذکر کرتے ہوئے تلاوت آیات کو ہر جگہ مقدم رکھا گیا ہے، جبکہ تزکیہ کو ایک جگہ تعلیم کتاب و حکمت سے مؤخر کیا ہے، اس کے علاوہ ہر جگہ اسے مقدم کیا گیا ہے، گویا اشارہ ہے کہ تلاوت آیات کے بعد نبوت کے کام کا تصوری

نہیں کیا جا سکتا، اور یہ کہ علوم نبوت کا اولین وہ ثمرہ اور منتہا و غایت تزکیہ ہے، واللہ اعلم!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بیک وقت ان تمام فرائض کی متکفل تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو خود قرآن کریم کے الفاظ بھی پڑھاتے تھے، اس کے مفہوم و معانی اور احکام و مسائل کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان کا تزکیہ اور اصلاح و تربیت بھی فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب یہ وراثت نبوت امت کے سپرد ہوئی تو ان تینوں شعبوں پر الگ الگ کام ہونے لگا، اگرچہ اکابر امت میں بہت سی ہستیاں ایسی بھی ہوئیں جو بیک وقت تینوں کی جامع تھیں، مگر عام طور پر تلاوت آیات کا شعبہ ایک مستقل جماعت نے سنبھالا، تعلیم کتاب و حکمت کے مختلف النوع شعبوں کے لئے الگ رجال کار پیدا ہوئے، اور ایک جماعت اصلاح و تربیت اور تزکیۂ نفوس کی خدمت میں لگ گئی، جن اکابر امت نے اپنے آپ کو اس تیسرے شعبے کے لئے وقف کر دیا، وہ صوفیائے کرام اور پیران طریقت کے نام سے معروف ہوئے اور ان کے شعبے کا نام "سلوک و تصوف" ٹھہرا۔

اس مختصری وضاحت سے معلوم ہوا ہوگا کہ تصوف، شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) سے کوئی الگ چیز نہیں، اور نہ صوفیائے کرام کسی اور جہان کی مخلوق ہیں، جن کے نام سے بدکا جائے، بلکہ تصوف وراثت نبوت کا ایک مستقل شعبہ اور وظائف نبوت میں سے ایک مستقل وظیفہ ہے، اور صوفیائے کرام اس وراثت نبوت کے امین اور اس عظیم الشان شعبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں، اور یہ شعبہ اس قدر اہم اور نازک ہے کہ نہ اس کے بغیر مقاصد نبوت کی تکمیل ہوتی ہے اور نہ امت ہی اپنے اس فریضے سے عہدہ برآ ہوتی ہے جو اس کے ذمے عائد کیا گیا ہے۔

حضرات صوفیائے کرام پوری امت کی جانب سے تشکر، امتنان اور جزائے خیر کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نازک ترین فریضے کو سنبھالا اور نہایت خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ افراد امت کی اصلاح و تربیت، تزکیۂ نفوس اور انسان سازی کا کام کیا، اگر یہ نہ ہوتے تو یہ امت وراثت نبوت کے اس شعبے سے محروم، عالم نما جاہلوں کی بھیڑ ہوتی...!

قرآن و سنت کے ماننے سے ان میں سے کسی کو انکار نہیں، بحث یہ ہے کہ قرآن و سنت کے نام سے ہمارے سامنے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ اس کے جانچنے کا معیار ہمارے پاس کیا ہے؟ ہم کس کسوٹی پر پرکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کے نظریات صحیح ہیں اور مسٹر پرویز اور قادیانی امت کے نظریات غلط ہیں...؟ یہ کسوٹی اور معیار اسلافِ امت کا فہم ہے، یعنی قرآن و سنت کا جو مفہوم سلف صالحین اور اکابر امت نے سمجھا ہے وہ صحیح ہے، اور جو اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ اس کے برعکس قادیانی، پرویز اور خود مولانا مودودی اس معیار کے قائل نہیں، وہ اس پیمانے کو توڑ دینا چاہتے ہیں، اور دین فہمی میں حال یا ماضی کے اشخاص کے زیر بارِ احسان نہیں رہنا چاہتے، بلکہ براہ راست قرآن و سنت سے انہیں جو کچھ سمجھ آتا ہے اسے "دین" سمجھنے پر بضد ہیں، کتاب و سنت سے براہ راست جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے وہ ان کے نزدیک حق ہے، اور جو اس کے خلاف ہو وہ باطل ہے۔ گویا حق و باطل کا اصل معیار قرآن و سنت نہ ہوا، بلکہ قرآن و سنت کا وہ فہم ہوا جس کا ہر ایک کو دعویٰ ہے۔

یہ ہے وہ اصل نکتہ جس پر مولانا مودودی سے مجھے اختلاف ہے، میرے نزدیک "معیارِ حق" قرآن و سنت کا وہ فہم ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے سے آج تک نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آتا ہے، اور مولانا مودودی کے نزدیک حال یا ماضی کے اشخاص کو درمیان میں واسطہ بنانا ہی غلط ہے، اس لئے ان کے نزدیک "معیارِ حق" خود ان کا ذاتی فہم ہے جو براہ راست انہیں قرآن و سنت میں حاصل ہے۔

۲:... سلف صالحین کے بجائے خود اپنی رائے اور ذاتی علم و فہم پر اعتماد کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ سلف صالحین کے نزدیک دین کا جو تصور تھا، مولانا کا دینی تصور اس سے مختلف ہو جاتا، سلف صالحین قرآن کریم کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے مولانا کا زاویۂ نظر اس سے الگ ہوتا، اکابر کی نظر میں دین کا جو نقشہ تھا اور جو ان کا معیار تھا، مولانا کے ذہن میں دین کا خاکہ اس سے جدا ہوتا، ایسا ہونا ایک ناگزیر امر تھا، اور یہی ہوا...!

مولانا مودودی کے نزدیک دینِ اسلام ایک سیاسی تحریک کا نام ہے، جو زمین پر خدا تعالیٰ کا اقتدارِ اعلیٰ قائم کرنے کے لئے برپا کی گئی، مولانا لکھتے ہیں:

"اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظم مملکت کے نتائج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔"

"مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی توجہ نہ کی[1] بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک کی بندگی قبول کرو۔" (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ ص ۲۳،۲۲)

"اس دوران میں تحریک کے "لیڈر" نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لئے یہ تحریک اٹھی تھی پورا پورا مظاہرہ کیا ہے۔" (ایضاً ص ۳۴،۳۳)

اسلام کو ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے پیش کرنا اور انبیائے کرام علیہم السلام کو اس تحریک کے "لیڈر" قرار دینا دین کا وہ تصور ہے جس سے اس کی روح مسخ ہو کر رہ جاتی ہے، اور اس کا پورا انتظام پہیلی کا چکر بن جاتا ہے۔ مثلاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد گرامی ہے، جس کو ہر عام و خاص جانتا ہے کہ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: ۱:... کلمہ شہادت کا اقرار، ۲:... نماز قائم کرنا، ۳:... زکوٰۃ دینا، ۴:... بیت اللہ کا حج کرنا، ۵:... رمضان کے روزے رکھنا۔ اسلام کے یہ پانچ بنیادی ارکان خود مقصود بالذات ہیں، اور دین کا سارا انتظام انہی پانچ کے گرد گھومتا ہے، حتیٰ کہ جہاد ہے تو ان پانچ کے لئے، ہجرت ہے تو

(۱) اسی فلسفے کی روشنی میں مودودی صاحب انگریز کے خلاف آزادی کی تحریک میں حصہ نہیں لیتے تھے، بلکہ حصہ لینے والوں کو غلط سمجھتے تھے۔

نتیجے کی خاطر، وہ سیاست و حکومت ہے تو ان پانچ ارکان کے لئے۔ دین کے باقی تمام اعمال و اخلاق گویا انہی پانچ سے نکلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو عظمت ان ارکان کو حاصل ہے وہ کسی اور عمل کی نہیں، لیکن مولانا کے دینی خاکے میں اصل الاصول زمین پر اسلام کی سیاست و حکمرانی قائم کرنا ہے، اور دین کا سارا نظام، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت حتیٰ کہ یہ ارکان خمسہ بھی اسی محور کے گرد گھومتے ہیں، مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے کہ پورا دین خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ایک سیاسی نظام ہے جس کا مقصد حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے، یہ دین کی روح ہے، اور باقی سب اس کے مختلف مظاہر یا اس کی تربیت ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے، جس میں ادھر ادھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے، جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے، اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے، انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں، ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے، ان اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنا اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے، اس لئے آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں،

"کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح تک نہیں پا سکتے۔"

(اسلامی ریاست ص ۳۰، ۳۱ طبع اول ۱۹۶۲ء)

دین کی اس جڑ اور روح کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا ہے اس کا مرکز و محور، اس کی روح اور اس کا جوہری عقیدہ ہے، اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے، اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کرلئے جائیں، کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں، وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں، یہ حق بصرف اللہ کو ہے۔" (ایضاً ص ۳۳)

مولانا کے نزدیک سیاسی اقتدار کو قائم کرنا ہی اصل عبادت ہے، اور نماز، روزہ وغیرہ عبادات کی حیثیت محض فوجی مشقوں کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یہ ہے اس عبادت کی حقیقت جس کے متعلق لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض نماز، روزہ اور تسبیح و تہلیل کا نام ہے، اور دنیا کے معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں، حالانکہ دراصل صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اور ذکر و تسبیح انسان کو اس بڑی عبادت کے لئے مستعد کرنے والی تمرینات ہیں۔" (تفہیمات ص ۶۹ طبع چہارم)

یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ دین اسلام کے مختلف شعبے ہیں جن کو عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، معاملات اور سیاست کے بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، اس لئے سیاست بھی بلاشبہ دین کا ایک حصہ ہے، شریعت نے اس کے احکام و قوانین بھی دیئے ہیں، مگر پورے دین کو ایک سیاسی تحریک بنا دینا اور اس کے دوسرے شعبوں کو اسی محور پر گھمانے کی کوشش کرنا، اور عقائد و عبادات تک کو بھی سیاست کے تابع کی حیثیت

besturdubooks.wordpress.com

دے ڈالی اتنی خطرناک غلطی ہے جسے میں نرم سے نرم الفاظ میں "فکری کج روی" سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوں۔ مولانا کی فکری کج روی ہی کا نتیجہ ہے کہ جن عبادات اور جن اخلاق کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ اہمیت دی تھی، جن کے بے شمار فضائل بیان فرمائے تھے اور جن پر جنت کی بشارتیں سنائی تھیں، وہ مولانا کی نظر میں نہ صرف ایک ثانوی مقصد بن کر رہ جاتے ہیں، بلکہ مولانا ان عبادات کا اس طرح تمسخر اڑاتے ہیں کہ روحِ ایمان کانپ جاتی ہے، ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر پڑھئے...!

"خواص نے اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کیا، وہ تسبیح و مصلی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے، خدا کے بندے گمراہی میں مبتلا ہیں، دنیا میں ظلم پھیل رہا ہے، حق کی روشنی پر باطل کی ظلمت چھائی جا رہی ہے، خدا کی زمین پر ظالموں اور باغیوں کا قبضہ ہو رہا ہے، الٰہی قوانین کے بجائے شیطانی قوانین کی بندگی خدا کے بندوں سے کرائی جا رہی ہے، مگر یہ ہیں کہ نفل پر نفل پڑھ رہے ہیں، تسبیح کے دانوں کو گردش دے رہے ہیں، ہوحق کے نعرے لگا رہے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں محض ثوابِ تلاوت کی خاطر، حدیث پڑھتے ہیں مگر صرف تبرکاً، سیرتِ پاک اور اسوۂ صحابہؓ پر وعظ فرماتے ہیں مگر قصہ گوئی کا لطف اٹھانے کے سوا کچھ مقصود نہیں، دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق نہ ان کو قرآن میں ملتا ہے، نہ حدیث میں، نہ سیرتِ پاک میں، نہ اسوۂ صحابہ میں، کیا یہ عبادت ہے؟" (تفہیمات ص ۹۵، طبع چہارم ۱۹۶۴ء)

میں یہاں اس پر بحث نہیں کرتا کہ علمائے امت نے کب دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کے فریضے سے کوتاہی کی ہے؟ میں اس بحث کو بھی چھوڑتا ہوں کہ مولانا محترم اور ان کے نیاز مندوں نے "آج تک غلط سلط لٹریچر پھیلانے اور قوم کے نوجوانوں کو چند نعروں کے سلوگن دینے کے سوا کون سا تیر مارا ہے جس سے

"خواص" محروم رہے ہیں؟ میں اس بحث سے بھی قطع نظر کرتا ہوں کہ جب علمائے اُمت انگریزی طاغوت کے خلاف سینہ سپر ہو کر مصروفِ جہاد تھے اور قید و بند اور دار و رسن کی تاریخ خاص و قرطاس سے نہیں بلکہ جہدِ عمل سے لکھ رہے تھے، جب مولانا اور ان کے رفقاء "حکومتِ الٰہیہ" کے خلائی سفر پر تھے اور ان کو ایک دن کے لئے بھی طاغوت کے خلاف میدانِ جہاد میں آنے کی توفیق نہیں ہوئی، بلکہ ان مجاہدین کے خلاف فتوے صادر فرماتے رہے۔ میں ان ساری باتوں کو یہاں چھوڑتا ہوں۔ میں ان سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تقسیمِ کار کے طور پر اللہ کے کچھ بندے ذکر و تسبیح کی مشق کرانے میں لگے ہوئے ہوں، کچھ قرآن کریم کی تلاوت و تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہوں، کچھ دینی علوم کے تحفظ کا فریضہ بجا لا رہے ہوں، کچھ بقول آپ کے تسبیح و مصلّے لے کر حجروں میں بیٹھ گئے ہوں اور نفل پر نفل پڑھ کر اُمتِ محمدیہ کی دُعاؤں سے مدد کر رہے ہوں، کیا آپ کے سیاسی اسلام میں یہ سب اسی لئے گردن زدنی ہیں کہ وہ باہر سڑکوں پر نکل کر "اسلامی نظام، اسلامی نظام" کے نعرے کیوں نہیں لگاتے؟ میں باادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ ان کی کس بات کا مذاق اُڑا رہے ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک تسبیح و مصلّی، نفل پر نفل، تلاوتِ قرآن، حدیثِ پاک کا درس و تدریس، سیرتِ پاک اور اُسوۂ صحابہ کا وعظ یہ ساری چیزیں ایسی بے قیمت ہیں کہ آپ ان کا مذاق اُڑانے لگیں...؟

کیا آپ نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" پڑھنے پر کبھی کسی کا مذاق اُڑایا ہے؟ کیا تلاوتِ قرآن کی اہمیت آپ کے رسالے کی تلاوت جتنی بھی نہیں؟ اسلامی عبادات کا مذاق اُڑانے کے بارے میں فقہائے اُمت کی تصریحات واضح ہیں، اور یہ حرکت اسی شخص سے صادر ہو سکتی ہے جس کا دل ایمان کے نور اور عبادت کی عظمت سے خالی ہو۔ لیکن مولانا کے نزدیک اسلام ایک سیاسی تحریک کا نام ہے (لا دین الا سیاسۃ) اس لئے وہ کسی بڑی سے بڑی عبادت کو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دیتے جب تک کہ وہ سیاسی تحریک کے لئے مفید نہ ہو، اس لئے وہ بات بات پر عبادات کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ "تجدید و احیائے دین" میں امام مہدیؑ کے بارے میں فرماتے ہیں:

besturdubooks.wordpress.com

"مسلمانوں میں جو لوگ "الامام المہدی" کے قائل ہیں، وہ بھی ان متجددین سے جو اس کے قائل نہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے، تسبیح ہاتھ میں لئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے، آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے، علماء اور مشائخ کتابیں لئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کرکے انہیں شناخت کر لیں گے۔ پھر بیعت ہوگی اور اعلان جہاد کر دیا جائے گا۔ سجے سجائے درویش اور پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لئے برائے نام چلانی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہوگا، پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے، جس کافر پر نظر ڈال دیں گے، تڑپ کر بیہوش ہو جائے گا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔" (ص ۵۵ طبع ششم مارچ ۱۹۵۵ء)

میں کسی طرح یقین نہیں کر پاتا کہ ایسی سوقیانہ اندازی کسی عالم دین کے قلم سے بھی نکل سکتی ہے مگر مولانا کو اہل اللہ کی شکل و صورت سے جو نفرت ہے اور ان کے اعمال و اشغال سے جو بغض و عداوت ہے اس نے انہیں ایسے غیر سنجیدہ مذاق پر مجبور کر دیا ہے۔ کس احمق نے ان سے کہا ہے کہ: "اصل میں سارا کام برکت اور تصرف سے ہوگا"؟ لیکن کیا مولانا یہ کہہ سکتے ہیں کہ سارا کام بغیر برکت اور تصرف کے ہو جائے گا؟

جس طرح انہوں نے "الامام المہدی" کی وضع قطع اور ان کی برکت و تصرف کا مذاق اڑایا ہے کیا یہی طرز فکر کوئی شخص... نعوذ باللہ... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کرے اور اسی طرح... معاذ اللہ... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی برکت وتصرف کا مذاق اڑانے لگے، تو مودودی صاحب انہیں کیا جواب دیں گے؟ کیا مودودی صاحب انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات کے بھی منکر ہیں...؟
جنگ بدر کا جو میدان لشکرِ جرار کے مقابلے میں دو گھوڑوں، آٹھ تلواروں اور تین سو تیرہ جانبازوں کے ذریعہ جیت لیا گیا تھا، کیا وہ برکت وتصرف کے بغیر ہی جیت لیا گیا تھا؟ ''العریش'' میں خدا کا پیغمبر... فداہ ابی وامی وروحی وجسدی صلی اللہ علیہ وسلم... جو ساری رات بلبلاتا رہا، اور اس نے بے خودی اور ناز کی کیفیت میں خدا تعالیٰ کی بارگاہِ صمدیت میں یہ تک کہہ دیا تھا:

''اللّٰھم انک ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام فلا تعبد فی الارض ابدا۔'' (مسند احمد ج:۱ ص:۳۰)

ترجمہ: ''اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر اہل اسلام کی جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین پر کبھی بھی عبادت نہیں ہوگی۔''

کیا خدا کی نصرت بھی ''برکت اور تصرف'' کے بغیر نازل ہوگئی تھی؟ اور ''شاہت الوجوہ'' کہہ کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی مٹھی پھینکی تھی، جس کو قرآن کریم نے:

''وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی''

(الانفال:۱۷)

ترجمہ: ''وہ مٹھی جو آپ نے پھینکی تھی، تو درحقیقت آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔''

فرمایا ہے، کیا مولانا کے نزدیک یہ ''برکت اور تصرف'' نہیں تھا؟ اگر مولانا ''الامام المہدی'' کی ''برکت وتصرف'' کا مذاق اڑاتے ہیں، تو کیا کوئی دوسرا ملحد ذرا آگے بڑھ کر ''یوم الفرقان'' (جنگ بدر کا دن، جسے قرآن کریم نے ''فیصلے کا دن'' فرمایا ہے) اسی طرح افسانہ طرازی قرار دے کر اس کا مذاق نہیں اڑا سکتا؟ صد حیف! دین اور اہل دین کا کس سوقیانہ انداز میں مذاق اڑانے والے ''مفکرِ اسلام'' بنے بیٹھے ہیں۔

''تفو برتو اے چرخِ گرداں تفو!''

اب ذرا "الامام المہدی" کے بارے میں مولانا کی رائے بھی سن لیجئے، ارشاد ہوتا ہے:

"میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل "جدید ترین طرز کا لیڈر" ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی، زندگی کے سارے مسائل اہم کو وہ خوب سمجھتا ہوگا، عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شور برپا کریں گے۔" [ص ۵۵]

یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ ایک معدوم چیز جو ابھی پردۂ مستقبل میں ہے، اس کے بارے میں مولانا کو اپنی اٹکل اور اندازے سے پیش گوئی کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا وہ "الامام المہدی" کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو کافی نہیں سمجھتے؟ اور یہ کہ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا تو آنحضرت علیہ السلام سے کی جاتی ہے یا فراست صحیحہ سے، یا کچھ لوگ علم نجوم کے ذریعہ الٹی سیدھی ہانکتے ہیں، مولانا نے "الامام المہدی" کے بارے میں جو "اندازہ" لگایا ہے، اس کی بنیاد آخر کس چیز پر ہے...؟

اور میں مولانا کے اس اندیشے کے بارے میں بحث نہیں کرتا کہ امام مہدی کی "جدتوں" کے خلاف غریب مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے کیوں شور برپا کریں گے، یا مولانا کے خیال میں "الامام المہدی" کی یہ "جدتیں" دین کے مسائل میں ہوں گی یا دنیا کے انتظام میں؟ اگر دین کے مسائل میں ہوں گی تو وہ مجدد ہوں گے یا خود مولانا کی اصطلاح کے مطابق "متجدد"؟ اور اگر مولانا کی مفروضہ "جدتیں" دنیا کے انتظامی امور میں ہوں گی تو مولانا کو کیسے اندیشہ ہوا کہ غریب مولوی اور صوفی ان کی مخالفت کریں گے...؟

besturdubooks.wordpress.com

ان تمام امور سے قطع نظر جو بحث طلب ہیں مولانا سے یہاں دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بقول ان کے "الامام المہدی" کو برکت و تصرف کی تو ضرورت نہ ہوگی، نہ وہ کسی شیخ و سجادہ کا مرید ہوگا، نہ ذکر و شغل کا قصہ چلے گا، بلکہ بقول مولانا کے "الامام المہدی" ایک ماڈرن قسم کے لیڈر ہوں گے، علومِ جدیدہ میں ان کو مجتہدانہ بصیرت ہوگی، زندگی کے مسائل مہمہ کو خوب سمجھتے ہوں گے، سیاست و ریاست اور جنگی تدبیروں میں ان کی دھوم مچی ہوگی، اس طرح وہ ساری دنیا پر اپنا سکہ جما دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت کی ذات کیا تھی؟ آخر کس چیز کی کمی ہے؟ یہ ساری باتیں جو مولانا نے "الامام المہدی" کے لئے لکھی ہیں، یک ایک کر کے ماشاء اللہ خود مولانا میں بھی پائی جاتی ہیں، وہ خدا کے فضل سے جدید ترین طرز کے لیڈر بھی ہیں، تمام علومِ جدیدہ میں ان کو مجتہدانہ بصیرت بھی حاصل ہے، زندگی کے سارے مسائل مہمہ پر نہ صرف ان کی نظر ہے، بلکہ ایک ایک مسئلے پر ان کے قلم نے لکھ لکھ کر کاغذوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، اور سیاسی تدبیر کی ساری باتیں بھی انہوں نے ذہن سے کاغذ پر منتقل کر دی ہیں، تعجب کی بات ہے کہ "الامام المہدی" کے بارے میں ذکر کردہ ساری صفات کے ساتھ متصف ہونے کے باوجود ان کی تحریک کا گھوڑا چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکا، اور ساری دنیا کیا، نصف صدی کی لگاتار محنت و قربانی کے نتیجے میں ایک پاکستان پر بھی ان کا سکہ نہ جم سکا، اور پاکستان کیا، ایک چھوٹی سی بستی میں (چلیے منصورہ میں) بھی وہ آج تک حکومتِ الٰہیہ قائم نہیں کر سکے، آخر "الامام المہدی" بقول مولانا کے کوئی مافوق الفطرت ہستی تو نہیں ہوں گے، اب اگر برکت و تصرف، ذکر و شغل، شیخ و مصلی اور حق تعالیٰ سے تعلق اور بینا ہی ساری صفات ان کی زندگی سے خارج کر دی جائیں تو آخر وہ اپنی "جدتوں" کے ذریعے سے ساری دنیا پر اپنا سکہ کیسے جما دیں گے؟ کیا مولانا نے "مستقبل" کے بارے میں نقشہ کھینچتے وقت اس سوال پر بھی غور فرمایا ہے...؟

دراصل مولانا کو "الامام المہدی" کی آڑ میں ابن الصوفی، شیخ و قطب، خانقاہ و مدرسہ، برکات و روحانی تصرف کا مذاق اڑانا تھا اور یہ مولانا کی قیادت ترقی کی عقلی منطق

توجیہ سے شاید خود بھی قاصر ہیں۔

کاش! جب مولانا "امام مہدی" کی آڑ میں محض اپنے اندازوں اور قیاسوں کی بنا پر شعائرِ دین کا مذاق اُڑا رہے تھے، کوئی شخص ان کے کان میں شیخ سعدی کا شعر کہہ دیتا:

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

۸:... شریعتِ اسلامیہ کا مآخذ چار چیزیں ہیں، جنھیں "اُصولِ اربعہ" کہا جاتا ہے، یعنی قرآنِ کریم، حدیثِ نبوی، اجماعِ اُمت اور مجتہدین کا اجتہاد و استنباط۔ اسلافِ اُمت سے بے نیاز ہوکر جب مولانا مودودی نے اسلام کا "آزاد مطالعہ" کیا تو ان چاروں مآخذ کے بارے میں ان کا رویہ بڑا عبرت آمیز تھا۔ قرآنِ کریم کے بارے میں تو موصوف نے یہ فرمایا کہ رفتہ رفتہ اس کی اصل تعلیم ہی بھول گئی تھی اور اپنے زمانۂ نزول کے بعد یہ کتاب... نعوذ باللہ... بے معنی ہوکر رہ گئی تھی۔ چنانچہ اپنے رسالے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں وہ لکھتے ہیں کہ: "اِلٰہ، رب، دین، عبادت، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں" اور بنیادی اہمیت کی وجہ یہ ہے:

"قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے، اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے؟ عبادت کی کیا تعریف ہے؟ اور دین کسے کہتے ہیں؟ تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی ہوجائے گا، وہ نہ توحید کو جان سکے گا، نہ شرک کو سمجھ سکے گا، نہ عبادت کو اللہ کے لئے مخصوص کرسکے گا، اور نہ دین ہی اللہ کے لئے خالص کرسکے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیرواضح اور نامکمل ہو تو اس کے لئے قرآن کی پوری تعلیم غیرواضح ہوگی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہ جائیں گے۔" (ص:۹، ۱۰)

besturdubooks.wordpress.com

مختصراً ان چار بنیادی اصطلاحوں کی جو اہمیت مولانا نے ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ان چار اصطلاحوں کا مفہوم ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو" تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا۔"

اس کے بعد مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے؟ اور صرف مسلمان ہی نہیں، کافر بھی قرآن کی ان اصطلاحات کے عالم تھے، لیکن ...!

> "لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصل معنی جو نزولِ قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا، اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزولِ قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، انہی دونوں وجوہ سے دورِ آخر کی کتبِ لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے۔" (ص: ۱۲)

اور ان چار بنیادی اصطلاحوں سے امت کی غفلت و جہالت کا نتیجہ کیا ہوا؟

> "بس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی۔" (ص ۱۳، طبع ہفتم)

ممکن ہے مولانا کے نیاز مندوں کے نزدیک ان کی یہ تحقیق ایک لائقِ قدر علمی انکشاف کہلانے کی مستحق ہو، مگر میں اسے قرآن کریم کے حق میں گستاخی اور امتِ اسلامیہ کے حق میں سوءِ ظن بلکہ تہمت سمجھنے اور کہنے پر مجبور ہوں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے

یا قادیانی کہتے ہیں کہ ”خاتم النبیین“ کے معنی ”مولوی صاحبان“ نے غلط سمجھے، یہ آیت نبوت بند کرنے کے لئے نہیں، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے ساتھ جاری کرنے کے لئے ہے۔

یا یہ کہ قرآن کریم کی آیت ”بل رفعه الله اليه“ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع جسمانی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد بے عزتی کی موت ہے، اور مولوی صاحبان جو معنی کرتے ہیں وہ بعد کی صدیوں میں بنا لئے گئے۔ اور جب ان ملاحدہ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ ہدیٰ کی تصریحات پیش کی جائیں تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ یہ سب بعد کے لوگوں کی تصنیف ہے۔ دراصل ان تمام ملاحدہ کو قرآن کریم کا انکار ہی مقصود ہے مگر صاف صاف انکار کی جرأت نہیں، اس لئے وہ لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ قرآن کریم کے یہ مسلسل معنی بعد کی صدیوں میں لوگوں نے بنائے ہیں۔ جب قرآن کریم کے متواتر معنی کا انکار کردیا جائے تو یہی تو انکارِ قرآن ہے۔

بدقسمتی سے ٹھیک یہی راستہ... شعوری یا غیر شعوری طور پر... مولانا مودودی نے اپنایا، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ قرآن کے ان چار الفاظ کے جو معنی صدیوں سے مسلمان سمجھتے چلے آرہے ہیں، یہ عجمی ذہن کی پیداوار ہے، جن کو عربیت کا ذوق نہیں تھا، اور ان چار الفاظ کے اصل معنی گم ہوجانے کی وجہ سے پورا قرآن بے معنی ہوکر رہ گیا۔ مولانا کا یہ نظریہ سن کر مسٹر پرویز اور قادیانی صاحبان ضرور کہتے ہوں گے:

با دو مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اور لطف یہ ہے کہ مولانا خود بھی عجمی ہونے کے باوصف ذوقِ عربیت کی کمی کی تہمت ان ائمہ عرب پر لگا رہے ہیں جو لغتِ عرب کے حافظ نہیں، ”دائرۃ المعارف“ تھے، اور جو ایک ایک لفظ کے سیکڑوں معنی ہر ایک کے محلِ استعمال اور بیسیوں شواہد کے ساتھ پیش کرسکتے تھے، ان کے سامنے ”تاج العروس“ اور ”لسان العرب“ نہیں تھی، جس کی ورق گردانی کرکے وہ الفاظ کے معانی تلاش کرتے ہوں، بلکہ ان کا اپنا حافظہ ہی ایسے خود تاج

اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی..... روایت پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد وقبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا عمل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ بتا سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے، اس لئے کہ اس کی ذوق مذاق محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا ہے اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔

اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا، وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا، وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر اس روڑے پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے، اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند صحیح حدیث سے بھی "اعراض" کر جاتا ہے، اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ کدر بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر

بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔(۱) آپ کا یہ خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی داڑھی رکھنا سنت رسول یا اسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے، بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی "بدعت" اور ایک خطرناک تحریف دین ہے، جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔"

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۰۷، ۲۰۸ طبع پنجم ۱۹۵۷ء)

یہاں مولانا کو دو غلط فہمیاں ہوئی ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے داڑھی رکھنے کو "عادات رسول" کہہ کر اس کے سنت ہونے سے انکار کیا ہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فطرت اور انبیائے کرام علیہم السلام کی متفق علیہ سنت فرمایا ہے، امت کو اس کی اقتداء کا صاف صاف حکم فرمایا ہے اور اس کی علت بھی ذکر فرمادی ہے، یعنی کفار کی مخالفت۔ اس لئے اس کو سنن عادیہ میں شمار کرنا اور اس کے سنت سمجھنے کو دین کی تحریف تک کہہ ڈالنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں بیہودہ جسارت ہے، فقہائے امت نے شریعت نبوی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اسے سنن واجبہ میں شمار کیا ہے۔

دوسری غلطی مولانا مودودی کو یہ ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے بڑھانے کا حکم تو ضرور دیا ہے، مگر اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں فرمائی، اس لئے بقول ان کے داڑھی کی کوئی خاص مقدار سنت نہیں ہوا، مگر یہ بات (۲) غلط ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے بڑھانے کا حکم دیا ہے، اس کے کاٹنے کا نہیں

(۱) یہاں ان کا اصل نظریہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

حکم نہیں فرمایا، نہ اس کی اجازت دی ہے۔

اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ اس کا کاٹنا کسی حد پر بھی جائز نہ ہوتا، مگر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو ایک مٹھی سے زائد بال کٹوا دیا کرتے تھے، ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی کم از کم حد یہ مقرر فرمائی گئی، اگر اس سے کم بھی جائز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ضرور اجازت دیتے، یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت میں سے کسی نے بھی ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے کو جائز نہیں رکھا، شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں:

"وأما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد."

(فتح القدیر ج:۲ ص:۲۷۰)

ترجمہ:... "لیکن ایک مشت سے کم داڑھی کے بال کاٹنا، جیسا کہ مغرب کے بعض لوگوں اور عورت نما مردوں کا معمول ہے، اس کی کسی نے اجازت نہیں دی۔"

صد حیف! کہ ایک سنت متواترہ کو مولانا مودودی کس خوش ذوقی سے بدعت مستحدثہ قرار دیتے ہیں، بلکہ اسے "تحریف دین" تک کہہ ڈالتے ہیں، اور "داڑھی کا طول کتنا ہے" کے طنزیہ فقرے سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (رسائل و مسائل ج:۱ ص:۱۸۸)

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مقابلہ میں تحقیری رویہ رکھے وہ عالم دین کہلانے کا مستحق ہے...؟

ہفتم:... میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ خلفائے راشدین کی سنت بھی سنت نبوی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بھی امت کے لئے واجب الاتباع ہے، یہاں اس سلسلے میں ایک اہم ترین نکتہ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اجماع امت کی اصل بنیاد خلفائے راشدین کے فیصلے ہیں۔ کتاب و سنت کے منصوص احکام کے علاوہ جن مسائل پر امت کا اجماع ہوا ہے ان کا بیشتر حصہ وہ ہے جن کے بارے میں خلفائے راشدین کے فیصلے موجود

besturdubooks.wordpress.com

فقہائے صحابہ نے ان سے اتفاق کیا، اس طرح صدر اول ہی میں امت اس پر متفق ہوگئی۔
خلفائے راشدین کے بعد شاذ و نادر ہی کسی مسئلے پر امت کا اجماع ہوا ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ومعنی اجماع کہ بر زبان علماء شنیدہ باشی این نیست کہ

ہمہ مجتہدان الا یشذ فرد در عصر واحد بر مسئلہ اتفاق کنند، زیرا کہ این صورتے است غیر واقع بل غیر ممکن عادی، بلکہ معنی اجماع حکم خلیفہ است بچیزے بعد مشاورہ ذوی الرائے یا بغیر آن، و نفاذ آن حکم تا آنکہ شائع شد و در عالم مستحکم گشت۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین من بعدی۔"

(ازالۃ الخفاء، ج ۱ ص ۳۴)

ترجمہ..."اور اجماع کا لفظ جو تم نے علماء کی زبان سے سنا ہوگا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک زمانے کے سارے مجتہد بایں طور کہ ایک فرد بھی باہر نہ رہے، کسی مسئلے پر اتفاق کرلیں، کیونکہ یہ صورت نہ صرف یہ کہ واقع نہیں بلکہ عادۃً ممکن بھی نہیں، بلکہ اجماع کے معنی یہ ہیں کہ خلیفہ ذو رائے لوگوں سے مشورہ کرکے یا بغیر مشورے کے کسی چیز کا حکم کرے اور وہ حکم نافذ ہوجائے، یہاں تک کہ وہ شائع ہوجائے اور دنیا میں اس کے پاؤں جم جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لازم پکڑو میری سنت کو اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت کو۔"

مگر ارشاد نبوی کے برعکس مولانا مودودی کی رائے یہ ہے کہ:

"خلفائے راشدین کے فیصلے بھی اسلام میں قانون قرار نہیں پائے، جو انہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے۔"

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۸ء)

قرآن کریم، سنتِ نبوی، خلفائے راشدین کی سنت (جو اجماعِ امت کی اصل بنیاد ہے) کے بارے میں مولانا مودودی کے ان نظریات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اصولِ دین اور شریعتِ اسلامیہ کے مآخذ کے بارے میں ان کا ذہن کس قدر الجھا ہوا ہے؛ باقی رہا اجتہاد، تو مولانا اپنے سوا کسی کے اجتہاد کو لائقِ اعتماد نہیں سمجھتے، اس لئے ان کی دین فہمی کا سارا مدار خود ان کی عقل و فہم اور صلاحیتِ اجتہاد پر ہے۔

ان چند نکات سے مولانا مودودی کے دینی فکر اور ان کے تجدیدی نظریہ کو سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان کی غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کی فہرست طویل ہے۔ میرے نزدیک مولانا مودودی کا شمار ان اہلِ حق میں نہیں جو سلفِ صالحین کا تتبع اور مسلکِ اہلِ سنت کی پیروی کرتے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی عقل و فہم سے دین کا جو تصور قائم کیا ہے وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں، خواہ وہ سلفِ صالحین سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو؟ مولانا کے دینی فکر میں نقص کے بڑے بڑے اسباب میرے نزدیک حسبِ ذیل ہیں:

اول:... انہوں نے دین کو کسی سے پڑھا اور سیکھا نہیں، بلکہ بطور خود سمجھا ہے، اور شاید مولانا کے نزدیک "دین" کسی سے سیکھنے اور پڑھنے کی چیز بھی نہیں، بلکہ ان کے خیال میں ہر لکھا پڑھا آدمی اپنے ذاتی مطالعے سے خود ہی دین سیکھ سکتا ہے۔

دوم:... ناپختہ عمری میں مولانا کو بعض ملاحدہ سے صحبت رہی، جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں موٴثر کردار ادا کیا، خود مولانا اپنی کہانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے، اور معاشی استقلال کے لئے جد و جہد کئے بغیر چارہ نہیں۔ قدرت نے تحریر و انشاء کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا، عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی، اسی زمانے میں جناب نیاز فتح پوری سے واسطہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہِ تحریک بنی..... غرض ان تمام وجوہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دیا

چاہئے۔" (مولانا مودودی ص: ۲۷، اسعد گیلانی)

سوم:... دُنیا کی ذہین ترین شخصیتوں کو عموماً یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ اگر ان کی صحیح تہذیب و تربیت نہ ہو پائے تو وہ اپنا راستہ خود تلاش کرلیتی ہیں، اور اپنے آپ کو اتنی قد آور اور بلند و بالا سمجھنے لگتی ہیں کہ باقی سب دُنیا انہیں پست قد نظر آتی ہے، یہی حادثہ مولانا مودودی کو بھی پیش آیا، حق تعالیٰ نے ان کو بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا، لیکن بدقسمتی سے انہوں نے دل کا کام بھی دماغ سے لیا، اور خوش فہمی کی اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ تمام اکابرِ اُمت انہیں بالشتیے نظر آنے لگے، اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ دِین کا جو فہم ان کو عطا ہوا ہے، وہ ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوا تھا، یہی خوش فہمی ان کی خودرائی اور اعجاب بالنفس کا ذریعہ بن گئی۔

چہارم:... ان کے ذہن پر دورِ جدید کا کچھ ایسا رُعب چھایا کہ انہیں دِینِ اسلام کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا مشکل نظر آیا، اس لئے انہوں نے اس کی اصلاح و ترمیم کرکے دورِ جدید کے اذہان کو مطمئن کرنا ضروری سمجھا، خواہ اسلام کی ہیئت ہی کیوں نہ بدل جائے۔ جیسا کہ آج "جمہوریت" دُنیا کے دماغ پر ایسی چھائی ہوئی ہے کہ لوگ کوشش کرکے اسلام کے نظامِ حکومت کو جمہوریت پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پنجم:... ان تمام اُمور کے ساتھ جب ان کے زورِ قلم اور شوخیٔ تحریر کی آمیزش ہوئی تو انہوں نے اکابرِ اُمت کے حق میں سوءِ ادب پر مجبور کرنے پر آمادہ کیا، اور اس بے ادبی کی نحوست ان کی ساری تحریر پر غالب آگئی۔

کاش! مولانا مودودی جیسے ذہین و فطین آدمی کی صحیح تربیت ہوئی ہوتی تو ان کا وجود اُمت کے لئے باعثِ برکت اور اسلام کے لئے لائقِ فخر ہوتا:

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

جواب سوال دوم:

آپ نے خطیب صاحب کا تذکرہ کیا ہے جو جمعہ کے بعد کی سنتیں نہیں پڑھتے، اور نماز عربوں کا ذوق نقل کیا ہے کہ وہ سنن و نوافل کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے، اس سلسلے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

اول:... حق تعالیٰ شانہ نے نوافل کو فرائض کی کمی پورا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے شریعت نے سنن و نوافل کی بہت ہی ترغیب دی ہے، اور احادیث طیبہ میں ان کے بہت سے فضائل ارشاد فرمائے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص فرض کے علاوہ روزانہ بارہ رکعتوں کی پابندی کرے گا، حق تعالیٰ شانہ اس کے لئے جنت میں گھر بنائیں گے، چار ظہر سے پہلے، دو ظہر کے بعد، دو مغرب کے بعد، دو عشاء کے بعد، دو فجر کی نماز سے پہلے۔ (مشکوٰۃ ص:۱۰۳)

دوم:... سنن و نوافل کے بارے میں لوگوں میں دو انتہا پسندی کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں، ایک ان پڑھ لوگوں میں، اور دوسری پڑھے لکھے لوگوں میں۔ ان پڑھ لوگوں کی کوتاہی تو یہ ہے کہ فرض اور نفل کے درمیان فرق نہیں سمجھتے، بلکہ نفل کو بھی فرض کی طرح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً: آپ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک شخص سارا دن نوافل پڑھتا رہے، لیکن فرض نماز نہ پڑھے تو وہ عند اللہ مجرم ہوگا، اور اگر صرف فرائض پڑھتا ہے، سنن و نوافل ترک کرتا ہے تو وہ مجرم نہیں بلکہ محروم کہلائے گا۔ ایک شخص سارے سال کے روزے رکھے، لیکن رمضان المبارک کا ایک روزہ جان بوجھ کر چھوڑ دے، تو یہ شخص گنہگار ہوگا، اور اگر رمضان المبارک کے روزے پورے رکھے، لیکن سال بھر میں کوئی نفلی روزہ نہ رکھے تو محروم کہلائے گا، گنہگار نہیں کہلائے گا۔ یا مثلاً: ایک شخص ساری رات عبادت کرتا رہے مگر فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے تو یہ گنہگار ہوگا، کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، اور ایک شخص ساری رات سویا رہے مگر جماعت کی نماز میں اہتمام سے شریک ہوا تو یہ گنہگار نہیں ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ فرائض کا تارک مجرم ہے، سنن مؤکدہ کا تارک ملامت کا مستحق ہے، اور نوافل کا تارک قیمتی دولت سے محروم ہے، مگر

besturdubooks.wordpress.com

مستحق ملامت نہیں۔ عوام بیچارے فرض، واجب، سنت، مستحب کے فرق کو نہیں جانتے، اس لئے وہ فرض کے تارک سے تو نفرت نہیں کرتے مگر کسی سنت و مستحب کے تارک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لکھے پڑھے حضرات کی غلطی یہ ہے کہ وہ سنن و نوافل کے اہتمام ہی سے محروم ہو جاتے ہیں، وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ فرض تو ہے نہیں، اس لئے ان کی ادائیگی میں تساہل کرتے ہیں، حالانکہ فرائض کی مثال تو کسی بندھی ڈیوٹی کی ہے کہ وہ نوکر کو بہرحال ادا کرنی ہی ہے، حق تعالیٰ سے بندے کا تعلق دراصل سنن اور نوافل کے میدان ہی میں واضح ہو جاتا ہے کہ کسے کتنی محبت اور کتنا تعلق ہے...؟

سوم:... جمعہ کے بعد کی سنتوں کے بارے میں روایات مختلف آئی ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے، وہ چار رکعتیں پڑھے (صحیح مسلم، مشکوٰۃ ص ۱۰۳)۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر جاکر دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھنے کا حکم فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کے بعد گھر میں جاکر دو رکعتیں پڑھنا نقل کرتے ہیں) خود جمعہ کے بعد پہلے دو اور پھر چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ (ترمذی شریف)

چہارم:... گزشتہ بالا روایات سے تین صورتیں سامنے آتی ہیں، اول دو رکعتیں، یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے، دوسرے چار رکعتیں، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے، تیسرے چھ رکعتیں، یہ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کا مسلک ہے، اور حنفی مذہب میں اسی پر فتویٰ ہے، مگر اس کا اختیار ہے کہ دو رکعتیں پہلے پڑھے یا چار پہلے پڑھے۔ عرب حضرات چونکہ عموماً شافعی یا حنبلی ہوتے ہیں، اس لئے وہ اپنے امام کے مسلک پر عمل کرتے ہیں، ان کے یہاں سنن و نوافل کا اہتمام ہے، ہمارے حنفیہ کو جمعہ کے بعد چھ رکعتیں ہی پڑھنی چاہئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عمل پسند کرنے اور چاہنے کے باوجود اس کی پابندی اس لئے نہیں فرماتے تھے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔

بھائی اور دوست احباب کی طرف سے دعا کا منتظر رہتا ہے۔ اور جب وہ اس کو پہنچتی ہے تو اسے دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ شانہ زمین والوں (یعنی زندوں) کی دعاؤں کی بدولت اہلِ قبور کو پہاڑوں کے برابر رحمت عطا فرماتے ہیں۔ اور مُردوں کے لئے زندوں کا تحفہ استغفار ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ ص ۲۰۶)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں نیک بندوں کا درجہ بلند فرما دیتے ہیں تو وہ عرض کرتا ہے کہ یا الٰہی! مجھے یہ درجہ کیسے ملا؟ ارشاد ہوتا ہے: "تیرے لئے تیرے بیٹے کے استغفار کی بدولت۔" (رواہ احمد، مشکوٰۃ ص ۲۰۶)

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ زندہ لوگ کھانے پینے کے جتنے محتاج ہیں، مُردے دعا کے اس سے بڑھ کر محتاج ہیں۔ (شرح الصدور سیوطی ص ۱۲۸)

بہرحال ہمارے جو بزرگ، احباب اور عزیز و اقارب اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کی مدد و اعانت کی یہی صورت ہے کہ ان کے لئے ایصالِ ثواب کیا جائے، یعنی ان کی خدمت میں ہماری طرف سے تحفہ ہے، وہ بھی ہمارے تعلق و محبت کا تقاضا ہے۔

۳... تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جس عمل کا ثواب کسی کو بخشنا منظور ہو تو اس کام کے کرنے سے پہلے اس کی نیت کرلی جائے، یا عمل کرنے کے بعد دعا کرلی جائے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کو قبول فرماکر اس کا ثواب فلاں صاحب کو عطا فرمائیں۔

۲... میت کو ثواب صرف نفلی عبادت کا بخشا جاسکتا ہے، فرائض کا ثواب کسی دوسرے کو بخشنا صحیح نہیں۔

۳... جمہور امت کے نزدیک ہر نفلی عبادت کا ثواب بخشنا صحیح ہے، مثلاً: دعا و استغفار، ذکر و تسبیح، درود شریف، تلاوتِ قرآن مجید، نفل نماز و روزہ، صدقہ و خیرات، حج و قربانی وغیرہ۔

۴... یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ایصالِ ثواب کے لئے جو چیز صدقہ کی جائے اس کا ہو بہو میت کو پہنچنا ضروری ہے، نہیں! بلکہ صدقہ و خیرات کا جو ثواب آپ کو ملتا، ایصالِ ثواب کی صورت میں وہی ثواب میت کو ملتا ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایصالِ ثواب مقصود نہیں، بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی
عبادت ہے جو صرف اسی تاریخ کو ادا کی جاسکتی ہے۔ الغرض ایصالِ ثواب کے لئے
گیارہویں تاریخ کا التزام کرنا ایک فضول حرکت ہے، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں،
اور اس کو ضروری سمجھ لینا خدا اور رسول کے مقابلے میں گویا اپنی شریعت بنانا ہے۔

دوسرے گیارہویں میں اس بات کا خصوصیت سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ کھیر ہی
پکائی جائے، حالانکہ اگر ایصالِ ثواب مقصود ہوتا تو نقد رقم بھی صدقہ کی جاسکتی تھی، اور کسی
مالیت کا غلہ یا کپڑا کسی مستحق کو چپکے سے اس طرح دیا جاسکتا تھا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ
ہوتی، اور یہ عمل ریا و نمائش اور دکھاوے سے پاک ہونے کی وجہ سے مقبول بارگاہِ خداوندی بھی
ہوتا۔ کھیر پکانے یا کھانا پکانے ہی کو ایصالِ ثواب کے لئے ضروری سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ
اس کے بغیر ایصالِ ثواب ہی نہیں ہوگا، یہ بھی مستقل شریعت سازی ہے۔

تیسرے ثواب تو صرف اتنے کھانے کا ملے گا جو غرباء و مساکین کو دے دیا جائے،
مگر گیارہویں شریف پکا کر اس سے زیادہ تر خود ہی کھا لیتے ہیں، یا پھر عزیز و اقارب اور
احباب کو کھلا دیتے ہیں، فقراء و مساکین کا حصہ اس میں بہت ہی کم ہوتا ہے، اس کے باوجود
یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جتنا کھانا پکایا ہے وہ سارے کا ثواب حضرت پیرانِ پیر کو پہنچ جاتا ہے، یہ بھی
قاعدۂ شرعیہ کے خلاف ہے، کیونکہ شرعاً ثواب تو اس چیز کا ملتا ہے جو بطور صدقہ کسی کو دے
دی جائے، صرف کھانا پکانا تو کوئی ثواب نہیں۔

چوتھے بہت سے لوگ گیارہویں کے کھانے کو تبرک سمجھتے ہیں، حالانکہ ابھی
معلوم ہوچکا کہ جو حصہ خود کھالیا گیا وہ صدقہ ہی نہیں، اور حضرت پیرانِ پیر کے ایصالِ
ثواب سے اس کو کیا تعلق ہے، اور کھانے کا جو حصہ صدقہ کر دیا ہے اس کا ثواب بلاشبہ پہنچے گا،
مگر صدقے کو تو حدیث پاک میں "اوساخ الناس" (لوگوں کا میل کچیل) فرمایا گیا ہے،
کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے لئے صدقہ جائز نہیں، پس جس چیز کو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "میل کچیل" فرمارہے ہوں اس کو "تبرک" سمجھنا اور بڑے
بڑے مال داروں کا اس کو شوق سے کھانا اور کھلانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے

besturdubooks.wordpress.com

چاہتے ہیں۔ اس تلقین کا جواب ان کی طرف سے یہ تھا کہ ”مولوی جی! خدا تعالیٰ کے نام کی چیز تو ہم نے پرسوں دی تھی، یہ خدا کے نام کی نہیں، بلکہ حضرت پیرانِ پیر کے نام کی ہے۔“

ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گیارہویں، حضرت شیخؒ رحمہ اللہ کے ایصالِ ثواب کے لئے نہیں دے رہے، بلکہ جس طرح صدقہ و خیرات کے ذریعہ حق تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے، اسی طرح وہ خود گیارہویں شریف کو حضرت کے دربار میں پیش کرکے آپ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہی راز ہے کہ وہ لوگ گیارہویں دینے نہ دینے کو مال و جان کی برکت اور بے برکتی میں دخیل سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات اپنی بے علمی کی وجہ سے بڑے خطرناک عقیدے میں گرفتار ہیں۔

چہارم:... جن لوگوں نے حضرت غوثِ اعظمؒ کی ”غنیۃ الطالبین“ اور آپ کے سوانح شریفہ (فتوح الغیب) وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ حضرت شیخؒ، امام احمد بن حنبلؒ کے پیرو تھے، گویا آپ کا فقہی مسلک ٹھیک وہی تھا جو آج سعودی حضرات کا ہے، جن کو لوگ ”نجدی“ اور ”وہابی“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت شیخؒ اور ان کے مقتدا حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک جو شخص نماز کا تارک ہو وہ مسلمان نہیں رہتا، اگر حضرت غوثِ اعظمؒ آج دنیا میں ہوتے تو ان لوگوں کو، جو نماز، روزے کے تارک ہیں مگر التزام سے گیارہویں دیتے ہیں، شاید اپنے فقہی مسلک کی بنا پر مسلمان بھی نہ سمجھتے، اور یہ حضرات نجدیوں کی طرح حضرت شیخؒ پر ”وہابی“ ہونے کا فتویٰ دیتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت پیرانِ پیرؒ یا دوسرے اکابر کے لئے ایصالِ ثواب کرنا سعادت مندی ہے، مگر گیارہویں شریف کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ متعدد وجوہ سے صحیح نہیں، بغیر تخصیصِ وقت کے جو کچھ میسر آئے، اس کا صدقہ کرکے بزرگوں کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔

کھانے پر ختم

بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایصالِ ثواب کے لئے جو کھانا دیتے ہیں، اس پر میاں جی سے کچھ پڑھواتے ہیں، اور اس کو بعض لوگ ”فاتحہ شریف“ اور بعض ”ختم شریف“

besturdubooks.wordpress.com

مضائقہ ندارد۔ ودریں ہم وقتے کہ عادت گیرند بطریق التزام و پابندی خوانند، اما بطور وعظ و پند ونصیحت از شرک و بدعت خوانند روا و جائز است، بلکہ برائے رد بدعت گاہ واجب می شود۔" (فتاوی عزیزی ص:۱۹۲)

ترجمہ: "سوال:... کوئی شخص کلام اللہ یا قرآن مجید کی آیت کھانے پر پڑھے تو کیا حکم ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ کلام اللہ کھانے پر پڑھنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص قضائے حاجت کی جگہ پر پڑھے نعوذ باللہ۔

جواب:... ایسا کہنا درست نہیں، بلکہ بے ادبی ہے، ہاں! اگر یوں کہے کہ: "اس طرح کھانے پر قرآن پڑھنا بے ادبی ہے" تو مضائقہ نہیں، اور یہ بے ادبی بھی اس وقت ہے جبکہ بطور وعظ و نصیحت نہ پڑھے، لیکن وعظ و نصیحت کے طور پر، اور شرک و بدعت سے منع کرنے کے لئے پڑھنا ہر جگہ درست ہے، بلکہ رد بدعت کے لئے بسا اوقات واجب ہے۔"

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ کھانے پر قرآن مجید پڑھنا ایک طرح کی بے ادبی ہے۔

چہارم:... میاں جی کو بلاکر جو ختم پڑھایا جاتا ہے، اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ میاں جی بیچارے ختم کے بدلے میں کھانا لے جاتے ہیں اور گھر والے اپنے کھانے کے بدلے میں میاں جی سے ختم پڑھوا لیتے ہیں، اگر میاں جی ختم نہ پڑھے تو وہ کھانے سے محروم رہتا ہے، اور اگر گھر والے کھانا نہ دیں تو میاں جی ختم کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، گویا میاں جی کے ختم اور گھر والوں کے کھانے کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسری کا معاوضہ بن جاتی ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم معاوضے پر پڑھا جائے تو ثواب پڑھنے والے کو بھی نہیں ملتا، اسی طرح جو کھانا معاوضے کے طور پر کھلایا جائے وہ بھی ثواب سے محروم رہتا ہے۔ ختم پڑھانے والے کو نہ تو ختم کا ثواب ملا، نہ قرآن کا

> کھانا تیار ہوجاتا ہے تو اول اس پر پنڈت کو بلاکر کچھ وید پڑھواتے ہیں، جو پنڈت اس کھانے پر وید پڑھتا ہے تو وہ ان کی زبان میں "اچھشرمن" کہلاتا ہے اور اسی طرح دوسرے بھی دن مقرر ہیں۔"

ان چیزوں اور چند دوسری حیثیتوں کی بنا پر میں کھانا سامنے رکھ کر قرآن کریم کی آیات کا ختم پڑھنے کو ایک بے کار رسم سمجھتا ہوں، اور اسے ایصالِ ثواب کا اسلامی طریقہ سمجھنے اور اس کی پابندی کرنے کو "بدعت" سمجھتا ہوں، تاہم ختم پڑھنے سے کھانا حرام نہیں ہوجاتا اور نہ اس کو "شرک" کہنا صحیح ہے، البتہ "بدعت" کہنا چاہئے۔ میں ایصالِ ثواب کا مسنون طریقہ اوپر عرض کرچکا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

الف... اپنے مرحوم بزرگوں اور عزیزوں کے لئے دعا و استغفار کی پابندی کی جائے۔

ب: جتنی ہمت ہو، درود شریف، تلاوتِ قرآن مجید، کلمہ شریف اور تسبیحات پڑھ کر ان کو ایصالِ ثواب کیا جائے، اگر ہر مسلمان روزانہ تین مرتبہ درود شریف، سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص پڑھ کر بخش دیا کرے تو مرحومین کا جو حق ہمارے ذمہ ہے، کسی درجے میں وہ ادا ہوسکے۔

ج:... نفلی نماز، روزہ، حج، قربانی سے بھی حسبِ توفیق ایصالِ ثواب کیا جائے۔

د:... صدقہ و خیرات کے ذریعہ بھی ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا جائے، مگر اس کے لئے نہ کوئی وقت مقرر کیا جائے، نہ کھانا پکانے ہی کا اہتمام کیا جائے، نہ میاں جی کی ضرورت سمجھی جائے، بلکہ وقتاً فوقتاً جب بھی توفیق ہو، روپیہ پیسہ، غلہ، کپڑا، یا جو چیز بھی میسر ہو، مرحومین کی طرف سے راہِ خدا میں صدقہ کردی جائے، یہ ہے ایصالِ ثواب کا وہ طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے، اور جس پر ہمارے اکابر اہلِ حق، سلفِ صالحین عمل پیرا رہے ہیں۔

حرفِ آخر:

آخر میں چند باتیں نقل کرتا ہوں، جن کو ہمارے عوامِ اہلِ سنت نے بدعت

besturdubooks.wordpress.com

قرار دیا ہے، تمام اہلِ سنت کو ان سے پرہیز کرنا ضروری ہے! اور جو لوگ یہ بدعتیں کرتے ہیں، وہ اہلِ سنت نہیں بلکہ "اہلِ بدعت" ہیں۔ قبروں پر دُھوم دھام سے میلے کرنا، پختہ قبریں بنانا، قبے بنانا، ان پر چادریں چڑھانا، ان کو سجدہ کرنا، ان کا طواف کرنا، ان کے سامنے نیت باندھ کر کھڑے ہونا، ان کو چومنا، چاٹنا، آنکھیں ملنا، ان پر نذر و نیاز دینا، اور گلگلے وغیرہ چڑھانا، بزرگوں کا عرس کرنا، ان کی قبروں پر میلے لگانا، ڈھول اور مجیروں کو بجانا اور طرح طرح کے کھیل تماشے کرنا، بزرگوں کی منتیں ماننا، ان کے نام کے چڑھاوے چڑھانا، ان سے دُعائیں مانگنا، ان کی قبروں پر چراغاں کرنا، چادریں چڑھانا، ۱۲ ربیع الاول کو "عید میلاد" منانا، اس موقع پر چراغاں کرنا، محفلِ میلاد میں آنحضرت کی آمد کا عقیدہ رکھنا، غلط سلط نعت خوانی کرنا، جلوس نکالنا، روضۂ شریف کی شبیہ بنانا، بیت اللہ شریف کی شبیہ بنانا، اذان و اقامت میں انگوٹھے چومنا، مل کر زور زور سے ذکر کرنا جس سے نمازیوں کی نماز میں خلل ہو، قد قامت الصلوٰۃ سے پہلے کھڑے ہونے کو بُرا سمجھنا، نمازوں کے بعد مصافحے کرنا، اذان سے پہلے درود و سلام پڑھنا، گیارھویں دینا، کھانے پر ختم پڑھنا، تیجا، قوال، دسواں، بیسواں، چالیسواں کرنا، برسی منانا، ایصالِ ثواب کے لئے خاص خاص صورتیں تجویز کرنا اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھنا، محرم میں ماتم کرنا، تعزیے نکالنا، علم اور دُلدل نکالنا، سبیلیں لگانا، مرثیے پڑھنا، قرآن مجید پڑھنے پر اُجرت لینا، قبر پر اذان کہنا، مردہ بخشوانے کے لئے حیلہ اسقاط کرنا، قبروں میں غلہ لے جانا، قُل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

حق تعالیٰ شانہ سب مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے اور تمام بدعات سے بچنے کی توفیق بخشے اور قیامت کے دن مجھے، آپ کو اور تمام مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت و معیت نصیب فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

محمد یوسف لدھیانوی

۲۳/۶/۱۳۹۹ھ

besturdubooks.wordpress.com

ضمیمہ

(۱)

قبروں پر پھول ڈالنا

''سوال:... روزنامہ ''جنگ'' ۱۲؍دسمبر کی اشاعت میں آپ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ قبروں پر پھول چڑھانا خلافِ سنت ہے۔ ۱۹؍دسمبر کی اشاعت میں ایک صاحب شاہ تراب الحق قادری نے آپ کو جاہل اور علمِ کتاب و سنت سے بے بہرہ قرار دیتے ہوئے اس کو ''سنت'' لکھا ہے، جس سے کافی لوگ تذبذب میں مبتلا ہوگئے ہیں، براہِ کرم یہ خلجان دور کیا جائے۔''

جواب:... شریعت کی اصطلاح میں ''سنت'' اس طریقے کو کہتے ہیں جو دین میں ابتدا سے چلا آتا ہو، پس جو عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول رہا ہو وہ سنت ہے، اسی طرح حضراتِ خلفائے راشدین اور صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) نے جو عمل کیا ہو، وہ بھی ''سنت'' ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

کسی عمل کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ یہ سنت ہے یا نہیں؟ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دیکھ لیا جائے کہ آیا یہ عمل خیرالقرون میں رائج تھا یا نہیں؟ یا جو عمل صدرِ اوّل (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم کے بابرکت زمانوں) میں رائج رہا ہو، وہ بلاشبہ سنت ہے، اور اس پر عمل کرنے والے ''اہلِ سنت'' یا ''سنی'' کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس کے برعکس جو عمل کہ ان بابرکت زمانوں کے بعد ایجاد ہوا ہو، اس کو بذاتِ خود مقصود اور کارِ ثواب سمجھ کر کرنا بدعت ہے، اور جو لوگ اس پر عمل

جو ایسی ہوں وہ "عملی بدعت" یا "بدعتی" کہلاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینکڑوں جاں نثار صحابہ کرامؓ کو دفن کیا، ماشاء اللہ مدینہ طیبہ (منورہ) میں پھولوں کی کمی نہیں تھی، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قبر پر پھول چڑھائے؟ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کیا خلفائے راشدینؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ اقدس پر پھول چڑھائے؟ کیا صحابہ کرامؓ نے حضرات خلفائے راشدینؓ کی قبورِ طیبہ پر اور تابعینؒ نے کسی صحابی کی قبر پر پھول چڑھائے؟ ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے!! اور پورے ذخیرۂ حدیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کسی خلیفۂ راشد، کسی صحابی یا کسی تابعی نے قبروں پر پھول چڑھائے ہوں۔ پس جو عمل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر کسی ادنیٰ تابعی تک سے ثابت نہ ہو، اس کو "سنت" کون کہہ سکتا ہے...؟ ہاں! اگر کوئی صاحب کسی ایسے کام کو بھی "سنت" سمجھا کرتے ہیں جو معمولِ نبوی اور صحابہؓ و تابعینؒ کے معمول کے خلاف ہو تو اس ناکارہ کو اعتراف ہے کہ وہ "سنت" کی دینی اصطلاح سے ناواقف ہے۔

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک چیز کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانوں میں وجود نہیں تھا، بلکہ بعد میں وجود میں آئی، اور کسی امام مجتہد نے کسی اصلِ شرعی سے استنباط کر کے اسے جائز یا مستحسن قرار دیا، ایسی چیز کو سنتِ نبوی تو نہیں کہا جائے گا، مگر مجتہد کا اجتہاد و قیاس و استنباط بھی چونکہ ایک شرعی اصل ہے، اس لئے ایسی چیز کو خلافِ شریعت بھی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اسے بھی ثابت بالسنۃ سمجھا جائے گا۔

زیرِ بحث مسئلے میں یہ صورت بھی نہیں پائی جاتی، کیونکہ اول تو پھول اور قبریں کوئی چیزیں نہیں جو زمانۂ خیر القرون کے بعد وجود میں آئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قبریں بھی تھیں اور پھول بھی تھے، اور ان پھولوں کو قبروں پر آسانی سے ڈالا بھی جا سکتا تھا، اگر یہ کوئی مستحسن چیز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو یقیناً اس کو رواج دے سکتے تھے، پھر فقہ حنفی کی تدوین ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ کے زمانے سے شروع ہوئی اور دوسری صدی سے لے کر دسویں صدی تک بلامبالغہ ہزاروں فقہی کتابیں

لکھی گئی ہیں، ہمارے فقہاء نے تلقین، دفن اور قبر سے متعلق ادنیٰ ادنیٰ مستحبات اور مسنون آداب کو بڑی تفصیل سے قلم بند کیا ہے، لیکن ان صدیوں کا پورا فقہی ذخیرہ اس سے خالی ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا بھی "سنت" ہے۔ اب اگر یہ عمل بھی سنت ہوتا تو ان صدیوں کے ائمہ احناف اس "سنت" سے کیوں غافل رہے؟! آخر یہ کیسی سنت ہے جس کا سراغ نہ زمانہ خیر القرون میں ملتا ہے، نہ ذخیرۂ حدیث میں، نہ ان صدیوں کے فقہی ذخیرے میں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر عمل کرتے ہیں، نہ خلفائے راشدینؓ، نہ صحابہؓ و تابعینؒ، نہ ائمہ مجتہدینؒ اور نہ ان صدیوں کے علماء!

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ زمانہ بعد کے متأخرین کے استحسان سے "سنت" تو کجا؟ جواز بھی ثابت نہیں ہوتا، امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ "فتاویٰ غیاثیہ" سے نقل کرتے ہیں:

"قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ الشَّہِیْدُ رَحِمَہُ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ: لَا نَأْخُذُ بِاسْتِحْسَانِ مَشَایِخِ بَلْخٍ، وَاِنَّمَا نَأْخُذُ بِقَوْلِ اَصْحَابِنَا الْمُتَقَدِّمِیْنَ رَحِمَہُمُ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ، لِاَنَّ التَّعَامُلَ فِیْ بَلْدَۃٍ لَا یَدُلُّ عَلَی الْجَوَازِ، وَاِنَّمَا یَدُلُّ عَلَی الْجَوَازِ مَا یَکُوْنُ مِنَ الصَّدْرِ الْاَوَّلِ لِیَکُوْنَ ذٰلِکَ دَلِیْلًا عَلٰی تَقْرِیْرِ النَّبِیِّ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اِیَّاہُمْ عَلٰی ذٰلِکَ فَیَکُوْنُ شَرْعًا مِنْہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَاَمَّا اِذَا لَمْ یَکُنْ کَذٰلِکَ لَا یَکُوْنُ فِعْلُہُمْ حُجَّۃً، اِلَّا اِذَا کَانَ ذٰلِکَ مِنَ النَّاسِ کَافَّۃً فِی الْبُلْدَانِ کُلِّہَا، لِیَکُوْنَ اِجْمَاعًا وَالْاِجْمَاعُ حُجَّۃٌ، اَلَا تَرٰی اَنَّہُمْ لَوْ تَعَامَلُوْا عَلٰی بَیْعِ الْخَمْرِ وَعَلَی الرِّبٰوا لَا یُفْتٰی بِالْحِلِّ۔"

(مکتوبات امام ربانی دفتر دوم مکتوب [illegible])

ترجمہ: "شیخ امام شہید فرماتے ہیں کہ ہم مشائخ بلخ کے

استحسان کو نہیں لیتے، بلکہ عرف اپنے مقلدین حضرات کے قول دیتے ہیں، کیونکہ کسی علاقے میں کسی چیز کا رواج چل نکلنا اس کے جواز کی دلیل نہیں، جواز کی دلیل وہ تعامل ہے جو صدرِ اول سے چلا آتا ہے، جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اس پر برقرار رکھا تھا، اس صورت میں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تشریع ہوگی، لیکن جب ایسا نہ ہو تو لوگوں کا فعل حجت نہیں، اِلَّا یہ کہ تمام ملکوں کے تمام انسان اس پر عمل پیرا ہوں، تو یہ اجماع ہوگا اور اجماع حجت ہے، دیکھئے! اگر لوگ شراب فروشی اور سود پر عمل کرنے لگیں تو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔"

رہی وہ حدیث جو شاہ صاحب نے پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاخِ خرما کو دو حصوں میں چیر کر انہیں دو معذب اور مقبور قبروں پر گاڑ دیا تھا، اور فرمایا تھا کہ: "جب تک یہ خشک نہیں ہوں گی، امید ہے کہ ان قبروں کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔" اس سلسلے میں چند امور لائقِ توجہ ہیں:

اول: ... یہ کہ یہ واقعہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی روایت سے مروی ہے، امام نووی اور قرطبی رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ تمام روایات ایک ہی قصے کی حکایت ہیں، لیکن حافظ ابنِ حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ مختلف واقعات ہیں، اس امر کی تحقیق اگرچہ بہت دشوار ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا متعدد واقعات؟ لیکن قدرِ مشترک سب روایات کا یہ ہے کہ قبروں پر شاخیں گاڑنا عام معمولِ نبوی نہیں تھا، بلکہ مقبور و معذب قبروں پر شاخیں گاڑنے کے ایک دو واقعے ضرور پیش آئے۔

دوم: ... اس میں بھی کلام ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی تھیں یا کافروں کی؟ ابو موسیٰ مدینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ کافروں کی قبریں تھیں، اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ مسلمانوں کی قبریں تھیں۔ حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث جابرؓ میں بظاہر کافروں کی قبروں کا قصہ ہے، اور حدیث ابن عباسؓ میں مسلمانوں کی قبروں کا۔ (فتح الباری ج:۱ ص:۳۲۰)

besturdubooks.wordpress.com

یہ قبریں کافروں کی ہیں یا مسلمانوں کی؟ اتنی بات واضح ہے، اور حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ شاخیں گاڑنے کا عمل ان قبروں پر کیا گیا جن کا مقبور معذب ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی قطعی یا کشفِ صحیح سے معلوم ہوگیا۔ عام مسلمانوں کی قبروں پر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاخیں گاڑیں اور نہ اس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں رواج عام ہوا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ قبر پر شاخ گاڑنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ عامہ و مستمرہ مقصودہ نہیں تھی۔

سوم:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ: ''امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں ان قبروں کے عذاب میں تخفیف رہے گی'' شارحین نے اس کی توجیہ و تعلیل میں کلام کیا ہے، مناسب ہے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی شرح مشکوٰۃ سے اس مقام کی تشریح بلفظہٖ نقل کردی جائے، شاہ صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں:

''اس حدیث کی توجیہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان شاخوں کے تر رہنے تک تخفیفِ عذاب کی امید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائی، اس کی بنیاد کس چیز پر ہے؟

بعض لوگ اس پر ہیں کہ: اس کی بنا اس پر ہے کہ نباتات جب تک تر و تازہ رہیں، حق تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں، اور آیتِ کریمہ: ''اور نہیں کوئی چیز مگر تسبیح کہتی ہے اپنے رب کی حمد کے ساتھ'' میں شی سے زندہ شی مراد ہے، اور لکڑی کی زندگی اسی وقت تک ہے جب تک وہ خشک نہ ہو، اور پتھر کی حیات اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ ٹوٹ نہ جائے، یا یہ کہ تسبیح زندہ کے ساتھ مخصوص ہے، اور جو تحقیق کہ ہر چیز کو عام ہے، وہ اس کا وجود صانع پر، اور اس کی وحدت اور صفاتِ کمال پر دلالت کرنا ہے، اور یہ جماعت اس حدیث سے قبروں پر سبزہ اور پھول ڈالنے میں استدلال کرتی ہے۔

اور امام خطابی رحمہ اللہ نے، جو ائمہ اہلِ علم اور قدوہ شراحِ

حدیث منکر سے ہیں، اس قول کو رَد کیا ہے، اور جس حدیث سے تمسک کرتے ہوئے قبروں پر سبزہ اور پھول ڈالنے سے انکار کیا ہے، اور فرمایا کہ یہ بات کوئی اصل نہیں رکھتی، اور صدرِ اوّل میں نہیں تھی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس تحدید و توقیت کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تخفیفِ عذاب کی شفاعت فرمائی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت شاخ کے خشک ہونے تک کی مدت کے لئے قبول کرلی گئی، اور ارشادِ نبوی "لعل" کا لفظ اسی طرف ناظر ہے۔ واللہ اعلم (اور صحیح مسلم ج:۲ ص:۴۱۸ میں بروایتِ جابرؓ اس پر تصریحِ نبوی موجود ہے۔ ناقل)۔

اور علامہ کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: شاخ کے اندر دفعِ عذاب کی کوئی خاصیت نہیں، بلکہ یہ عذاب میں تخفیف سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی برکت و کرامت تھی:

اگر تو دست بیمائی بگورِ مردہ دلاں
روانِ مردہ درآید بجنبش در گور (1)

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: اس کا علم نبوت کے سپرد ہے کہ اس میں کیا راز ہوگا؟ اور جو جامع الاصول میں بریدہ صحابی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے وصیت فرمائی کہ دو شاخیں ان کی قبر میں گاڑ دی جائیں، تو ممکن ہے کہ اس میں کوئی راز ہو اور وہ سببِ نجات ہو جائے:

دلِ عشاق حیلہ گر باشد (2)

(اشعۃ اللمعات ج:۱ ص:۲۰۰)

---

(۱) اگر آپ مُردہ دلوں کی قبر پر ہاتھ رکھ دیں تو مُردے کی جان مزے سے اس کے جسم میں لوٹ آئے۔
(۲) عشاق کا دل (حسبِ محبوب کی) کوئی نرالی تدبیر کرتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کی اس تحریر سے واضح ہوجاتا ہے کہ محققین اس کے قائل ہیں کہ تخفیفِ عذاب کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی برکت و کرامت تھی، ورنہ شاخ میں دفعِ عذاب کی کوئی خاصیت نہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے شاخِ تر کے تسبیح پڑھنے کو دفعِ عذاب کی علت قرار دیا اور پھر اس کو عام سبزہ و گل کی طرف متعدی کیا، ان کو اجتہاد و استنباط کا کوئی مقام حاصل نہیں، نہ ان کا یہ قول اہلِ علم کی نظر میں کوئی قیمت رکھتا ہے، بلکہ "اعلم اہلِ علم" اور "قدوۂ شراحِ حدیث" نے ان کے اس تعلق کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ:

"ایں سخن اصلے ندارد و در صدرِ اول نبود۔"

ترجمہ:... "یہ بالکل بے اصل بات ہے، اور صدرِ اول ...خیر القرون... کے معمول کے خلاف ہے۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ مشکوٰۃ کی عربی شرح "لمعات التنقیح" میں مشہور حنفی فقیہ و محدث اور عارف باللہ فضل اللہ توربشتی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

"توربشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس تحدید کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاخوں کے تر رہنے کی مدت تک ان قبروں سے تخفیفِ عذاب کی شفاعت فرمائی تھی۔

رہا ان لوگوں کا قول جنہوں نے یہ کہا ہے کہ "اس کی وجہ یہ ہے کہ شاخ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہتی ہے، جب تک کہ اس میں تری باقی ہے، پس وہ عذابِ قبر سے بچانے والی ہوگی" تو یہ قول بالکل بے مقصد اور لاطائل ہے، اور اہلِ علم کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں۔" (لمعات ج:۲ ص:۳۳)

حضرت شیخ رحمہ اللہ کی تشریح سے واضح ہوجاتا ہے کہ جن مجوزین [illegible] لوگوں نے اس حدیث سے قبروں پر سبزہ و گل ڈالنے کا استنباط کیا ہے، اکابر علماء نے ان کے قول کو بے اصل، بے معنی، غیر معتبر اور صدرِ اول کے خلاف بدعت قرار دیا ہے، کیا ان

besturdubooks.wordpress.com

کے حق میں پر پشہ کے برابر بھی وزن ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ اس سے محروم رہتے۔

چہارم:... اور اگر ان حضرات کی تعلیل کو... جو اہلِ علم کے نزدیک بے اصل، لا طائل اور غیر معتبر ہے... علی سبیل التنزل تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی اس سے قبر پر شاخوں کا گاڑنا سنت قرار پاتا ہے، نہ کہ قبروں پر پھول بکھیرنا، یا پھولوں کی چادریں چڑھانا۔ چنانچہ علامہ عینی رحمہ اللہ جو اس تعلیل کو قبول کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"وَكَذٰلِكَ مَا يَفْعَلُهُ أَكْثَرُ النَّاسِ مِنْ وَضْعِ مَا فِيْهِ رُطُوْبَةٌ مِنَ الرَّيَاحِيْنِ وَالْبُقُوْلِ وَنَحْوِهِمَا عَلَى الْقُبُوْرِ لَيْسَ بِشَيْءٍ وَإِنَّمَا السُّنَّةُ الْغَرْزُ." (عمدۃ القاری ج:۳ ص:۱۲۲)

ترجمہ:... "اور اسی طرح جو فعل کہ اکثر لوگ کرتے ہیں، یعنی سبزہ و گل وغیرہ رطوبت والی چیزوں کا قبروں پر ڈالنا، یہ کوئی چیز نہیں، سنت ہے تو صرف شاخ کا گاڑنا۔"

پنجم:... نیز اگر ان حضرات کی اس تعلیل کو قبول بھی کر لیا جائے تو اس سے کافروں اور فساق و فجار کی قبروں پر شاخ گاڑنے کا جواز ثابت ہوگا، نہ کہ اولیاء اللہ کی قبور پر۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معذب و مقہور قبروں کے سوا کسی قبر پر شاخ نہیں گاڑی، نہ اس کی ترغیب دی اور نہ صحابہؓ و تابعینؒ نے اس پر عمل کیا۔ پس اس تعلیل سے صالحین اور مقبولانِ الٰہی کی قبروں پر پھول ڈالنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، چہ جائیکہ اسے سنت یا مستحب کہا جائے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ کافروں اور گنہگاروں کی قبروں کے ساتھ فرمایا، وہ اولیاء اللہ کی قبور سے روا رکھا جاتا ہے۔

شارع علیہ السلام نے تمام مسلمانوں کی قبروں پر شاخ گاڑنے کی جو سنت جاری نہیں فرمائی، شاید... واللہ اعلم... اس میں یہ حکمت بھی ملحوظ ہو کہ ایسی شاخوں کا گاڑنا قبر کے معذب و مقہور ہونے کی بدشگونی ہے، اور شریعت ایسے کسی امر کو پسند نہیں کرتی جس میں کسی

شاہ صاحب نے دوسرا حوالہ یہ نقل کیا ہے کہ:

"حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقات میں اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ: مزاروں پر تر پھول ڈالنا سنت ہے۔"

شیخ علی قاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ذیل میں پہلے تو امام نووی رحمہ اللہ کا طویل اقتباس نقل کیا ہے، جس کا ایک فقرہ یہ ہے:

"یہ جو لوگ اس حدیث سے تمسک کرتے ہوئے قبروں پر کھجور وغیرہ کے پتے ڈالتے ہیں، امام خطابی رحمہ اللہ نے اس پر نکیر کی ہے، اور فرمایا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔"

شیخ علی قاری رحمہ اللہ اس فقرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یعنی خطابی کا انکار کرنا اور یہ کہنا کہ اس کی کوئی اصل نہیں، تو اس میں واضح بحث ہے، کیونکہ یہ حدیث اس کے لئے اصل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ابن حجرؒ نے اس بحث کی تصریح کی ہے، اور کہا ہے کہ: خطابی کا یہ کہنا کہ اس کی کوئی اصل نہیں، ممنوع ہے، بلکہ یہ حدیث اس کی اصل اصیل ہے، اسی بنا پر ہمارے متاخرین اصحاب میں سے بعض ائمہ نے فتویٰ دیا ہے کہ پھول اور شاخیں رکھنے کی جو عادت ہوگئی ہے، وہ اس حدیث کی بنا پر سنت ہے۔"

ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کرکے شیخ علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"شاید خطابی کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث ایک واقعہ سے متعلق ہے، عموم کا فائدہ نہیں دیتی، اسی لئے اس کی کئی توجیہات کی گئی ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ یہ بات محلِ نظر ہے۔"

[مرقات ج:۱ ص:۳۵۰ طبع ملتان]

شیخ علی قاری رحمہ اللہ کے اس کلام سے مندرجہ ذیل امور مستفاد ہوئے:

besturdubooks.wordpress.com

۱:... پھول ڈالنے کو انہوں نے سنت نہیں کہا، بلکہ ابن حجر شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ بعض متأخرین شافعیہ نے اس کا فتویٰ دیا ہے۔

۲:... شیخ علی قاری رحمہ اللہ واضح اختلاف میں سے کسی کا قول نقل نہیں کیا کہ یہ فعل سنت ہے، نہ متقدمین کا، اور نہ متأخرین حنفیہ کا، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ائمہ نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔

۳:... ابن حجرؒ نے جن متأخرین شافعیہ کا فتویٰ نقل کیا ہے، نہ وہ مجتہد ہیں، اور نہ امام خطابی اور امام نووی رحمہما اللہ کے مقابلے میں ان کا قول کوئی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ ائمہ شافعیہ میں خطابی اور نووی رحمہ اللہ کا علم و فضل، ورع و تقویٰ اور حدیث و فقہ میں جو مقام ہے، ان متأخرین شافعیہ کی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔

۴:... شیخ علی قاری، خطابیؒ کے قول کی تو صحیح کرتے ہیں، اور اس مسئلے کو کل نظر بتاتے ہیں۔ انہوں نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ بطور فتویٰ نہیں، بلکہ بطور بحث ہے۔ ان تمام امور کو نظر انداز کر کے کہہ دینا کہ: "ملّا علی قاری نے مرقات میں مزارات پر پھول چڑھانے کو سنت کہا ہے" علمی ثقاہت کے خلاف ہے۔

تیسرا حوالہ طحطاوی کے حاشیہ مراقی الفلاح کا دیا ہے کہ:

"ہمارے بعض متأخرین اصحاب نے اس حدیث کی رو سے فتویٰ دیا کہ خوشبو اور پھول قبر پر چڑھانے کی جو عادت ہے، وہ سنت ہے۔"

غالباً شاہ صاحب نے طحطاوی کا حاشیہ خود ملاحظہ نہیں فرمایا، ورنہ انہیں نظر آتا کہ یہ طحطاوی کی اپنی عبارت نہیں، بلکہ یہ بات انہوں نے ملّا علی قاری کی شرح مشکوٰۃ کے حوالے سے نقل کی ہے، اور شرح مشکوٰۃ میں (جس پر اوپر بحث ہو چکی ہے) ہمارے فقہائے حنفیہ کا فتویٰ نقل نہیں کیا، بلکہ ابن حجر شافعی کا حوالہ نقل کیا ہے، جس پر اوپر بحث ہو چکی ہے۔ شاہ صاحب کے حوالے میں یہ افسوس ناک غلطی ہوئی ہے کہ متأخرین شافعیہ کے قول کو "ہمارے متأخرین اصحاب کا حدیث کی رو سے فتویٰ" بنا دیا گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

besturdubooks.wordpress.com

شاہ صاحب نے آگے حوالہ علامہ شامی رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے کہ: "انہوں نے اسے مستحب کہا ہے۔"

یہاں بھی نقل میں افسوس ناک تسامح پسندی سے کام لیا گیا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے بحر، درر اور شرح منیہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ قبرستان سے تر گھاس اور سبزہ کا اُکھاڑنا مکروہ ہے، اور "امداد" سے اس کی تعلیل نقل کی ہے کہ وہ جب تک تر رہے، اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتا ہے، پس میت اس سے اُنس حاصل کرتا ہے اور اس کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے، اس کی دلیل میں حدیث جریدہ نقل کر کے علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> "اس مسئلے سے اور اس حدیث سے قبر پر شاخ رکھنے کا استحباب اخذ کیا جاتا ہے بطور اتباع کے، اور اس پر قیاس کیا جاتا ہے کہ آس کی شاخیں وغیرہ رکھنے کو جس کی ہمارے زمانے میں عادت ہوگئی ہے، اور شافعیہ کی ایک جماعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، اور یہ اولیٰ ہے بہ نسبت بعض مالکیہ کے قول کے کہ قبروں کے عذاب کی تخفیف بہ برکت دست نبوی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ہوئی تھی، اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔"

علامہ شامی رحمہ اللہ کی اس عبارت میں پھول ڈالنے کا استحباب ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے بطور اتباع نبوی شاخ گاڑنے کا استحباب ذکر کیا جاتا ہے، اور اس کی علت وہی ذکر کی ہے جو امام تورپشتی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق قطعاً لاطائل اور "اہل مذہب کے نزدیک غیر معتبر" ہے، اور اس بے مقصد اور غیر معتبر تعلیل پر قیاس کرنا کس قدر بے مقصد اور غیر معتبر ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ اور علامہ شامی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ یہ تعلیل بعض مالکیہ کے قول سے اولیٰ ہے کہ یہ تخفیف عذاب شاخ کھجور کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی برکت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء شفاعت کی کرامت تھی۔ اوّل تو اس قول کو بعض مالکیہ کی طرف منسوب کرنا

besturdubooks.wordpress.com

بہت عجیب ہے، آپ سن چکے ہیں کہ ائمہ شافعیہ میں خطابی، مازری، نووی اور بعض دوسرے حضرات رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، اور ہمارے ائمہ احناف میں امام تورپشتی رحمہ اللہ نے اس کو سلف صالحین اہل علم کا قول کہا ہے اور اس کے مقابل قول کو "لا طائل تحتہ وغیر معتبر عند أهل العلم" فرمایا ہے۔ امام تورپشتی رحمہ اللہ کے ارشاد سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مذاہب اربعہ کے اہل علم اس تعلیل کو (جسے علامہ شامی اولیٰ کہہ رہے ہیں) غیر معتبر اور بے طائل سمجھنے پر متفق ہیں۔

علاوہ ازیں جس قول کو علامہ شامی رحمہ اللہ بعض مالکیہ کی طرف منسوب کرکے غیر اولیٰ کہہ رہے ہیں، اس کی تصریح حدیث جابر میں صراحۃً لسان نبوت سے منقول ہے:

"فأحببت بشفاعتي أن يرفّه ذلك عنهما ما
دام الغصنان رطبين." (صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۱۸)

ترجمہ: "پس میں نے چاہا کہ میری شفاعت کی بدولت ان
کے عذاب میں تخفیف ہو جب تک کہ شاخیں تر رہیں۔"

اس لئے تسبیح جریدہ کی تعلیل بمقابلہ نص کے سرے سے مردود ہے نہ کہ اولیٰ۔ کتنی عجیب بات ہے کہ فرمودۂ نبوی کو غیر اولیٰ کہا جائے، اور اس کے مقابلے میں بعض لوگوں کے بے سند تعلیل کو اولیٰ کہہ کر ان پر قیاسی تفریعات بٹھائی جائیں۔

اور اگر بالفرض یہ بات حدیث میں منقول نہ ہوتی، بلکہ بعض مالکیہ ہی نے کہی ہوتی، تب بھی عشاقِ رسولؐ کے لئے یہ بات کس قدر اذیت ناک ہے کہ تسبیح جریدہ کی تعلیل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی برکت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی کرامت سے اولیٰ کہا جائے۔

الغرض علامہ شامی رحمہ اللہ نے قول تو قبروں پر پھول ڈالنے کو مستحب نہیں کہا، بلکہ شاخ گاڑنے کا استحباب اخذ فرمایا ہے، اور پھر یہ استحباب بھی اس لا طائل اور بے سند تعلیل پر مبنی ہے جسے اہل علم غیر معتبر کہہ کر رد کرچکے ہیں۔

شاہ صاحب نے ایک حوالہ شیخ عبدالغنی نابلسی قدس سرہ کی "کشف النور" سے

نقل کیا ہے، یہ رسالہ اس ناکارہ کی نظر سے نہیں گزرا، تاکہ اس کے سیاق و سباق پر غور کیا جاتا، مگر اتنی بات واضح ہے کہ علامہ شامیؒ ہوں یا شیخ عبدالغنی نابلسیؒ، یہ سب کے سب ہماری طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، اور مقلد کا کام صاحبِ مذہب اور ائمہ مجتہدین کی نقل کی اتباع کرنا ہے، تقلید، خودرائی کا نام نہیں ہے، علامہ شامیؒ نے یا شیخ عبدالغنی نابلسیؒ نے یا کسی اور بزرگ نے اگر ہمارے ائمہ متبوعین سے کوئی نقل پیش کی ہے تو سر آنکھوں پر، ورنہ میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے الفاظ میں یہی عرض کرسکتا ہوں:

"اینجا قول امام ابی حنیفہ و امام ابی یوسف و امام محمد معتبر است نہ عمل ابی بکر شبلی و ابی الحسن نوری۔"

(مکتوبات امام ربانی، دفتر اول مکتوب نمبر:۲۶۶)

ترجمہ:... "یہاں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول معتبر ہے، نہ کہ ابوبکر شبلی اور ابوالحسن نوری کا عمل۔"

جناب شاہ صاحب قبلہ نے اس ہیچ مدان کے بارے میں جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں، ان کے بارے میں یہ عرض کرسکتا ہوں کہ:

بدم گفتی و خرسندم، نکو گفتی عفاک اللہ
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا[۱]

لیکن ان سے باادب عرض کروں گا کہ جہال اور عوام کی اختراع کردہ رسموں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہ بنائیں، (فداہ ابی وامی وروحی صلی اللہ علیہ وسلم)۔

آج اولیاء اللہ کے مزارات پر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں، نہ خیر القرون میں اس کا وجود تھا، بلکہ یہ شرالقرون کی پیداوار ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ کے بقول

"بسا اعمال و افعال و اوضاع کہ در زمان سلف از منکرات

(۱) مجھے برا کہا تو نے اور خوش ہوں میں، اچھی بات کہی تو نے، معاف کریں تجھے اللہ تعالیٰ.. تلخ جواب تو بہت جچتا ہے شکر چبانے لب معشوق کو۔

ہے، کیونکہ جہان دریائے بدعت میں غرق ہو چکا ہے، اور بدعت کی
تاریکیوں میں آرام پکڑے ہوئے ہے، کس کی مجال ہے کہ کسی
بدعت کے اٹھانے میں دم مارے، اور سنت کو زندہ کرنے میں لب
کشائی کرے؟ اس وقت کے اکثر علماء بدعت کو رواج دینے والے
اور سنت کو مٹانے والے ہیں، جو بدعات پھیل جاتی ہیں تو مخلوق کا
تعامل جان کر جواز بلکہ استحسان کا فتویٰ دے ڈالتے ہیں، اور بدعت
کی طرف لوگوں کی راہ نمائی کرتے ہیں۔"

besturdubooks.wordpress.com

ضمیمہ

(۴)

داڑھی کا مسئلہ

"سوال:... داڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے، واجب ہے یا سنت؟ اور داڑھی منڈانا جائز ہے یا مکروہ یا حرام؟ بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ داڑھی رکھنا ایک سنت ہے، اگر کوئی رکھے تو اچھی بات ہے اور نہ رکھے تب بھی کوئی گناہ نہیں، یہ نظریہ کہاں تک صحیح ہے؟

۲:... شریعت میں داڑھی کی کوئی مقدار مقرر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنی؟

۳:... بعض حفاظ کی عادت ہے کہ وہ رمضان مبارک سے کچھ پہلے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان المبارک کے بعد صاف کردیتے ہیں، ایسے حافظوں کو تراویح میں امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

۴:... بعض لوگ داڑھی سے نفرت کرتے ہیں اور اسے نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں، گھر والوں یا اعزہ میں سے کوئی داڑھی رکھنا چاہے تو اسے روکتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں، اور کچھ لوگ شادی کے لئے داڑھی صاف ہونے کی شرط لگاتے ہیں، ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے؟

۵:... بعض لوگ سفرِ حج کے دوران داڑھی رکھ لیتے ہیں اور حج سے واپسی پر صاف کرادیتے ہیں، اور بعض سفرِ حج میں بھی داڑھی

besturdubooks.wordpress.com

صاف کرتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کا حج صحیح ہے؟

۲:... بعض حضرات اس لئے داڑھی نہیں رکھتے کہ اگر ہم داڑھی رکھ کر کوئی غلط کام کریں گے تو اس سے داڑھی والوں کی بدنامی اور داڑھی کی بے حرمتی ہوگی۔ ایسے حضرات کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سائل:... صوفی محمد سکین کیش ایجنٹ

زکریا مسجد پاپوش نگر کراچی نمبر ۱۸

جواب سوالِ اوّل:... داڑھی منڈانا یا کترانا (جبکہ ایک مشت سے کم ہو) حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اس سلسلے میں پہلے چند احادیث لکھتا ہوں، اس کے بعد ان کے فوائد ذکر کروں گا۔

۱:... "عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ." الحديث. (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۲۹)

ترجمہ:... "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دس چیزیں فطرت میں داخل ہیں، مونچھوں کا کٹوانا اور داڑھی کا بڑھانا... الخ۔"

۲:... "عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللِّحَى."

وفي رواية: أَنَّهُ أَمَرَ بِإِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَإِعْفَاءِ اللِّحْيَةِ." (ایضاً)

ترجمہ:... "ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مونچھوں کو کتواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھوں کو کٹوانے اور داڑھی کو بڑھانے کا حکم فرمایا۔"

۳:... "عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خالفوا المشرکین، أوفروا اللحی واحفوا الشوارب۔" (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۳۸۰)

ترجمہ: "ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکوں کی مخالفت کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کتراؤ۔"

۴:... "عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: جزوا الشوارب وارخوا اللحی، خالفوا المجوس۔" (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۲۹)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مونچھیں کٹواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ، مجوسیوں کی مخالفت کرو۔"

۵:... "عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من لم یأخذ من شاربہ فلیس منا۔" (رواہ احمد والترمذی والنسائی، مشکوٰۃ ص:۳۸۱)

ترجمہ: "زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مونچھیں نہ کٹوائے وہ ہم میں سے نہیں۔"

۶:... "عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لعن اللہ المتشبھین من الرجال بالنساء والمتشبھات من النساء بالرجال۔"

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ ص:۳۸۰)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ کی لعنت ہو ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت کرتے ہیں، اور اللہ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت کرتی ہیں۔"

فوائد:

۱:... پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ مونچھیں کٹانا اور داڑھی بڑھانا انسان کی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے، اور مونچھیں بڑھانا اور داڑھی کٹانا خلافِ فطرت ہے، اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ فطرۃ اللہ کو بگاڑتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ شیطان لعین نے خدا تعالیٰ سے کہا تھا کہ میں اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا، اور میں ان کو حکم دوں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بگاڑا کریں۔ تفسیر حقانی اور بیان القرآن وغیرہ میں ہے کہ داڑھی منڈانا بھی تخلیقِ خداوندی کو بگاڑنے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مردانہ چہرے کو فطرتاً داڑھی کی زینت و وجاہت عطا فرمائی ہے۔ پس جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں وہ اغوائے شیطان کی وجہ سے نہ صرف اپنے چہرے کو بلکہ اپنی فطرت کو مسخ کرتے ہیں۔

چونکہ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ ہی صحیح فطرتِ انسانی کا معیار ہے، اس لئے فطرت سے مراد انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ اور ان کی سنت بھی ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مونچھیں کٹانا اور داڑھی بڑھانا ایک لاکھ چوبیس ہزار (کم و بیش) انبیائے کرام علیہم السلام کی متفقہ سنت ہے، اور یہ وہ مقدس جماعت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے: "اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ" (سورۃ الانعام: ۹۰) اس لئے جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے طریقے کی مخالفت کرتے ہیں۔ گویا اس حدیث میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ داڑھی منڈانا تین گناہوں کا مجموعہ ہے: ۱:... انسانی فطرت کی خلاف ورزی۔ ۲:... اغوائے شیطان سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بگاڑنا۔ ۳:... اور انبیائے کرام علیہم السلام کی مخالفت۔ پس ان تین وجوہ سے داڑھی منڈانا حرام ہوا۔

۲:... دوسری حدیث میں مونچھیں کٹانے اور داڑھی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے اور

besturdubooks.wordpress.com

حکمِ نبوی کی تعمیل ہر مسلمان پر واجب، اور اس کی مخالفت حرام ہے، پس اس وجہ سے بھی داڑھی رکھنا واجب اور اس کا منڈانا حرام ہوا۔

۳:... تیسری اور چوتھی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مونچھیں کٹوانا اور داڑھی رکھنا مسلمانوں کا شعار ہے، اس کے برعکس مونچھیں بڑھانا اور داڑھی منڈانا مجوسیوں اور مشرکوں کا شعار ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو مسلمانوں کا شعار اپنانے اور مجوسیوں کے شعار کی مخالفت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اسلامی شعار کو چھوڑ کر کسی گمراہ قوم کا شعار اختیار کرنا حرام ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔" (جامع صغیر ج:۲ ص:۸)

ترجمہ:... "جو شخص کسی قوم کی مشابہت کرے وہ انہیں میں سے ہوگا۔"

پس جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں وہ مسلمانوں کا شعار ترک کرکے اہلِ کفر کا شعار اپناتے ہیں، جس کی مخالفت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا، اس لئے ان کو وعید نبوی سے ڈرنا چاہئے کہ ان کا حشر بھی قیامت کے دن انہی غیر قوموں میں نہ ہو۔ نعوذ باللہ!

۴:... پانچویں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ مونچھیں نہیں کٹواتے وہ ہماری جماعت میں شامل نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہی حکم داڑھی منڈانے کا ہے، پس یہ ان لوگوں کے لئے بہت ہی سخت وعید ہے جو محض نفسانی خواہش یا شیطانی اغوا کی وجہ سے داڑھی منڈاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے اپنی جماعت سے خارج ہونے کا اعلان فرماتے ہیں، کیا کوئی مسلمان جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا بھی تعلق ہے، اس دھمکی کو برداشت کرسکتا ہے...؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو داڑھی منڈانے کے گناہ سے اس قدر نفرت تھی کہ جب شاہِ ایران کے قاصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔

"فکره النظر الیهما، وقال: ویلکما! من

أمرکما بھذا؟ قالا: أمرنا ربنا یعنیان کسری، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ولٰکن ربی أمرنی باعفاء لحیتی وقص شاربی۔"

(البدایہ والنہایہ ج:۳ ص:۲۶۹، حیاۃ الصحابہ ج:۱ ص:۱۱۵)

ترجمہ:... "پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر کرنا بھی پسند نہ کیا اور فرمایا: تمہاری ہلاکت ہو! تمہیں یہ شکل بگاڑنے کا کس نے حکم دیا ہے؟ وہ بولے کہ: یہ ہمارے رَبّ یعنی شاہِ ایران کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیکن میرے رَبّ نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کتروانے کا حکم فرمایا ہے۔"

پس جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رَبّ کے حکم کی خلاف ورزی کرکے مجوسیوں کے خدا کے حکم کی پیروی کرتے ہیں، ان کو سو بار سوچنا چاہئے کہ وہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیا منہ دِکھائیں گے؟ اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ: "تم اپنی شکل بگاڑنے کی وجہ سے ہماری جماعت سے خارج ہو" تو شفاعت کی اُمید کس سے رکھیں گے...؟

۵:... اس پانچویں حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مونچھیں بڑھانا اور اسی طرح داڑھی منڈانا اور کترانا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی گناہِ کبیرہ ہی پر ایسی وعید فرماسکتے ہیں کہ ایسا کرنے والا ہماری جماعت سے نکل ہے۔

۶:... چھٹی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت کریں اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت کریں۔ اس حدیث کی شرح میں مُلَّا علی قاری رحمہ اللہ صاحبِ مرقاۃ لکھتے ہیں کہ:

"لعن اللہ کا فقرہ، جملہ بطور بددُعا بھی ہوسکتا ہے یعنی ان لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو، اور جملہ خبریہ بھی ہوسکتا ہے، یعنی ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت فرماتے ہیں۔"

جیسا کہ آج کل بعض مغربی لوگ اور ان جیسے قسم کے آدمی کرتے ہیں، یہ بات
اس وجہ سے جائز نہیں کہ اور پوری داڑھی صاف کر دینا تو
ہندوستان کے یہودیوں اور عجم کے مجوسیوں کا فعل تھا۔"

یہی مضمون فتح القدیر (ج:۲ ص:۲۷۰) اور بحر الرائق (ج:۲ ص:۳۰۲) میں ہے۔
شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ "اشعۃ اللمعات" میں لکھتے ہیں:

"حلق کردن لحیہ حرام است و گزاشتن آں بقدر قبضہ
واجب است۔" (ج:۱ ص:۲۲۸)

ترجمہ:... "داڑھی منڈانا حرام ہے، اور ایک مشت کی
مقدار اس کو بڑھانا واجب ہے (پس اگر اس سے کم ہو تو حرام بھی
حرام ہے)۔"

امداد الفتاویٰ میں ہے:

"داڑھی رکھنا واجب ہے، اور قبضہ سے زائد کٹوانا حرام
ہے۔ لقولہ علیہ السلام: خالفوا المشرکین اوفروا اللحی
متفق علیہ۔ فی الدر المختار: یحرم علی الرجل قطع لحیتہ
وفیہ السنۃ فیہا القبضۃ۔" (ج:۴ ص:۲۲۳)

ترجمہ:... "کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
کہ مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی بڑھاؤ۔ (بخاری و مسلم) اور درمختار
میں ہے کہ مرد کے لئے داڑھی کا کاٹنا حرام ہے اور اس کی مقدار
مسنون ایک مشت ہے۔"

جواب سوال سوم:... جو حفاظ داڑھی منڈاتے یا کتراتے ہیں، وہ گناہِ کبیرہ کے
مرتکب اور فاسق ہیں۔ تراویح میں بھی ان کی امامت جائز نہیں، اور ان کی اقتدا میں نماز
مکروہ تحریمی (یعنی تقریباً حرام) ہے۔ اور جو حافظ صرف رمضان المبارک میں داڑھی رکھ لیتے
ہیں اور بعد میں صاف کرا دیتے ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ایسے شخص کو فرض نماز و تراویح

besturdubooks.wordpress.com

میں، امام بنانے والے بھی فاسق اور گنہگار ہیں۔

جواب سوالِ چہارم:... اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے یہ اصول ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ اسلام کے کسی شعار کا مذاق اڑانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت کی تحقیر کرنا کفر ہے، جس سے آدمی ایمان سے خارج ہوجاتا ہے۔ اور یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کو اسلام کا شعار اور انبیائے کرام علیہم السلام کی متفق سنت فرمایا ہے، پس جو لوگ مسخ فطرت کی بنا پر داڑھی سے نفرت کرتے ہیں، اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے اعزہ میں سے اگر کوئی داڑھی رکھنا چاہے تو اسے روکتے ہیں یا اس پر طعنہ زنی کرتے ہیں، اور جو لوگ دولہا کے داڑھی منڈائے بغیر رشتہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ایسے لوگوں کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے، ان کو لازم ہے کہ توبہ کریں اور اپنے ایمان اور نکاح کی تجدید کریں۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی "اصلاح الرسوم" ص:۱۵ میں لکھتے ہیں:

> "من جملہ ان رسوم کے داڑھی منڈانا یا کٹانا، اس طرح کہ ایک مشت سے کم رہ جائے، یا مونچھیں بڑھانا، جو اس زمانے میں اکثر نوجوانوں کے خیال میں خوش وضعی سمجھی جاتی ہے، حدیث میں ہے کہ: "بڑھاؤ داڑھی کو اور کترواؤ مونچھوں کو" (روایت کیا ہے اس کو بخاری و مسلم نے)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ امر سے دونوں حکم فرمائے ہیں، اور امر حقیقتاً وجوب کے لئے ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں حکم واجب ہیں، اور واجب کا ترک کرنا حرام ہے، پس داڑھی کا کٹانا اور مونچھیں بڑھانا دونوں فعل حرام ہیں، اس سے زیادہ دوسری حدیث میں مذکور ہے، ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: "جو شخص اپنی لبیں نہ لے وہ ہمارے گروہ سے نہیں۔" (روایت کیا اس کو احمد و ترمذی و نسائی نے) جب اس کا گناہ ہونا ثابت ہوگیا تو جو لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں، اور داڑھی

besturdubooks.wordpress.com

بڑھانے کو عیب جانتے ہیں، بلکہ داڑھی والوں پر ہنستے ہیں اور ان کی ہجو کرتے ہیں۔ ان سب مجموعۂ امور سے ایمان کا سالم رہنا از بس دشوار ہے۔ ان لوگوں کو واجب ہے کہ اپنی اس حرکت سے توبہ کریں اور ایمان اور نکاح کی تجدید کریں اور اپنی صورت موافق حکم اللہ اور رسول کے بناویں۔"

جواب سوال پنجم ... جو حضرات سفرِ حج کے دوران یا حج سے واپس آکر داڑھی منڈاتے ہیں یا کترواتے ہیں، ان کی حالت عام لوگوں سے زیادہ قابلِ رحم ہے، اس لئے کہ وہ خدا کے گھر میں بھی گناہ سے باز نہیں آتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی حج مقبول ہوتا ہے جو گناہوں سے پاک ہو، اور بعض اکابر نے حج مقبول کی علامت یہ لکھی ہے کہ حج سے آدمی کی زندگی میں دینی انقلاب آجائے یعنی وہ حج کے بعد طاعات کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے۔ جس شخص کی زندگی میں حج سے کوئی تغیر نہیں آیا، اگر پہلے فرائض کا تارک تھا تو اب بھی ہے، اور اگر پہلے کبیرہ گناہوں میں مبتلا تھا تو حج کے بعد بھی بدستور گناہوں میں ملوث ہے، ایسے شخص کا حج درحقیقت حج نہیں محض سیر و تفریح اور چلت پھرت ہے، گو فقہی طور پر اس کا فرض ادا ہوجائے گا، لیکن حج کے ثواب اور برکات و ثمرات سے وہ محروم رہے گا۔ کتنی حسرت و افسوس کا مقام ہے کہ آدمی ہزاروں روپے کے مصارف بھی اٹھائے، اور سفر کی مشقتیں بھی برداشت کرے، اس کے باوجود اسے گناہوں سے توبہ کی توفیق نہ ہو، اور جیسا گیا تھا ویسا ہی خالی ہاتھ واپس آجائے۔ اگر کوئی شخص سفرِ حج کے دوران زنا اور چوری کا ارتکاب کرے، اور ساتھ ہی اپنے اس فعل پر ندامت بھی نہ ہو اور نہ اس سے توبہ کرے تو ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ اس کا حج کیسا ہوگا؟ داڑھی منڈانے کا کبیرہ گناہ ایک اعتبار سے چوری اور بدکاری سے بھی بدتر ہے کہ وہ وقتی گناہ ہیں، لیکن داڑھی منڈانے کا گناہ چوبیس گھنٹے کا گناہ ہے، آدمی داڑھی منڈا کر نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، حج کا احرام باندھے ہوئے ہے، لیکن اس کی منڈی ہوئی داڑھی عین نماز، روزہ اور حج کے دوران بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس پر لعنت بھیج رہی ہے، اور وہ عین عبادت کے دوران بھی حرام کا

مرتکب ہے۔ حضرت شیخ قطب العالم مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی نور اللہ مرقدہ اپنے رسالے "ڈاڑھی کا وجوب" میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے ایسے لوگوں کو (جو ڈاڑھی منڈاتے ہیں) دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اور اس حالت میں (جبکہ ڈاڑھی منڈی ہوئی ہو) اگر موت واقع ہوئی تو قبر میں سب سے پہلے سید الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور کی زیارت ہوگی تو کس منہ سے چہرۂ انور کا سامنا کریں گے؟

اس کے ساتھ ہی بار بار یہ خیال آتا تھا کہ گناہ کبیرہ زنا، لواطت، شراب نوشی، سود خوری وغیرہ تو بہت ہیں، مگر وہ سب وقتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن .... الخ"　　　(مشکوٰۃ، ص: ۱۷)

ترجمہ:۔ "یعنی جب زنا کار زنا کرتا ہے تو اس وقت مؤمن نہیں ہوتا۔"

مطلب اس حدیث کا مشائخ نے یہ لکھا ہے کہ: زنا کے وقت ایمان کا نور اس سے جدا ہو جاتا ہے، لیکن زنا کے بعد وہ نور ایمانی مسلمان کے پاس واپس آ جاتا ہے۔ مگر قطع لحیہ (ڈاڑھی منڈانا اور کترانا) ایسا گناہ ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ نماز پڑھتا ہے تو بھی یہ گناہ ساتھ ہے، روزے کی حالت میں، حج کی حالت میں، غرض ہر عبادت کے وقت یہ گناہ اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔"

(ڈاڑھی کا وجوب، ص ۲)

لہٰذا جو حضرات حج و زیارت کے لئے تشریف لے جاتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے پہلے مسنون شکل بنا

ان حضرات نے آخر یہ کیوں فرض کرلیا ہے کہ ہم داڑھی رکھ کر بیٹھ گئے تو [illegible]
نہیں چھوڑیں گے؟ مگر ان سے ایک بات ضرور کہوں گا کہ اگر یہ شعارِ اسلام کی حرمت ہے تو عقل و دین
کا تقاضا یہ ہے کہ وہ داڑھی رکھیں، اور یہ عزم کریں کہ ان شاء اللہ اس کے بعد کوئی بیہودہ
ان سے سرزد نہیں ہوگا، اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس شعارِ اسلام کی حرمت کی لاج
رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ بہرحال اس موہوم اندیشے کی بنا پر کہ ہم داڑھی رکھ کر اس
کی حرمت کے تقاضے پورے کرنے میں کامیاب نہ ہوں، اس عظیم الشان شعارِ اسلام سے محروم ہوجانا
کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں کو لازم ہے کہ شعارِ اسلام کو خود بھی
اپنائیں، اور معاشرے میں اس کو زندہ کرنے کی پوری کوشش کریں تاکہ قیامت کے دن
مسلمانوں کی شکل وصورت میں ان کا حشر ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت
اور حق تعالیٰ شانہ کی رحمت کا مورد بن سکیں۔

"عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال: کل امتی یدخلون الجنۃ الا
من ابی۔ قالوا: ومن یابی؟ قال: من اطاعنی دخل الجنۃ،
ومن عصانی فقد ابی۔" (صحیح بخاری ج:۲ ص:۱۰۸۱)

ترجمہ:... "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے سارے
لوگ جنت میں جائیں گے مگر جس نے انکار کردیا۔ صحابہ رضی اللہ
عنہم اجمعین نے عرض کیا کہ انکار کون کرتا ہے؟ فرمایا: جس نے
میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری حکم
عدولی کی اس نے انکار کردیا۔"

"دوسرا اعتراض مولانا مودودی کے خلاف یہ ہے کہ وہ مشت بھر داڑھی کو مسنون نہیں سمجھتے، حالانکہ اس پر اجماعِ امت ہے۔ اس اعتراض کا بھی جواب دینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی اصل عبارت سامنے رکھی جائے۔ مولانا نے رسائل و مسائل حصہ اول میں لکھا ہے۔

"داڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی، صرف یہ ہدایت فرمائی کہ رکھی جائے۔ آپ اگر داڑھی رکھنے میں فاسقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور اتنی داڑھی رکھ لیں جس پر عرفِ عام میں داڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہو (جسے دیکھ کر کوئی شخص اس شبہ میں مبتلا نہ ہو کہ شاید چند روز سے آپ نے داڑھی نہیں مونڈی ہے) تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے، خواہ آپ فقہی استنباطی شرائط پر پوری اترے یا نہ اترے۔"

اس امر سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کی کسی خاص مقدار کی تعیین فرمائی ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم عام ہے کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ۔ جہاں تک اس حکم کی بجاآوری کی عملی صورت کا تعلق ہے، اس میں استنباط سے کام لیا گیا ہے اور استنباط میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک داڑھی کو بلا نہایت بڑھانا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا مقتضائے سنت ہے، بعض کے نزدیک ایک مشت بھر داڑھی مسنون ہے اور لمبی داڑھی مکروہ ہے، بعض کے نزدیک کوئی خاص حد مقرر نہیں، بس داڑھی رکھنا مشروع ہے۔ جو حضرات ایک مشت داڑھی کو مسنون کہتے ہیں ان کا ماخذ اکثر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل پر ہے کہ وہ مٹھی سے زائد داڑھی کو

besturdubooks.wordpress.com

کرتے ہوئے امام طبری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"فقد ثبت الحجة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی خصوص هذا الخبر أن اللحیة محظور إعفاؤها وواجب قصها علی اختلاف من السلف فی قدر ذلک وحده فقال بعضهم حد ذلک أن یزاد علی قدر القبضة طولا وأن ینتشر عرضها فیقبح ذلک .... وقال آخرون یأخذ من طولها وعرضها ما لم یفحش أخذه ولم یحدوا فی ذلک حدا."

ترجمہ... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی بالکل ثابت ہے کہ داڑھی بڑھانے سے متعلق حدیث کا حکم عام نہیں، بلکہ اس میں تخصیص ہے اور داڑھی کا اپنے حال پر چھوڑ دینا ممنوع اور اس کا ترشوانا واجب ہے، البتہ سلف میں اس کی مقدار اور حد کے معاملے میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کی حد یہ ہے کہ وہ لمبائی میں ایک قبضے سے بڑھ جائے اور چوڑائی میں بھی پھیل جائے کہ جس سے بری معلوم ہو..... بعض دیگر اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ لمبائی اور چوڑائی میں کم کرے بشرطیکہ بہت چھوٹی نہ ہو جائے انہوں نے اس بارے میں کوئی حد مقرر نہیں کی۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"البتہ اس کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ داڑھی کا ترشوانا اس حد تک جائز ہے کہ وہ عرف عام سے خارج نہ ہو جائے"

اب اگر ایک شخص انصاف کی نظر سے اور تعصب سے خالی ہو کر دیکھے تو وہ خود بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا مودودی کی مذکورہ بالا عبارت اور عمدۃ القاری کی اس عبارت میں کتنا فرق ہے؟

کوئی منصف مزاج یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ داڑھی کو غیر اہم سی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی جن تحریروں سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، وہ ان علماء و مشائخ کے مقابلے میں لکھی گئی ہیں جنھوں نے داڑھی کے طول و عرض کو پورے دین کے طول و عرض کا پیمانہ سمجھ رکھا ہے۔ اس مسئلے میں ان کی جو انفرادی رائے ہے، وہ یہ ہے کہ شرعاً اس کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، اس لئے کم از کم ایک قبضے کی مقدار کو سنتِ مؤکدہ یا واجب کہنا صحیح نہیں ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے جماعتِ اسلامی کا کوئی رکن ایسا نہیں ہے جو داڑھی رکھنے ہی کو غیر اہم سمجھتا ہو۔

مکتوب نگار نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی کہ اگر مولانا مودودی کے نزدیک داڑھی رکھنا غیر اہم ہوتا تو پھر ان سے متأثر ارکان کو زبردستی داڑھی رکھنے پر بھی کون سی چیز مجبور کرتی؟ اور سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ لوگ جو پہلے داڑھیاں منڈواتے تھے، اب داڑھیاں کیوں رکھنے لگے؟ یہ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مقدار کے مسئلے میں بہت سے ارکان مولانا کی رائے سے متأثر ہیں، لیکن یہ سمجھنا کہ اس مسئلے میں تمام ارکان ان کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ پاکستان کا حال تو مجھے نہیں معلوم، لیکن جماعتِ اسلامی ہند جو اب ایک مستقل بالذات تنظیم ہے، اس کے متعدد ارکان مولانا کی تحریریں پڑھنے کے باوجود ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ راقم الحروف کو بھی مولانا کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ مکتوب نگار چونکہ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا چاہتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس مسئلے میں اپنی رائے تفصیل سے عرض کروں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ذیل میں چند نکات درج کئے جارہے ہیں، انہیں کے تحت اظہارِ خیال ہوگا۔

۱:... اعفائے لحیہ کا حکم کیوں دیا گیا؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا منشا کیا ہے؟

۲:... اعفاء کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کے ہم معنی دوسرے کون سے الفاظ مروی ہیں؟

۳:... مقدارِ لحیہ کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۴:... اعفائے لحیہ کا حکم اپنے عموم پر ہے یا اس میں تخصیص بھی ہوئی ہے؟

۵:... کیا تخصیص کے قائل فقہاء میں سے کوئی فقیہ ایک مشت سے کم مقدار کو بھی

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مباح قرار دیا جاتا ہے؟

۴... مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی رائے پر اظہار خیال۔

ا... لحیہ اور مقدار لحیہ کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعفائے لحیہ کا حکم دیا، اس وقت آپ خود داڑھی رکھتے تھے، بلکہ عرب کے قریبی ممالک میں بھی داڑھی مونڈنے کا رواج نہ تھا، تمام کے تمام لوگ اس کو مرد اور عورت کے چہروں کے درمیان وجہ الامتیاز سمجھتے تھے اور مردانگی و مردانہ حسن کی علامت قرار دیتے تھے، طبعی طور پر کسی کے چہرے پر داڑھی نہ نکلنے یا عمداً اسے مونڈ دینے کو عیب سمجھا جاتا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے ماحول میں داڑھی بڑھانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ اور اس کا منشا کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک حدیث دیتی ہے جو لحیہ اور مقدار لحیہ دونوں ہی کی شرعی حیثیت جاننے کے لئے ایک بنیادی اور اہم حدیث ہے:

"عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَأَرْخُوا اللِّحَى، خَالِفُوا الْمَجُوْسَ۔" (مسلم شریف ج:۱ ص:۱۲۹)

ترجمہ... "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں لمبی کرو (اور اس طرح) مجوس کی مخالفت کرو۔"

یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں مروی ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللِّحَى وَأَحْفُوا الشَّوَارِبَ۔" (بخاری شریف، کتاب اللباس ج:۲ ص:۸۷۵)

ترجمہ... "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی

besturdubooks.wordpress.com

اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیاں خوب بڑھاؤ اور مونچھوں کے بال
کاٹ کر کم کرو۔"

اس حدیث میں مشرکین کا لفظ مجوس ہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے، علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"خالفوا المشركين أراد بهم المجوس يدل
عليه رواية مسلم خالفوا المجوس."

ترجمہ..... "مشرکین سے مراد مجوس ہیں، اس بات پر مسلم
کی روایت خالفوا المجوس دلیل ہے۔"

اس حدیث سے وہ وجہ معلوم ہوئی جس کی بنا پر اعفائے لحیہ کا حکم دیا گیا، عرب کے پڑوسی ممالک میں سب سے پہلے فارس کے مجوسیوں نے اس مردانہ حسن (داڑھی) پر حملہ کیا، چونکہ اس وقت تک داڑھی مونڈنے کو عیب شمار کیا جاتا تھا، اس لئے مجوسیوں نے اپنے اندر یک لخت داڑھیاں مونڈنے کی ہمت نہ پائی، اور ابتداءً وہ اپنی داڑھیاں چھوٹی کرنے لگے اور رفتہ رفتہ ان میں کچھ لوگ اپنی داڑھیاں مونڈنے بھی لگے۔ عین ممکن ہے کہ مجوسیوں سے متاثر ہوکر جزیرۃ العرب کے کچھ مشرکین بھی داڑھیاں چھوٹی کرنے یا مونڈنے لگے ہوں، اگرچہ اس وقت مسلمان داڑھی رکھ رہے تھے لیکن چونکہ اس کی دینی و شرعی حیثیت واضح نہ تھی، خطرہ تھا کہ کہیں آگے چل کر ان میں بھی یہ مجوسی تہذیب سے متاثر نہ ہو جائیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم سے اس کی شرعی حیثیت واضح فرمادی اور مسلمانوں کو خصوصیت سے اس معاملے میں مجوس کی مخالفت کا حکم دیا ہے، داڑھی کا معاملہ محض رواج اور عادت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ یہ اسلامی معاشرے کا ایک شعار اور اسلامی تہذیب کا ایک نشان ہے۔

یہ بات تمام مورخین لکھتے ہیں کہ اس وقت مجوس عام طور پر داڑھیاں مونڈتے نہ تھے، بلکہ چھوٹی کراتے تھے، بادشاہ کے وقت میں جب پہلوؤں نے داڑھیاں مونڈنی تو

ارجاء، ارخاء، توفیر۔ کسی حدیث میں "اعفوا" ہے، کسی میں "اوفوا"، کسی میں "ارجوا"، کسی میں "ارخوا" اور کسی میں "وفروا"۔

ان سب الفاظ کے بارے میں نووی لکھتے ہیں:

"ومعناها كلها تركها على حالها."

ترجمہ:... "اور ان سب الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔"

حافظ ابن حجر "وفروا" کے معنی بیان کرتے ہیں: "اتركوها وافرة" (داڑھی چھوڑ دو اپنی حال کہ وہ وافر ہو)، "اوفوا" کے معنی بیان کرتے ہیں "اتركوها وافية" (اسے چھوڑ دو اپنی حال کہ وہ پوری ہو)، "ارخوا" کے معنی بتاتے ہیں: "اطيلوها" (داڑھی لمبی کرو)، "اعفاء" کے معنی امام بخاری اور دوسرے محدثین نے تکثیر کے بیان کئے ہیں، اسی سلسلے میں ابن دقیق العید لکھتے ہیں:

"تفسير الاعفاء بالتكثير من اقامة السبب مقام المسبب لان حقيقة الاعفاء الترك وترك التعرض اللحية يستلزم تكثيرها." (فتح الباری ج:۱۰)

ترجمہ:... "اعفاء کی تفسیر تکثیر سے کرنا اس اصول کے تحت ہے کہ سبب کو مسبب کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے، کیونکہ اعفاء کی حقیقت ترک کرنا ہے، اور جب داڑھی سے تعرض ترک کیا جائے گا تو لازماً اس میں تکثیر ہوگی۔"

یہ تمام الفاظ اور ان کی تشریحات صاف بتاتی ہیں کہ حدیث کا منشا محض داڑھی رکھ لینا نہیں ہے، بلکہ اس کو بڑھانا اور لمبا کرنا ہے۔

۳:... اب آئیے اس پر غور کریں کہ مقدار لحیہ کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

علمائے اصول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں:

علیہ وسلم کی ریش مبارک میں بال بہت تھے۔ کسی روایت میں یہ آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم "کث اللحیۃ" تھے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک گھنی تھی، اور کسی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھنی داڑھی آپ کے مبارک سینے کو بھرے ہوئے تھی، اور کسی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "عظیم اللحیۃ" کہا گیا ہے، یعنی آپ کی داڑھی بڑی تھی، یہی بات سیر وسوانح کی کتابوں میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی داڑھیوں کے بارے میں بھی لکھی ہے، مدارج النبوۃ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ریش امیر المومنین علی پُر می کرد سینہ را، وہم چنیں بود ریش امیر المومنین عمر وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نیز۔"

ترجمہ: "امیر المومنین علی کی داڑھی ان کے سینے کو بھر دیتی تھی، اسی طرح امیر المومنین عمر وعثمان رضی اللہ عنہما کی داڑھیاں ان کے سینوں کو بھر دیتی تھیں۔"

حضرت عمرؓ کے بارے میں کہا گیا ہے: "کان کث اللحیۃ"۔ (الاستیعاب)

حضرت عثمانؓ کے بارے میں ہے "کان عظیم اللحیۃ"۔ (اصابہ)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی گھنی اور مقدار لحیہ کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وافر ہو اور اس پر ضخیم وغیرہ کا لفظ صادق آئے۔

س:... "اعفوا اللحی" کا حکم اپنے عموم پر ہے یا اس میں تخصیص بھی ہوئی ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت اس حکم کو عموم پر رکھتی ہے اور اس میں تخصیص کی قائل نہیں ہے۔

طبری نے کہا ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت ظاہر حدیث کی طرف گئی ہے اور ان کے نزدیک داڑھی کے طول وعرض سے کچھ حصہ کٹانا بھی مکروہ ہے۔ (فتح الباری ج:۱۰)

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اسی جانب کی تصحیح کی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ھذا ھو الظاھر من الحدیث الذی تقتضیہ ألفاظہ وھو الذی قالہ جماعۃ من أصحابنا وغیرھم من

یَفْعَلَهُ." (ج:۱، ص ۳۹۰)

ترجمہ... "حدیث سے یہی ظاہر ہے، اور یہی ان کے الفاظ کا اقتضاء ہے اور یہی ہمارے اصحاب کی ایک جماعت اور دوسرے علماء کا قول ہے۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"وَالْمُخْتَارُ تَرْکُ اللِّحْیَةِ عَلٰی حَالِهَا وَأَنْ لَا یُتَعَرَّضَ لَهَا بِتَقْصِیْرِ شَیْءٍ أَصْلًا." (ج:۱، ص ۱۲۹)

ترجمہ... "مختار قول یہی ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کیا جائے۔"

صاحب تحفۃ الاحوذی تخصیص کے قائلین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فَأَسْلَمُ الْأَقْوَالِ هُوَ قَوْلُ مَنْ قَالَ بِظَاهِرِ أَحَادِیْثِ الْإِعْفَاءِ وَکَرِهَ أَنْ یُؤْخَذَ شَیْءٌ مِّنْ طُوْلِ اللِّحْیَةِ وَعَرْضِهَا." (تحفۃ الاحوذی)

ترجمہ... "ان لوگوں کا قول محفوظ ترین قول ہے جو احادیث اعفاء کے ظاہر کی وجہ سے داڑھی کے طول و عرض میں کچھ حصہ لینے کو بھی مکروہ کہتے ہیں۔"

علامہ شوکانی کا مسلک بھی وہی ہے جو امام نووی کا ہے، وہ بھی حدیث کے عموم کے قائل ہیں، وہ حضرت ابن عمر کے عمل کو حجت نہیں مانتے اور عمرو بن شعیب کی حدیث کو قابل احتجاج نہیں سمجھتے۔ (نیل الاوطار ج:۱ ص ۱۲۳)

اس جماعت کی دلیل یہ ہے کہ حدیث کے عموم کو خاص کرنے والی کوئی چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہے اور نہ فعل سے، قول حدیث میں تو موجود ہی نہیں ہے، اور فعل کی حدیث ضعیف ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تخصیص کا قول اس درجہ ثابت شدہ نہیں ہے کہ تمام

کچھ لوگ کتراتے ہیں اور اسے ہلکی کر دیتے ہیں، اس مقدار میں اختلاف ہے جو
کتروایا جائے۔ (۱) ایک جماعت کے نزدیک حج یا عمرے کے علاوہ
کسی وقت بھی داڑھی کے بال کتروانا ناپسندیدہ اور مکروہ فعل ہے، امام
طبری نے خود حضرت عطاء کے قول کو اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:
اگر کوئی شخص اپنی داڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے اور اس سے
مطلق تعرض نہ کرے یہاں تک کہ اس کا طول وعرض فاحش (بہت
زیادہ) ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو لوگوں کے تمسخر کا ہدف بنالے گا۔
طبری نے اس مسئلے میں عمرو بن شعیب کی اس حدیث سے استدلال
کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک کے طول وعرض سے
کچھ بال کترواتے تھے۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے لیکن بخاری
نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے، اس لئے کہ اس حدیث کے ایک
راوی عمر بن ہارون ہیں، اور ان کو محدثین کی ایک جماعت نے ضعیف
قرار دیا ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ: داڑھی کو مونڈنا، کتروانا اور کم
کرانا مکروہ ہے، ہاں! اگر طول وعرض بہت بڑھ جائے تو اطراف
سے کچھ کتروا لینا اچھا ہے، بلکہ جس طرح تقصیر (بہت چھوٹا کرانا) مکروہ
ہے، اسی طرح تعظیم (بہت بڑھا دینا) بھی مکروہ ہے، لیکن نووی نے
قاضی عیاض کی یہ بات رد کردی ہے، اور کہا ہے کہ: یہ قول ظاہر
حدیث کے خلاف ہے، اس لئے کہ حدیث میں توفیر لحیہ (داڑھی
بڑھانے) کا حکم ہے، مختار مسلک یہ ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر
چھوڑ دیا جائے اور اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ نووی کی مراد یہ
ہے کہ حج یا عمرے کے علاوہ دوسرے اوقات میں تعرض نہ کیا جائے،
اس لئے کہ امام شافعی نے حج یا عمرے میں داڑھی کے کچھ بال
کٹوانے کو مستحب کہا ہے۔" (فتح الباری ج: ۱۰ باب تقلیم الاظفار)

besturdubooks.wordpress.com

داڑھی نہ چھوڑے، بلکہ اس سے کچھ نہ کچھ کٹوا دے۔ امام مالکؒ داڑھی کے بہت لمبا ہونے کو مکروہ سمجھتے تھے، اور ان میں کچھ لوگوں نے طول کی ایک قبضہ مقرر کی ہے، اس سے زیادہ کٹوا دیا جائے، اور ان میں سے کچھ لوگوں نے حج یا عمرے کے سوا کسی اور وقت داڑھی کے بال کٹوانے کو مکروہ کہا ہے۔"

قاضی عیاضؒ نے پہلی جس جماعت کا ذکر کیا ہے، حسن بصریؒ اور عطاءؒ بھی اسی میں داخل ہیں۔ اسی جماعت کے مسلک کو حافظ ابن حجرؒ نے طبریؒ کے حوالے سے حسن بصریؒ و عطاءؒ کی طرف منسوب کیا ہے، اور علامہ عینیؒ نے طبریؒ ہی کے حوالے سے حضرت عطاءؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فقہائے سلف میں اختلاف یہ تھا کہ طول لحیہ کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلے میں صرف دو ہی قول ہیں، ایک یہ کہ طول لحیہ کی حد ایک مشت ہونی چاہئے، اور دوسرا یہ کہ ایک مشت پر انحصار صحیح نہیں، داڑھی اس سے بھی لمبی ہو سکتی ہے، لیکن اتنی لمبی نہ ہو جائے کہ حد شہرت تک پہنچ کر مضحکہ خیز بن جائے۔

سلف میں سے کسی کے خیال میں بھی شاید یہ بات نہ ہوگی کہ داڑھی کی مقدار ایک مشت سے بھی کم جائز قرار پا سکتی ہے، ان میں سے کسی کی صراحت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے...؟

دو جماعتوں کے مسلک کی توضیح ہو چکی ہے، ایک جماعت تو وہ جو حدیث کے عموم میں کسی تخصیص کی قائل ہی نہیں ہے، دوسری وہ جو حد شہرت تک داڑھی کے طول و عرض کو بڑھا دینے کی مخالف ہے۔ تیسری جماعت وہ ہے جو داڑھی کے طول کو ایک مشت تک محدود کرتی ہے، اس کا خیال ہے کہ ایک مشت سے زائد جو مقدار ہو اسے کاٹ دینا چاہئے۔ اس مسلک کی بھی تھوڑی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے، کیونکہ عام طور پر فقہائے احناف بھی ایک مشت کی مقدار کو مسنون کہتے ہیں۔

میرے مطالعے سے جو نتائج اب تک گزرے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مشت کے قائلین دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، ان میں کا چھوٹا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک مشت سے زائد مقدار کو کٹوا دینا ضروری اور واجب ہے، دوسرا گروہ کہتا

besturdubooks.wordpress.com

انتقیہ نہ کریں۔" (ص:۲۲۸)

۳:... "نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے اس کا تعلق "عادتِ رسول" سے ہے۔" (ص:۲۳۶، ایضاً ص:۲۳۲)

اسی کی توضیح کے لئے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"رہا یہ سوال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھنے کا حکم دیا اور اس حکم پر خود ایک خاص طرز کی داڑھی رکھ کر اس کی عملی صورت بتادی، لہٰذا حدیث میں حضورؐ کی جتنی داڑھی مذکور ہے اتنی ہی اور ویسی ہی داڑھی رکھنا سنت ہے، تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ نے سترِ عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لئے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کرکے بتادیا، لہٰذا اسی طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سنت ہے۔" (ص:۲۳۹)

۵:... "صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔" (ص:۱۴۰)

۶:... "داڑھی کی حدود و مقدار، بہرحال علماء کی ایک استنباطی چیز ہے۔" (ص:۱۴۵)

یہ تمام حوالے میں نے "رسائل و مسائل" حصہ اول سے لئے ہیں، جسے مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند نے شائع کیا ہے۔ اب میں نمبروار ان پر اظہارِ خیال کرتا ہوں۔

۱:... یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے، مولانا مدظلہ نے اپنی تحریروں میں اس طرح بار بار دہرائی ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کسی شے کی مقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے بغیر شرعاً متعین ہوہی نہیں سکتی، حالانکہ یہ اصول کسی اختلاف کے بغیر مسلّم ہے کہ مقدار کی تعیین، دراجمال کی تبیین جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوتی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے بھی ہوتی ہے، اور بیسیوں مجمل احکام کے بیان اور متعدد مقادیر کے تعین کے لئے نبی صلی اللہ

ابن درید کی "جمهرة اللغة" میں ہے:

"عفا شعره إذا كثر عفى النبت والشعر وغيره: كثر وطال وفي الحديث انه صلى الله عليه وسلم امر باعفاء اللحى وهو ان يوفر شعرها ويكثر ولا يقص كالشوارب. العافي الطويل الشعر، ويقال للشعر إذا طال ووفى عفاء."

قاموس میں ہے:

"عفى شعر البعير كثر وطال فغطى دبره، أعفى اللحية: وفرها."

ان تصریحات سے بھی معلوم ہوا کہ عفی اور اعفی کے صیغے جب بالوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا کثیر ہونا، وافر اور طویل ہونا، ان صیغوں کی لغوی حیثیت میں داخل ہے، اس لئے "اعفوا اللحی" کے ارشاد نبوی سے یہ سمجھنا کہ اس میں صرف داڑھی رکھ لینے کی ہدایت ہے، لغوی معنی کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

۶۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو سامنے رکھ کر اگر کوئی شخص مولانا کا یہ ارشاد پڑھے گا کہ "مقدار یک مشت داڑھی ایک استنباطی چیز ہے" تو اس بات پر یقین کرنے میں سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ جو چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل نیز خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہو، آخر کس طرح کوئی شخص اس کو محض علماء کا استنباط سمجھ سکے؟ ایک مشت سے اوپر داڑھی کے بال کٹوانے کو علماء جو ناجائز کہتے ہیں، تو اس کی وجہ محض استنباط نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ائمہ فقہ کے استنباطی احکام کے بارے میں عموم و اطلاق کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کی حیثیت منصوص احکام کی نہیں ہے، صحیح نہیں ہے۔ ایسے استنباطی احکام کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی حیثیت منصوص احکام سے کم نہیں ہے۔

مغربی پاکستان کے علماء میں چونکہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی ایک تحریر کا ذکر

besturdubooks.wordpress.com

کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ جس پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی، اس کے پیش نظر اس حدیث کا مفاد واضح ہے، یہاں
اس کا ذکر ضروری ہے کہ علامہ عینیؒ نے حضرت عطاءؒ کا جو مسلک نقل کیا ہے اس میں اور ابن
عمرؓ وغیرہ کے مسلک میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔ فتح الباری میں حضرت حسن بصریؒ
کا قول نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے: "وقال عطاء نحوه" (اور عطاء نے بھی اسی طرح کی
بات کہی ہے جیسی حسن بصریؒ نے) عطاء کا مسلک عینیؒ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے

"وقال عطاء: لا بأس أن يأخذ من لحيته الشيء القليل من طولها وعرضها إذا كثرت وعلت كراهة الشهرة وفيه تعريض نفسه لمن يسخر به واستدل بحديث عمرو بن هارون."

ترجمہ: "اور عطاء نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی داڑھی کے طول و عرض سے اس وقت تھوڑا سا حصہ کاٹ دے جب وہ بہت بڑھ جائے، کیونکہ شہرت ایک مکروہ شے ہے اور اس میں اپنے آپ کو تمسخر کا نشانہ بنانا بھی ہے، اور انہوں نے عمرو بن ہارون کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔"

اگر کوئی کہے کہ تم یہ کس دلیل کی بناء پر کہتے ہو کہ دونوں قول مختلف نہیں ہیں، تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ اس کی ایک دلیل حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے۔ "فتح الباری" اور "عمدۃ القاری" دونوں میں طبریؒ کا حوالہ ہے، پھر جب ان دونوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو "فتح" کا حوالہ مکمل اور "عمدہ" کا حوالہ ناقص ہے۔ "عمدہ" میں تو اس جماعت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو عطاء کے علاوہ اس تفصیل کی قائل تھی، امام طبریؒ نے سب سے پہلے اسی جماعت کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ "عمدہ" میں یہ بھی موجود نہیں ہے کہ امام طبریؒ نے خود کس قول کو اختیار کیا ہے؟ "فتح" میں اس کی تصریح موجود ہے۔ راقم الحروف نے اس مقالے کی تمہید میں "يأخذ من طولها وعرضها ما لم يفحش" کے مسلک پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، وہاں ملاحظہ فرمالی جائے، اور اگر کوئی شخص اصرار کرے کہ "قول

besturdubooks.wordpress.com

الآخرون" میں جس قول کا ذکر ہے وہ عطاءؒ کے قول سے علیحدہ ہے، دونوں ایک نہیں ہیں تو اسے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ وہ اس مبہم اور محتمل قول سے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، اس قول میں ایک قوی احتمال اس کا بھی موجود ہے کہ ایک قبضے سے اوپر داڑھی کٹوانے کو تحسین کی حد میں داخل کیا جائے، تو پھر اس محتمل قول کو اس کے جواز کے لئے بطور دلیل پیش کرنا کس طرح صحیح ہوگا...؟

٣:... "غیر أن معنی ذلک عندی ما لم یخرج من عرف الناس" کے سلسلے میں عرض ہے کہ برادرم ملک غلام علی نے یہ بات نظر انداز کردی ہے کہ اس میں ہمارے زمانے کے لوگوں کا عرف بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس زمانے کا عرف بیان کیا گیا ہے جب علماء و مشائخ بالخصوص اور مسلمان بالعموم داڑھی کی مقدار میں بھی اُسوۂ نبوی کی پیروی کرتے تھے، اور جیسا کہ ابن الہمامؒ کے حوالے سے گزر چکا، نویں صدی ہجری تک یک مشت سے اوپر داڑھی کٹوانا صرف عرفِ عام کے خلاف تھا، بلکہ اس کو جائز ہی نہیں سمجھا جاتا تھا، اس لئے "عمدۃ القاری" میں مذکور "عرف الناس" اور مولانا مودودی مدظلہ کے بیان کئے ہوئے عرفِ عام میں بونِ بعید ہے۔

آخر میں ملک صاحب کی خدمت میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چونکہ ایک جلیل القدر صحابیٔ رسول اور اعفائے لحیہ کی حدیث کے راوی بھی ہیں، اس لئے اُصولی طور پر فقہاء کی ایک جماعت نے ان کے عمل کی وجہ سے ایک قبضے سے زیادہ مقدارِ لحیہ کو کٹوانا جائز اور اس کو قدرِ مسنون کی آخری حد قرار دیا ہے، اگر صحابیٔ رسول کے علاوہ کوئی دُوسرا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور خلفائے راشدینؓ کی سنت کی روشنی میں اس کا عمل رَدّ کردیا جاتا، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کے عمل کو قدرِ مسنون کی آخری حد ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ایک قبضے سے کم مقدار کو کسی امامِ فقہ نے جائز قرار نہیں دیا، اور یہ بات اُوپر کئی جگہ آچکی ہے کہ فقہاء و محدثین کی ایک جماعت نے حضرت ابنِ عمرؓ کے عمل کو بھی تسلیم نہیں کیا، اور حدیثِ رسول کے عموم ہی کی قائل رہی، پھر ہم اور آپ، اب کس اُصول کے تحت استنباط

کر سکتے ہیں کہ گالوں سے لگی ہوئی یا ایک دو دن کی مختصر داڑھی بھی "مسنون داڑھی" ہے؟ کیا واضح دلائل کو چھوڑ کر صرف لفظ "بقبضة" سے اپنی طرف سے جیسے سمجھا قول سے اس طرح کا استنباط کوئی صحیح استنباط ہوگا...؟

چونکہ مغربی تہذیب کے استیلاء نے مسلمان معاشرے میں بھی حلق لحیہ کی وبا پھیلا دی ہے، اس لئے حلق لحیہ ترک کرکے ایک دو دن کی داڑھی بھی رکھ لینا بڑا کام ہے، اور ایسے شخص کا جذبہ یقیناً قابل قدر ہے، لیکن یہ کہنا کہ اس نے ارشادِ نبوی کا منشا پورا کردیا، صحیح نہیں، اسے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہئے کہ اس کا یہ عمل سنتِ نبوی کے مطابق ہو جائے۔ (بشکریہ ماہنامہ "زندگی" رامپور بابت ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ)

قال اللہ تعالیٰ:

"وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا." (النساء ۱۱۵)

ترجمہ:... "اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی، جب کھل چکی اس پر راہ کی بات، اور چلے سب مسلمانوں کی راہ سے الگ، سو ہم اس کو حوالے کریں وہی طرف جو اس نے پکڑی اور ڈالیں اس کو دوزخ میں، اور بہت بری جگہ پہنچا۔" (ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ)

ضمیمہ

(۳)

مولانا مودودی کی عبارتیں

"اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم" میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مودودی صاحب کے رسالہ "ترجمان القرآن" کا اور امہات المؤمنین کے بارے میں "ایشیا" کا جو حوالہ دیا گیا ہے، بعض حضرات نے ان دونوں حوالوں پر اعتراض کیا، اس ضمیمے میں ان دونوں حوالوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں "ترجمان القرآن" (جلد:۲۹ عدد:۳ شوال ۱۳۶۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۶ء) کا جو حوالہ نقل کیا گیا تھا، اس پر مولانا مودودی کی جماعت کی طرف سے دو اعتراض کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ عبارت کا جو ٹکڑا مولانا مودودی کی جانب منسوب کیا گیا ہے، وہ ان کی نہیں، بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی کے تحریر کردہ اشارات کی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اقتباس کو نقل کرتے ہوئے خیانت اور قطع و برید سے کام لیا ہے۔

پہلے اعتراض کے جواب میں یہ گزارش ہے کہ یہ عبارت مولانا مودودی کے "ترجمان القرآن" کے اداریے سے لی گئی ہے، اور مولانا اپنے رسالے کے اداریے کے مکمل طور پر ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ عبارت مولانا امین احسن اصلاحی یا کسی اور کے قلم سے نکلی ہو

سے دی گئی ہے۔ وہ اچھی طرح منظم ہو کر لوگوں کے فکر و عمل کا جائزہ لینے کی بے دلچسپی؟ اس کا پورا پورا اندازہ کئے بغیر اگر مزید مقدار دے دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فساد معدہ اور سوء ہضم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جن لوگوں نے داعیان حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ مردانِ حق سے اس طرح کی جلد بازی کے لئے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے، جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں، وہ حق کی لذت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں، یہ نئی آشنائی ان میں حق کی ایسی بھوک پیدا کر دیتی ہے کہ تدریج و ترتیب کا پروگرام ان پر بہت شاق گزرتا ہے، وہ شدت شوق بلکہ حرص حق میں اس طرح جلد باز ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوت ہضم کا صحیح اندازہ کر پاتے، نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کے ساتھ انہیں کچھ ایسی ہمدردی ہوتی ہے، وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصل حیثیت سے زیادہ قوی سمجھتے ہیں اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر مزید کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ جو اس دعوت کے مخالف ہوتے ہیں، وہ دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں، وہ داعی کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں پاتے تو یہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز فوراً سامنے نہ آئی تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں گے کہ محض ایک بے مقصد اور مجنونانہ دعوت ہے، اس کے آگے کوئی معین مقصود ہے نہ اس منزل مقصود تک پہنچنے کا کوئی واضح اور معقول پروگرام ہے، اور اگر کوئی اسکیم پیش کر دی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈ کر لوگوں کو دکھا سکیں گے، اور اگر کوئی رخنہ اس کے اندر نہ بھی مل سکا تو

اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایک سچے داعیِ حق کے اندر تبلیغِ حق کی ایک خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے، جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبر و انتظار اور تدریج و ترتیب کے حدود قیود کی وہ کبھی پابند نہ رہ سکے، اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبے جب مشتعل کر دیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی تحقیق کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے، ہر چند حق کی صحیح قدر شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لئے آدمی میں فدیوں کی سی بھوک ہو، جو اسے مضطرب بھی رکھے، بے صبر بھی بنا دے اور جلد بازی پر بھی مجبور کر دے، لیکن حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبے سے جماعت کی تربیت کا مطالبہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، اسی وجہ سے ایک داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح صحیح توازن قائم رکھے۔ اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لئے بے چین کرے تو چاہئے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظار پر مجبور کرے۔ اگر اعلانِ حق کا شوق اور حمایتِ حق کا جذبہ اس کو اکسائے کہ وہ شائقینِ شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے، نہ معاندین پر اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے، تو چاہئے کہ تربیت کے اہتمام کے لئے وہ اس پر بھی نظر رکھے کہ کہیں شراب قدح خوار کے ظرف سے زیادہ تند نہ ہونے پائے۔

جب کبھی ایسا ہوا کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آ گیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہو سکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی رخنے سے شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دے

نے ان کی عدم حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصے کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا۔ اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت پسندی پر ڈالی، جو ہرچند تعلیم و دعوت کی راہ میں تھی، لیکن تربیت کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے والی ثابت ہوئی، چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اور اس کے نتائج کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اور تم قوم کو چھوڑ کر (اے موسیٰ) وقت مقررہ سے پہلے کیوں چلے آئے؟ انہوں نے کہا وہ میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس اے پروردگار! اس لئے جلدی چلا آیا کہ تیری خوشنودی حاصل کروں۔ فرمایا تو جاؤ ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے چلے آنے کے بعد فتنے میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت بھی کرے تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکر و عمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے۔ جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اسی چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لئے جو صبر و انتظار مطلوب ہے اس کا حق وہ ادا نہیں کر سکتا، اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر یلغار کرتا ہوا بڑھتا جاتا ہے۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا، دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔

besturdubooks.wordpress.com

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکامِ الٰہی معلوم کرنے کے لئے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے فطری شوقِ علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحی الٰہی جلد از جلد نازل ہوتا کہ آپ اپنے شوقِ علم کو بھی تسلی دے سکیں اور قوم کے مطالبے کو بھی پورا کر سکیں۔"

("ترجمان القرآن" ستمبر ۱۹۷۶ء مطابق شوال ۱۳۹۶ھ ص:۱۴۳)

نظرِ ثانی کے وقت ہفت روزہ "ایشیا" کا مطلوبہ شمارہ تو دستیاب نہ ہوسکا، مگر یہی مضمون "تفہیم القرآن" سورۂ تحریم میں مفصل موجود ہے، اس لئے اس ضمیمے میں "تفہیم القرآن" کی عبارت نقل کی جاتی ہے:

"اس کے آگے کا قصہ ہم نے چھوڑ دیا ہے، جس میں حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ دوسرے روز صبح حضورؐ کی خدمت میں جا کر انہوں نے کس طرح حضورؐ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس قصے کو ہم نے مسندِ احمد اور بخاری کی روایات جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ نے مراجعت کا لفظ جو استعمال کیا ہے اسے لغوی معنی میں نہیں لیا جاسکتا، بلکہ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ یہ لفظ دوبدو جواب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور حضرت عمرؓ کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ "لا تراجعی رسول اللہ" صاف طور پر اس معنی میں ہے کہ حضورؐ سے زبان درازی نہ کیا کر۔ اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مراجعت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا، دوبدو جواب دینا تو صحیح ہے مگر اس کا ترجمہ زبان درازی صحیح

besturdubooks.wordpress.com

نہیں ہے۔ لیکن یہ معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم مرتبے کا آدمی اپنے سے بڑے مرتبے کے آدمی کو پلٹ کر جواب دے یا دوبدو جواب دے تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً: باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش رہنے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور امت کے کسی فرد کے درمیان ہو تو صرف ایک خبطی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔

بعض دوسرے لوگ ہمارے اس ترجمے کو سوءِ ادب قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ سوءِ ادب اگر ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جبکہ ہم اپنی طرف سے اس طرح کے الفاظ حضرت حفصہؓ کے متعلق استعمال کرنے کی جسارت کرتے۔ ہم نے تو حضرت عمرؓ کے الفاظ کا صحیح مفہوم ادا کیا ہے، اور یہ الفاظ انہوں نے اپنی بیٹی کو اس کے قصور پر سرزنش کرتے ہوئے استعمال کئے ہیں۔ اسے سوءِ ادب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یا تو باپ اپنی بیٹی کو ڈانٹتے ہوئے بھی ادب سے بات کرے، یا پھر اس کی ڈانٹ کا ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے اس کو باادب کلام بنا دے۔

اس مقام پر سوچنے کے قابل بات دراصل یہ ہے کہ اگر معاملہ صرف ایسا ہی ہلکا اور معمولی سا تھا کہ حضورؐ بھی اپنی بیویوں کو کچھ کہتے تھے اور وہ پلٹ کر جواب دے دیا کرتی تھیں، تو آخر اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے براہِ راست خود ان ازواجِ مطہرات کو شدت کے ساتھ تنبیہ فرمائی؟ اور حضرت

عمرؓ نے اس معاملہ کو اتنی سخت سمجھ کر پہلے اپنی بیٹی کو ڈانٹا اور پھر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے گھر جا کر ان کو اللہ کے غضب سے ڈرایا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کے خیال میں ایسے ہی زود رنج تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر بیویوں سے ناراض ہو جاتے تھے؟ اور یہ معاذ اللہ آپ کے نزدیک حضورؐ کی تنگ مزاجی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایسی ہی باتوں پر ناراض ہو کر آپ ایک دفعہ سب بیویوں سے مقاطعہ کر کے اپنے حجرے میں عزلت گزیں ہو گئے تھے؟ ان سوالات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو اسے مولانا کی اس بات کی تفسیر میں دو ہی راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے گا۔ یا تو اسے ازواج مطہرات کے جرم کی اتنی فکر لاحق ہو کہ وہ خدا اور اس کے رسول پر حرف آنے کی پروا نہ کرے۔ یا پھر سیدھی طرح یہ مان لے کہ اس زمانے میں ان ازواج مطہرات کا رویہ فی الواقع ایسا ہی قابل اعتراض ہو گیا تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہو جانے میں حق بجانب تھے اور حضور سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ اس بات میں حق بجانب تھا کہ ان ازواج کو اس رویہ پر شدت سے تنبیہ فرماتا۔"

(تفہیم القرآن ج ۶، ص ۳۳۔ ۳۶)

besturdubooks.wordpress.com

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

اِختلافِ اُمّت
اور
صراطِ مُستقیم

حصہ دوم

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ

مکتبہ لدھیانوی

besturdubooks.wordpress.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

قریباً ایک سال پہلے میرے ایک محترم بزرگ نے جناب سید زاہد علی صاحب مقیم بوظبی کا ایک سوال نامہ جو چند فقہی مسائل سے متعلق تھا، عنایت کرتے ہوئے جواب کا تقاضا فرمایا۔ سوالات پر ایک نظر ڈال کر میں نے جواب سے معذرت کردی، کیونکہ ائمہ مجتہدینؒ کے درمیان مختلف فیہ مسائل پر لکھنے کے لئے اس ناکارہ کی طبیعت چند وجوہ سے آمادہ نہیں ہوتی۔

۱:... یہ تو ظاہر ہے کہ طالب علموں کو اس قسم کی تحریر کی ضرورت نہیں ہوگی، ان کے سامنے علم کے دفاتر موجود ہیں۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے، ان کو دلائل کی تنقیح کے بجائے عمل کرنے کے لئے مسائل کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں تو صاف اور صحیح شکل میں مسئلہ بتادینا چاہئے، دلائل کی قیل و قال ان کے لئے اکثر و بیشتر ناقابلِ فہم اور موجبِ تشویش ہوتی ہے، اور اس سے ان کی عملی قوت کمزور ہوجاتی ہے۔

۲:... فقہاء کے اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی کا اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہے، یہ خطرہ رہتا ہے کہ خدانخواستہ افراط و تفریط نہ ہوجائے اور کوئی بات خدا اور رسول کی رضا کے خلاف زبان و قلم سے نہ نکل جائے، جو دنیا و آخرت کے خسران کا سبب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"ما ضلَّ قومٌ بعد ھدی کانوا علیہ الا اُوتوا الجدل۔" (مشکوٰۃ ص:۳۱، بحوالہ مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ:... "نہیں گمراہ ہوئی کوئی قوم ہدایت کے بعد مگر ان کو جھگڑے میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

۳:... پھر یہ مسائل صدر اوّل سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں، اور ان پر دو راویوں سے

آج تک اتنا کچھ لکھا پڑھا ہے کہ مزید پڑھنا لکھنا محض اضاعت وقت معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آدمی ایک ایسے پرفتن دور میں جب اسلام کے قطعی و بنیادی مسائل میں بھی تشکیک کا سلسلہ جاری ہے، اور قلوب سے ایمان کی رخصت ہو رہی ہے، ان فروعی مسائل کو ترجیح دے اور بحث و گفتگو کا موضوع بنا کر ان پر خامہ فرسائی کرنے بیٹھ جائے اور موجودہ دور کے اہم فتنوں سے صرف نظر کر لے۔

۵۔۔۔ پھر یہ فروعی مسائل، تین بارہ تیرہ مسئلوں تک محدود نہیں، بلکہ اس نوعیت کے ہزاروں مسائل ہیں، اب اگر ان فروعی مسائل پر بحث و تمحیص اور سوال و جواب کا دروازہ کھول دیا جائے تو اس غیر ضروری اور غیر مختتم سلسلے کے لئے عمر نوح بھی کافی نہ ہوگی۔ دوسرے تمام ضروری مشاغل معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

ان تمام معذرتوں کے باوجود میرے محترم دوست کا تقاضا جاری رہا، اور انہوں نے فرمایا کہ مراسلہ نگار کو بہت اصرار ہے کہ ان کے سوالوں کا جواب ضرور لکھا جائے۔ چنانچہ اسی اصرار و انکار میں مہینے گزر گئے، اور سوالات کا مسودہ بھی میرے کاغذات میں گم ہو گیا، لیکن ان کا اصرار پھر بھی جاری رہا، اور سوال نامے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے دوبارہ بھیجی گئی۔ اب مجھے حق تعالیٰ شانہ سے استخارہ کرنے کے بعد اسی سے مدد طلب کرتے ہوئے بعجلت تمام جو کچھ سمجھ میں آیا قلم برداشتہ لکھ دیا، اور مسودوں کی کتابت سے پہلے دوبارہ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، حق تعالیٰ شانہ اس کو قبول فرمائیں، اپنی رضا کا وسیلہ بنائیں اور اس میں میرے قلم کی جو لغزش ہوئی ہو اس کو معاف فرمائیں۔

استغفر الله الذي لا اله الا هو الحي القيوم واتوب اليه، ولا حول
ولا قوة الا بالله العلي العظيم، ربنا تقبل منا انك انت السميع
العليم، وتب علينا انك انت التواب الرحيم

محمد یوسف لدھیانوی
خادم بنوری ٹاؤن کراچی
۱۹/۶/۱۴۰۲ھ

besturdubooks.wordpress.com

سوالنامہ:

ا:... متفق علیہ کی احادیث اگر دیگر کتب میں موجود کسی حدیث سے متصادم ہوں تو کسے اختیار کرنا چاہئے؟

۲:... قرآن کریم کی کوئی آیت اگر قولی حدیث نبوی سے متصادم ہو تو کسے اختیار کرنا چاہئے؟ (مثلاً: قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے: "جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو" اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۂ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ سے پڑھ لو۔ یہ پڑھنا امام کی آیت پر سکتہ کی حالت میں یا کہ امام کی سورۂ فاتحہ تلاوت کرنے کے بعد، یا ساتھ ساتھ، یا ت پڑھے، یا حدیث کے مطابق جس کا مفہوم ہے: "جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی" اگر امام کا ہی فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے، پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے؟ جیسے: ثنا، تسبیحات، تشہد، درود وغیرہ۔

۳:... متفق علیہ کی حدیث میں اذان کے کلمات جفت اور اقامت طاق پڑھنے کا ذکر موجود ہے، یا یہ کہ اگر اذان ترجیع سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے، تو سوال یہ ہے کہ اذان و اقامت دونوں جفت کہی جاتی ہیں، کس دلیل سے؟ بحوالہ کتب احادیث وضاحت فرمائیں۔ ساتھ ہی صحت کے اعتبار سے کون سی اذان و اقامت بہتر ہے؟

۴:... تحقیق طلب یہ سوال ہے کہ مرد و عورت کی نماز کی ہیئت (ظاہری شکل) مختلف کیوں ہے؟ مثلاً: مرد کا کانوں تک تکبیر کے لئے ہاتھ اُٹھانا اور عورت کا کاندھے تک، مرد کا زیرِ ناف دونوں ہاتھ باندھنا اور عورت کا سینے پر، مرد کا سجدے کی حالت میں دونوں

قراءت کی آوازوں کا فرق سے نہیں ٹکراتی ہے؟

۱۲:.. احناف کے نزدیک نماز کے دوران سورۂ فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان اتنا وقفہ ہو جائے کہ تین مرتبہ "سبحان اللہ" کہا جا سکے تو سجدۂ سہو لازم آجاتا ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟

۱۳:.... مرد کے لئے ستر عورت ناف سے گھٹنے تک بتایا جاتا ہے، اس کے لئے کن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے؟ جبکہ بخاری میں حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگ خیبر میں) اپنی ران کھولی اور زید بن ثابتؓ نے کہا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر (قرآن) اتارا اور آپ کی ران میری ران پر تھی، وہ اتنی بھاری ہوگئی، میں ڈرا کہیں میری ران ٹوٹ جاتی ہے۔ امام بخاری نے استدلال کیا کہ ران عورت ہوتی تو آپؐ زیدؓ کی ران پر اپنی ران نہ رکھتے۔ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر جہاد کیا، ہم لوگوں نے صبح کی نماز اندھیرے منہ خیبر کے قریب پہنچ کر پڑھی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور میں ابوطلحہؓ کے پیچھے ایک ہی سواری پر بیٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی گلیوں میں اپنا جانور دوڑایا اور (دوڑنے میں) میرا گھٹنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران سے چھو جاتا تو آپؐ نے اپنی ران سے تہبند ہٹا دی (ران کھول دی) یہاں تک کہ آپ کی ران کی سفیدی (اور چمک) دیکھنے لگا۔ والسلام

احقر سید زاہد علی

دارالعلوم حیدرآباد

۱۹۸۱ء/۶/۴

besturdubooks.wordpress.com

الجواب:

سوال نامے کے ایک ایک نکتے پر غور کرنے سے پہلے بطور تمہید چند امور عرض کردینا مناسب ہے۔

ا:... اجتہادی و فروعی مسائل میں اختلاف سنت و بدعت کا اختلاف نہیں:

سوال نامے میں جو مسائل ذکر کئے گئے ہیں، وہ اعتقادی و نظریاتی نہیں، بلکہ فروعی و اجتہادی ہیں، فروعی مسائل میں اختلاف مذموم نہیں، بلکہ اس نوعیت کا اختلاف حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی رہا ہے، ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب حق و ہدایت پر تھے، اور قرآن کریم نے نہ صرف ان کو، بلکہ ان کی پیروی کرنے والوں کو بھی رضا و مغفرت کا ابدی پروانہ عطا فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ." (التوبہ:۱۰۰)

ترجمہ:... "اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ، اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے، اور تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں، رہا کریں انہی میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی کامیابی۔" (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

پس جو امور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان متفق علیہ تھے، وہ بعد کی اُمت کے حق میں حجتِ قطعیہ ہیں، اور کسی کو ان کے خلاف کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

besturdubooks.wordpress.com

"ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم وساءت مصیرا۔" (النساء: ۱۱۵)

ترجمہ: "اور جو شخص رسول (مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امرِ حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے ہو لیا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے، اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی۔"

(ترجمہ حضرت تھانوی)

اس آیتِ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے ساتھ ساتھ "سبیل المؤمنین" سے انحراف پر وعید فرمائی گئی ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اطاعتِ رسول اور اتباعِ "سبیل المؤمنین" دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی علامت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے راستے کا اختیار کرنا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے راستے سے انحراف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے، پس جو شخص صحابہ کرامؓ کے اجماعی اور متفق علیہ مسائل سے انحراف کرے گا وہ شقاقِ رسول کا مرتکب اور "نولہ ما تولی ونصلہ جہنم" کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

اور جن مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہوا، اس میں علماء کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ ہر فریق عند اللہ مصیب ہے، دوم یہ کہ ایک فریق مصیب ہے اور دوسرا مخطی، تاہم اس پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ہدایت و ضلالت یا سنت و بدعت کا اختلاف نہیں تھا، بلکہ ان کا اختلاف حق و صواب ہی کے دائرے میں ہے، اور ان میں سے ہر فریق اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق حق تعالیٰ شانہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کوشاں تھا۔ جو مسائل ان اکابر کے درمیان مختلف فیہ رہے، ان میں بعد کے مجتہدین کو یہ غور کرنے کا تو حق ہے کہ ان میں سے کس کا

besturdubooks.wordpress.com

قول راجح ہے اور کس کا مرجوح؟ لیکن یہ حق کسی کو نہیں کہ ان میں سے کسی کو بدعت وضلالت کی طرف منسوب کرے۔ اسی طرح ان کے اقوال سے خروج کا بھی کسی کو حق نہیں، کہ ان کے تمام اقوال کو چھوڑ کر کوئی نیا قول ایجاد کر لیا جائے۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے "الجامع الصغیر" (ج:۲ ص:۴۱) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے:

"سَأَلْتُ رَبِّيْ فِيْمَا تَخْتَلِفُ فِيْهِ أَصْحَابِيْ مِنْ بَعْدِيْ، فَأَوْحَى إِلَيَّ: يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ أَصْحَابَكَ عِنْدِيْ بِمَنْزِلَةِ النُّجُوْمِ فِي السَّمَاءِ بَعْضُهَا أَضْوَأُ مِنْ بَعْضٍ، فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِمَّا هُمْ عَلَيْهِ مِنِ اخْتِلَافِهِمْ فَهُوَ عِنْدِيْ عَلَى هُدًى." (السجزی فی الابانۃ، وابن عساکر وقولہ السیوطی بالضعف)

ترجمہ: "اپنے بعد اپنے اصحاب کے اختلاف کے بارے میں، میں نے اپنے رب سے سوال کیا، تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ: اے محمد! بے شک آپ کے اصحاب میرے نزدیک بمنزلہ آسمان کے ستاروں کے ہیں، ان میں سے بعض بعض سے زیادہ روشن ہیں، پس جس شخص نے ان کے اختلاف کی صورت میں ان میں سے کسی کے طریقے کو اختیار کر لیا، وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہے۔"

یہ حدیث سند کے لحاظ سے کمزور ہے، مگر اس کا مضمون متعدد احادیث کے علاوہ قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت سے بھی مؤید ہے، اسی بنا پر تمام اہل حق اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں کوئی فرد۔ نعوذ باللہ۔ گمراہ یا بدعتی نہیں تھا، بلکہ مختلف فیہ مسائل میں وہ سب اپنی اپنی جگہ حق پر تھے، اور اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق ماجور تھے۔

۲:... بیشتر اجتہادی و فروعی اختلاف صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے سے چلا آتا ہے۔

سوال نامے میں جن مسائل کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے وہ (اور اس قسم کے اور بہت سے مسائل) صدر اول سے اسی طرح مختلف فیہ چلے آتے ہیں، جیسا کہ ہر

مسئلے کے ذیل میں معلوم ہوگا۔ جو مسئلہ صدرِ اول سے مختلف فیہ چلا آرہا ہو، اس میں اختلاف کا مٹا دینا کسی کے لئے ممکن نہیں، نیز چونکہ ایسے مسائل میں سنت و بدعت یا حق و باطل کا اختلاف نہیں، اس لئے جو موقف کسی کے نزدیک راجح ہو اس کو اختیار کرسکتا ہے۔ اور قرآن کریم، سنتِ نبوی (علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات) اور صحابہ و تابعین کے تعامل کی روشنی میں اپنے موقف کی ترجیح کے دلائل بھی پیش کرسکتا ہے، لیکن کسی ایک فریق کا اپنے موقف کو قطعی حق سمجھنا اور فریقِ مخالف کے موقف کو قطعی باطل اور بدعت و ضلالت کہنا درست نہیں، کیونکہ اس سے ان تمام اکابرِ امت صحابہؓ و تابعینؒ کی تضلیل لازم آتی ہے جنھوں نے یہ موقف اختیار کیا، ظاہر ہے کہ اسے عقلاً و شرعاً درست نہیں کہا جاسکتا!

فروعی مسائل میں کم از کم اتنی کشادہ دلی اور فراخ دلی تو ہونی چاہئے کہ اپنے موقف کو صواب سمجھتے ہوئے فریقِ مخالف کے قول کو خطائے اجتہادی سمجھ کر ان کو معذور و ماجور تصور کریں، مثلاً: ایک شخص کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی: "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۶۹) امام، مقتدی اور منفرد سب کو عام ہے، تو اسے اپنے اس موقف کو درست سمجھتے ہوئے پوری قوت سے اس پر عمل کرنا چاہئے اور جو بزرگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی

"من صلّی خلف الامام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ۔"

ترجمہ: "جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قراءت اس کے لئے قراءت ہے۔"

کے پیشِ نظر اول الذکر حدیث کو مقتدی سے متعلق نہیں سمجھتے بلکہ ارشادِ باری:

"واذا قُرِئَ القرآنُ فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون۔" (الاعراف:۲۰۴)

ترجمہ: "اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگا دو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

اور ارشادِ نبوی

"وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔" (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۷۴)

ترجمہ:... "اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔"

کے مطابق مقتدی کے لئے قراءت کا ممنوع کہتے ہیں، آپ ان سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں تو نہ کیجئے، لیکن ان کو حدیث کے مخالف و تارک تو نہ کہئے! ورنہ اس سے جنگ و جدال کا منحوس دروازہ کھلے گا۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث: "لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ" کے مطابق فاتحہ مقتدی کے ذمے بھی فرض ہے اور اس کے بغیر اس کی نماز نہیں ہوتی، بلاشبہ آپ کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے، لیکن آپ کا یہ اجتہاد دوسروں پر حجت نہیں ہوسکتا، اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ محض اپنے اجتہاد کی بنا پر صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ ہدیٰ کی نمازوں کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرمائیں۔ کیونکہ صدرِ اوّل میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں تھا کہ فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز باطل ہے۔ اس کی بحث تو ان شاء اللہ سوال دوم کے ذیل میں آئے گی، لیکن اس تمہیدی بحث میں امامِ اہلِ سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا حوالہ ذکر کردینا مناسب ہوگا۔

موفق ابن قدامہ الحنبلی رحمہ اللہ "المغنی" میں لکھتے ہیں:

"قَالَ اَحْمَدُ: مَا سَمِعْنَا اَحَدًا مِّنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ یَقُوْلُ: اِنَّ الْاِمَامَ اِذَا جَھَرَ بِالْقِرَاءَةِ لَا تُجْزِئُ صَلٰوةُ مَنْ خَلْفَهٗ اِذَا لَمْ یَقْرَأْ، وَقَالَ: ھٰذَا النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ وَالتَّابِعُوْنَ، وَھٰذَا مَالِکٌ فِیْ اَھْلِ الْحِجَازِ، وَھٰذَا الثَّوْرِیُّ فِیْ اَھْلِ الْعِرَاقِ، وَھٰذَا الْاَوْزَاعِیُّ فِیْ اَھْلِ الشَّامِ، وَھٰذَا اللَّیْثُ فِیْ اَھْلِ مِصْرَ، مَا قَالُوْا لِرَجُلٍ صَلّٰی وَقَرَأَ اِمَامُهٗ وَلَمْ یَقْرَأْ ھُوَ صَلٰوتُکَ بَاطِلَةٌ .... الخ۔"

(ج:۱ ص:۵۶۲)

ترجمہ:... "امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے اہل

besturdubooks.wordpress.com

اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب امام قراءت کرے تو
مقتدی کی نماز صحیح نہیں ہوتی، جب تک کہ وہ خود قراءت نہ کرے۔
امام احمدؒ نے فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ و
تابعینؒ ہیں، اور یہ اہل حجاز میں امام مالکؒ ہیں، یہ اہل عراق میں
امام ثوریؒ ہیں، یہ اہل شام میں امام اوزاعیؒ ہیں، یہ اہل مصر میں امام
لیثؒ ہیں، ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جب امام قراءت
کرے اور مقتدی قراءت نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہے۔"

امام احمد رحمہ اللہ کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر امام مالک، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد رحمہم اللہ تک کوئی شخص بھی یہ فتویٰ نہیں دیتا تھا کہ اگر مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے۔

بلاشبہ سری نمازوں میں و جہری نمازوں کے سکتات میں بعض سلف قراءتِ فاتحہ کے جواز، بلکہ استحباب کے بھی قائل رہے ہیں، لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ان تمام لوگوں کی نماز ہی سرے سے باطل ہے جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے، کیسا خطرناک دعویٰ ہے، جس کی تکذیب امام احمد رحمہ اللہ کو کرنا پڑی...!

جو حضرات احناف پر چوٹ کرنے کے لئے "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" پڑھ پڑھ کر صدرِ اول کے اکابر کی نمازوں کو باطل کہتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیال میں بڑے اخلاص سے عمل بالحدیث فرماتے ہیں، میں ان کے اخلاص کی قدر کرتا ہوں، لیکن میں بصد منت و لجاجت انہیں اس غلو کے ترک کرنے کا مشورہ دوں گا، اور یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ کے خیال میں ان اکابر کی نمازیں باطل ہیں تو ان کا زیادہ غم نہ کیجئے، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق ان کی نمازیں صحیح ہیں، آپ ان کے بجائے اپنی توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول فرمائیے جو سرے سے نماز کے قائل ہی نہیں، یا جنھیں سالہا سال سے بھی مسجد کا رخ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، نمازیوں کی نماز کو باطل کہنے کے بجائے بے نمازیوں کو نمازی بنانے کی محنت کیجئے، یہ دین کی صحیح خدمت ہوگی۔

معلوم ہوگا۔ ان مسائل میں باتفاقِ امت دونوں صورتیں جائز ہیں، اختلاف صرف اس میں ہے کہ بہتر اور مستحب کون سی صورت ہے؟ اور مستحب کی تعریف ہی یہ ہے کہ: "لا یلام تارکہ" (اس کے تارک پر ملامت نہیں ہوتی) لیکن ہماری بدقسمتی کی حد ہے کہ ان مستحبات میں بھی نزاع و اختلاف اس حد تک پہنچا دیا گیا ہے کہ گویا یہ کفر و اسلام کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو حال ہی میں ایک اشتہار موصول ہوا ہے، جس کا عنوان ہے:

رفع الیدین... بیس ہزار روپے انعام... منتظر ہے ختم قوم.....

اس میں رفع یدین کے مسئلے پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث "مظاہر حق" کے ترجمے کے ساتھ درج کر کے لکھا گیا ہے:

"مولوی کا سوال وحدیث عام ہے، جو عالم رفع الیدین کا کرنا ترک یا منسوخ ثابت کرے، اس کو ہائی کورٹ کی شریعت بنچ پر فقط بیس ہزار روپیہ انعام ہے۔ یہ پیشکش پوری دنیا کے عالموں کو ہے، انعام دینے والے کا پتا: اسماعیل محمد، کشمیری بازار، راولپنڈی۔ منجانب بہادر بیگ، مختار ولد نظام الدین ترکاری بازار، راولپنڈی۔"

اس کے بعد ایک غلط بات (کہ رفع الیدین اس وقت کرنے کا حکم دیا گیا تھا جب لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، وہ اپنی بغلوں میں بت لایا کرتے تھے) نقل کر کے اس کی تردید کی گئی ہے، اور مولانا عبدالحی لکھنوی کے حوالے سے ایک موضوع روایت "حسبی النبی اللہ" نقل کر کے کہا گیا ہے کہ رفع الیدین منسوخ نہیں بلکہ متواتر ہے، اور درمختار کے حوالے سے تواتر کی تعریف کر کے لکھا ہے:

"اب ایک بڑے پتے کی بات بھی سنا فرماتے ہیں۔
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت آخری شریعت ہے، جو شخص شریعتِ اسلامیہ کے کسی حکم کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

کیا گیا ہے تحریف لے جانے کے بعد منسوخ ہو جانا مانے وہ قطعاً
مرتد اور کافر ہے۔" (حوالہ مذہب[1] اہل سنت کتاب صفحہ ۲۲۲)

نوٹ:... حنفی بھائیو! مولویوں اور بیگ کی تحقیق نہ مانو،
لیکن اپنے بڑوں کی تحقیق تو مان جاؤ، توبہ کر کے سب رفع
یدین کرو اور کراؤ، ورنہ رفع یدین کو منسوخ ثابت کر کے مجھ سے تیس ہزار
کے لئے تیس ہزار روپیہ اس شکریے میں مجھ سے انعام بھی اٹھاؤ۔

نوٹ:... ہم اہل حدیث پہلے وقت کے حنفیوں کی اور
موجودہ وقت کے حنفیوں کی آپس میں رفع الیدین کے بارے میں
صلح کرانا چاہتے ہیں، اور ان کو ان کے فتوؤں سے بچانا چاہتے ہیں،
اللہ تعالیٰ توفیق دے صرف اسلام کے (سورہ یونس) اسلام پیغمبر کی صحیح
حدیث کے فیصلے کا نام ہے۔"

رفع الیدین کا مسئلہ ان شاء اللہ سوال ششم کے ذیل میں آپ ملاحظہ فرمائیں
گے، اور وہاں باحوالہ عرض کروں گا کہ رفع یدین اور ترک رفع یدین باجماع امت دونوں
جائز ہیں۔ اختلاف صرف افضلیت و استحباب میں ہے، بعض حضرات کے نزدیک رفع
یدین افضل و مستحب ہے، اور بعض کے نزدیک ترک رفع یدین۔

یہاں صرف اس خوش طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ ایک ایسا امر، جس کے
استحباب و عدم استحباب میں صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ (رضی اللہ عنہم) کا اختلاف ہے،
ہمارے بہادر بیگ صاحب اسے کفر و اسلام کا معیار بنا رہے ہیں، اس کے لئے اشتہار بازی
کی جا رہی ہے، جس میں ہزاروں کی انعامی شرطیں بندھ رہی ہیں، اور فریقین میں سے کسی ایک
فریق سے توبہ نصوح کرانے کا چیلنج دیا جا رہا ہے:

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبیست![2]

---

(۱) نقل مطابق اصل۔ (۲) عقل، حیرت سے جل گئی کہ یہ کیا عجب تماشا ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

حضرت شہید اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہما اللہ کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ جن اکابر نے قنوتِ نازلہ، رفع یدین، آمین بالجہر کو اختیار کیا ہے، وہ بھی ترکِ رفع یدین کو سنتِ نبوی تسلیم کرتے ہیں، البتہ ان کے نزدیک رفع یدین کی سنت کو راجح و افضل سمجھتے ہیں، مگر انہوں نے اس کو کبھی کفر و اسلام کا مدار نہیں بنایا، نہ ترکِ رفع یدین کو لائقِ ملامت سمجھا، چہ جائیکہ انہوں نے ہمارے بہادر شاہ صاحب کی طرح ترکِ رفع کو شعارِ ارتداد یا کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر ان سے توبہ کرانا ضروری سمجھا ہو...!

الغرض وہ تمام مسائل جن میں سلف صالحین اور فقہائے امت کا اختلاف ہے، خصوصاً جن مسائل میں اختلاف صرف افضلیت و غیر افضلیت تک محدود ہے، ان میں ایسا غلو اور تشدد روا نہیں کہ ایک دوسرے کو توبہ کی دعوتیں دی جانے لگیں، ایسا غلو اور تشدد ابتداع فی الدین ہے، جس سے شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بقول دین میں تحریف کا دروازہ کھلتا ہے، ایسے لوگوں کا شمار اہلِ حق میں نہیں، اہلِ بدعت میں ہے۔ میں اپنے بہادر بھائی اور ان کے دیگر ہم مشرب بزرگوں کی خدمت میں نہایت دردمندی سے گزارش کروں گا کہ آپ بے شک عمل بالحدیث کی دل و جان سے قدر کرتے ہوں، مگر ان اختلافی مسائل میں ایسا غلو اور تشدد نہ روا رکھئے جس سے دین کی حدود مٹ جائیں، اور فرائض و واجبات اور مستحبات کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے، اور بے دین طبقے کو اہلِ دین کا تمسخر اڑانے کا موقع ملے۔ آپ جس سنت کو افضل سمجھتے ہیں، بڑے شوق و اخلاص سے اس پر عمل کیجئے، ان شاء اللہ آپ کو اپنے اخلاص کا اجر ملے گا، لیکن دوسرے حضرات کے نزدیک اگر دوسری سنت افضل و راجح ہے تو ان پر بھی طعن نہ کیجئے، بلکہ حسنِ ظن رکھئے کہ وہ بھی بشرطِ اخلاص اس دوسری سنت پر عمل کرتے ہیں، ان شاء اللہ آپ سے کم اجر نہیں ملے گا۔

۵:... عمل بالحدیث تمام ائمہ اجتہاد کی مشترک میراث ہے:

قرآنِ کریم نے بہت سے مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات و ارشادات کی تعمیل کو جزوِ ایمان کا فریضہ ٹھہرایا ہے، سورۂ احزاب میں ارشاد ہے:

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مقدسہ اور سنن طیبہ بھی باجماعِ اُمت واجب العمل ہیں، اور سنت کے حجتِ شرعیہ ہونے کو "ضروریاتِ دین" میں شمار کیا گیا ہے، شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ تحریر الاصول میں تحریر فرماتے ہیں:

"حُجِّيَّةُ السُّنَّةِ سَوَاءٌ كَانَتْ مُفِيْدَةً لِلْفَرْضِ أَوِ الْوَاجِبِ أَوْ غَيْرِهِمَا ضَرُوْرِيَّةٌ دِيْنِيَّةٌ كُلُّ مَنْ لَهُ عَقْلٌ وَتَمْيِيْزٌ حَتَّى النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ يَعْرِفُ أَنَّ مَنْ ثَبَتَ نُبُوَّتُهُ صَادِقٌ فِيْمَا يُخْبِرُ عَنِ اللهِ تَعَالٰى وَيَجِبُ اتِّبَاعُهُ."

(تیسیر التحریر شرح تحریر، للشیخ محمد امین امیر بادشاہ ج:۳ ص:۲۲)

ترجمہ:... "سنت خواہ فرض کے لئے مفید ہو یا واجب کے لئے، یا دونوں کے علاوہ کسی اور حکم کے لئے، اس کا حجت ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہے، ہر وہ شخص جو عقل و تمیز رکھتا ہو حتیٰ کہ عورتیں اور بچے بھی جانتے ہیں کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ ان تمام اُمور میں سچا ہے جن کی وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دیتا ہے، اور اس کی اتباع واجب ہے۔"

اور چونکہ "اصولِ اربعہ" سے احکامِ شرعیہ کا ثبوت تمام مجتہدینِ اُمت کے نزدیک متفق علیہ ہے (یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماعِ اُمت اور قیاسِ مجتہد) ان میں دوسرا مرتبہ سنتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ارشاد متعدد طرق و الفاظ سے مروی ہے کہ:

"مَا جَاءَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبِأَبِيْ وَأُمِّيْ فَعَلَى الرَّأْسِ وَالْعَيْنِ، وَمَا جَاءَ عَنِ الصَّحَابَةِ اخْتَرْنَا، وَمَا كَانَ مِنْ غَيْرِ ذٰلِكَ فَهُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ." (مناقب ذہبی ص:۲۰)

ترجمہ:... "جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول

ترجمہ: ”ہم کتاب اللہ پر عمل کرتے ہیں، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، پھر حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی احادیث پر۔“

الغرض جہاں نصوص میں بظاہر تعارض نظر آئے، وہاں اپنے اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق تمام ائمہ مجتہدین کو نصوص میں تطبیق یا ترجیح کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں محدث اور مجتہد کا وظیفہ الگ الگ ہو جاتا ہے، کیونکہ محدث کا منصب یہ ہے کہ وہ ان تمام امور کو روایت کرتا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، اسے اس سے بحث نہیں کہ ان میں سے کون ناسخ ہے؟ کون منسوخ ہے؟ کون قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے؟ اور کس کی حیثیت مستثنیات کی ہے؟ کون سا حکم وجوب پر محمول ہے؟ اور کون سا ندب و استحباب یا اباحت پر؟ کون سا حکم تشریعی ہے اور کون سا ارشادی؟ امت کا تواتر و تعامل کس پر ہے اور کس پر نہیں؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے امور پر غور کر کے یہ معلوم کرنا کہ شارع علیہ السلام کا ٹھیک ٹھیک منشا کیا ہے؟ یہ محدث کا وظیفہ نہیں، بلکہ مجتہد کا منصب ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ ایک ہے حدیث کے الفاظ کی حفاظت و نگہداشت، اور ایک ہے حدیث کے معانی و منشا تک رسائی و دقیقہ رسی، شریعت کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنا اور جزئیات سے کلیات کی طرف منتقل ہونا، پہلی چیز محدث کا منصب ہے، اور دوسری فقیہ مجتہد کا۔ اسی لئے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وكذٰلك قال الفقهاء وهم اعلم بمعاني الحديث۔“ (ترمذی باب غسل میت ج:۱)

ترجمہ: ”اور فقہاء نے اسی طرح کہا ہے، اور وہ حدیث کے معنی کو خوب سمجھتے ہیں۔“

امام اعمش رحمہ اللہ سے ایک موقع پر چند مسائل دریافت کئے گئے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے جواب کے لئے حضرت امام کو فرمایا، حضرت امام نے مسائل بتادیئے تو انہوں نے پوچھا یہ مسائل کہاں سے نکالے؟ فرمایا کہ فلاں فلاں احادیث

وَجَدَ لِوَاحِدٍ مِنْهُمْ قَوْلٌ قَدْ جَاءَ حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ بِخِلَافِهِ فَلَا بُدَّ لَهُ مِنْ عُذْرٍ فِيْ تَرْكِهِ۔" (ص:۱۰)

ترجمہ:... "جاننا چاہئے کہ ائمہ اجتہاد جن کو امت کے نزدیک قبولِ عام حاصل ہے، ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کی قصداً مخالفت نہیں کرتا، نہ کسی چھوٹی سنت کی، نہ کسی بڑی سنت کی، کیونکہ تمام ائمہ اس پر قطعی طور پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واجب ہے، اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص کی حیثیت ایسی ہے کہ اس کے قول کو لیا بھی جاسکتا ہے اور چھوڑا بھی جاسکتا ہے، لیکن جب ائمہ اجتہاد میں سے کسی کا ایسا قول نظر آئے کہ حدیثِ صحیح اس کے خلاف ہو تو اس کے لئے اس کے ترک میں ضرور کوئی عذر ہوگا۔"

پھر مجتہدین کے درجات میں بھی تفاوت ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ تفاوت خود انبیائے کرام علیہم السلام کی ذواتِ قدسیہ میں موجود ہے: "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" اس لئے اجتہاد کے مدارک مختلف ہوجاتے ہیں، لیکن اپنی اپنی سعی و کوشش اور اپنے اپنے تفقہ و اجتہاد کے مطابق تمام ائمہ مجتہدین منشائے شارع کی تعمیل میں کوشاں ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ "الانتقاء" میں امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

"كَانَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ شَدِيْدَ الْأَخْذِ بِالْعِلْمِ، ذَابًّا عَنْ حَرَمِ اللهِ أَنْ يُسْتَحَلَّ، يَأْخُذُ بِمَا صَحَّ مِنَ الْأَحَادِيْثِ الَّتِيْ يَحْمِلُهَا الثِّقَاتُ، وَبِالْآخِرِ مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِمَا أَدْرَكَ عَلَيْهِ عُلَمَاءَ الْكُوْفَةِ، ثُمَّ شَنَّعَ عَلَيْهِ قَوْمٌ، يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَهُمْ۔" (ص:۱۳۲)

ترجمہ:... "امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علم کو بہت زیادہ اخذ کرنے والے تھے، بڑی شدت کے ساتھ حدودِ الٰہیہ سے مدافعت

besturdubooks.wordpress.com

تھے، اور حق کی اتباع میں علمائے اہلِ کوفہ کو جس چیز پر پایا اسے اپنایا، اور اسی کو اپنا دین بنالیا۔ کچھ لوگوں نے آپؒ پر ناحق طعن و تشنیع سے کام لیا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوئے ان لوگوں کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں۔"

الغرض ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے بارے میں یہ بدگمانی کہ وہ محض رائے کی وجہ سے احادیثِ طیبہ کو ترک کردیتے ہیں، نہ صرف یہ کہ صریح ظلم و زیادتی ہے، بلکہ اجتہاد کے منصبِ رفیع سے ناآشنائی کی علامت ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جماعتے کہ ایں اکابرِ دین را اصحابِ رائے مے دانند، اگر ایں اعتقاد دارند کہ ایشاں بہ رائے خود حکم مے کردند و متابعتِ کتاب و سنت نمی نمودند، پس سوادِ اعظم از اہلِ اسلام بزعمِ فاسد ایشاں ضال و مبتدع باشند، بلکہ از جرگۂ اہلِ اسلام بیروں بودند، ایں اعتقاد نہ کند مگر جاہلے کہ از جہلِ خود بے خبر است، یا زندیقے کہ مقصودش ابطالِ شطرِ دین است، ناقصے چند احادیثے چند را یاد گرفتہ اند و احکامِ شریعت را منحصر دراں ساختہ اند، و ماورائے معلومِ خود را نفی می نمایند و آنچہ نزدِ ایشاں ثابت نشدہ منتفی می سازند:

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں است
زمین و آسمانِ او ہماں است۔"

(مکتوبات دفتر دوم حصہ ہفتم مکتوب نمبر:۵۵ ص:۵، طبع امرتسر)

ترجمہ:... "جو لوگ ان اکابرِ دین کو "اصحاب الرائے" کہتے ہیں، اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ حضرات محض اپنی رائے سے حکم کرتے تھے، اور کتاب و سنت کی پیروی نہیں کرتے تھے، تو ان کے خیالِ فاسد کے مطابق مسلمانوں کا سوادِ اعظم گمراہ اور بدعتی ہوگا، بلکہ اہلِ اسلام کی جماعت ہی سے خارج ہوگا۔ اور یہ خیال نہیں

besturdubooks.wordpress.com

پہلا سبب:... حدیث کی اطلاع نہ ہونا:

ان دس اسباب میں سے پہلا اور اکثری سبب شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"اَنْ لَا یَکُوْنَ الْحَدِیْثُ قَدْ بَلَغَہٗ وَمَنْ لَمْ یَبْلُغْہُ الْحَدِیْثُ لَمْ یُکَلَّفْ اَنْ یَکُوْنَ عَالِمًا بِمُوْجِبِہٖ، وَاِذَا لَمْ یَکُنْ قَدْ بَلَغَہٗ وَقَدْ قَالَ فِیْ تِلْکَ الْقَضِیَّۃِ بِمُوْجِبِ ظَاہِرِ اٰیَۃٍ اَوْ حَدِیْثٍ اٰخَرَ، اَوْ بِمُوْجِبِ قِیَاسٍ، اَوْ مُوْجِبِ اِسْتِصْحَابٍ، فَقَدْ یُوَافِقُ ذٰلِکَ الْحَدِیْثَ تَارَۃً وَّیُخَالِفُہٗ اُخْرٰی، وَھٰذَا السَّبَبُ ھُوَ الْغَالِبُ عَلٰی اَکْثَرِ مَا یُوْجَدُ مِنْ اَقْوَالِ السَّلَفِ مُخَالِفًا لِبَعْضِ الْاَحَادِیْثِ." (ص:۱۲)

ترجمہ:... "اس کو حدیث نہ پہنچی ہو، اور جب اس کو حدیث پہنچی ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس بات کا مکلف ہی نہیں کہ اس کے حکم کا عالم ہو، اور جب اسے حدیث نہ پہنچی ہو اور اس نے اس مسئلے میں کسی آیت کے ظاہر یا کسی اور حدیث کے موافق، یا قیاس و استصحاب کی رو سے کوئی رائے قائم کی ہو تو وہ کبھی اس حدیث کے موافق ہوگی اور کبھی مخالف، اور سلف کے جو اقوال بعض احادیث کے خلاف پائے جاتے ہیں ان کا غالب اور اکثری سبب یہی ہے۔"

قریب قریب یہی بات مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" اور "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" میں لکھی ہے۔ بعض حضرات کو اس سے شدید غلط فہمی ہوئی ہے، اور انہوں نے ترکِ حدیث کے باقی اسباب کو نظر انداز کرکے گویا اسی کو ایک مستقل اصول بنالیا ہے کہ جہاں کسی مجتہد کا قول کسی حدیث کے خلاف نظر آئے، یہ حضرات اپنے حسنِ ظن کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مجتہد کو یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی، مگر یہ رائے نہایت فاسد ہے، ان دونوں بزرگوں نے جس کی شہادت میں سلف کے جو

besturdubooks.wordpress.com

واقعات نقل کئے ہیں وہ معدودے چند ہیں، اس لئے اس کو "ترکِ حدیث" کا "اکثری سبب" قرار دینا بالکل غلط ہے۔

علاوہ ازیں یہ عذر ان مسائل میں تو صحیح ہے جو کبھی شاذ و نادر پیش آتے ہیں (اور اس ضمن میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں، وہ اسی نوعیت کے ہیں) لیکن وہ مسائل جن سے روزمرہ سابقہ پیش آتا ہے، ان میں یہ عذر صحیح نہیں۔ مثلاً: امام کے پیچھے الحمد پڑھی جانے یا نہیں؟ آمین اونچی کہی جائے یا آہستہ؟ رکوع کو جاتے اور اس سے اُٹھتے وقت رفع یدین کیا جائے یا نہیں؟ اذان و اقامت کے کلمات کتنے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسے شاذ و نادر مسائل نہیں جن کی ضرورت بڑی عمر میں بھی ایک آدھ بار پیش آتی ہو، اور یہ فرض کرلیا جائے کہ بعض سلف کو حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ یہ اعمال تو ایسے ہیں کہ روزانہ بار بار علیٰ رؤس الاشہاد ادا کئے جاتے ہیں، اور تعامل سے ان کی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلی آتی ہے، اور عقلاً ناممکن ہے کہ اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کو اس بارے میں سنتِ نبوی کا علم نہ ہو۔

اسی طرح جن مسائل میں صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں بحث و مناظرہ کی نوبت آئی، ان میں بھی یہ احتمال بعید ہے کہ ایک فریق کو حدیث نہیں پہنچی ہوگی، اس قسم کے مواقع میں صحیح عذر وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کرچکا ہوں کہ یہ مدارکِ اجتہاد کا اختلاف ہے، اس کی مثال وہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظۃ۔"

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲۹)

ترجمہ:... "تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنوقریظہ پہنچ کر۔"

اتفاق سے وہاں پہنچنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاخیر ہوگئی اور نمازِ عصر کا وقت نکلنے لگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ کیا ہونا چاہئے؟ مشورے میں دو فریق بن گئے۔

ان کے نزدیک حجت نہیں تھی، کیونکہ اسناد کے راویوں میں سے کوئی راوی ان کے نزدیک مجہول یا متہم یا سئی الحفظ تھا۔" (ص ۲۲)

اس کی مزید تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"وهذا أيضا كثير جدا وفي من المتبعين تابعيهم في الائمة المشهورين (و) من بعدهم أكثر من العصر الأول أو كثير من القسم الأول." (قفو الاثر ص ۲۶)

ترجمہ:... "اور یہ سبب بھی بہت ہی زیادہ ہے، اور یہ تابعین سے لے کر ائمہ مشہورین تک اور ان کے بعد کے حضرات تک بہ نسبت زمانہ اول کے زیادہ ہے یا قسم اول کی نسبت زیادہ ہے۔"

تیسری اور چوتھی صدی کے محدثین نے احادیث کی تنقیح اور راویوں کی جرح و تعدیل کے لئے جو اصول مقرر فرمائے ہیں، ان کی روشنی میں بہت سی وہ احادیث و روایات محدثین متاخرین کے نزدیک غیر ثابت اور ساقط الاعتبار قرار پائیں، جو ان کے مقرر کردہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں، حالانکہ ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ صحیح تھیں اور وہ حضرات ان احادیث پر عمل پیرا تھے، جن راویوں کو بعد کے حضرات نے مجہول، سئی الحفظ یا متہم قرار دے کر ان کی احادیث کو ترک کیا، ائمہ متقدمین ان راویوں سے خود ملے تھے اور بعد کے حضرات کی بہ نسبت ان کے حالات سے زیادہ واقف تھے، متاخرین نے پانچ سو سال قبل کے راویوں کی جانچ پرکھ کے لئے ان کے اخذ کردہ صحف ہی پر انحصار کیا تھا، لیکن متقدمین راویوں کو ان اصحاف کے پیمانے سے ناپتے تولتے نہیں تھے ان کی رائے براہ راست مشاہدے پر مبنی تھی۔ اسی طرح متاخرین نے جن احادیث میں ارسال و انقطاع کی ذرا سی بھی کمی دیکھی انہیں مسترد کر دیا، حالانکہ متقدمین ان مرسل و منقطع احادیث کو حجت سمجھتے تھے، جیسا کہ امام مالک اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریحات موجود ہیں، کیونکہ ائمہ متقدمین ہر کسے ناکسے شخص سے علم نہیں لیتے تھے، بلکہ جس کے علم و فہم اور صدق و دیانت پر انہیں اعتماد ہوتا تھا اسی سے لیتے تھے، اس لئے انہیں اپنے

مشائخ کی مرسل روایات پر اعتماد تھا، مگر متأخرین کا اعتماد "عصائے عنعنہ" کا محتاج تھا، چنانچہ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بقول جوں جوں وقت گزرتا گیا بہت سی وہ احادیث جن سے متقدمین تمسک کرتے تھے، متأخرین کی نظر میں مشکوک ہوتی چلی گئیں۔ اگر اس نکتے کو پیش نظر رکھا جائے، تو متقدمین کے بجائے متأخرین زیادہ احادیث کے تارک نظر آئیں گے مگر چونکہ ان کا یہ ترک بھی ایک اجتہادی رائے اور اپنے خیال میں احتیاط فی الدین پر مبنی ہے اس لئے وہ بھی ان احادیث کے ترک میں معذور ہیں۔

تیسرا سبب... حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف:

شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک مجتہد نے اپنے اجتہاد سے ایک حدیث کو ضعیف سمجھا ہو جبکہ دوسرے طریق سے قطع نظر دوسرے حضرات برخلاف اس کے اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہوں، خواہ حدیث کو ضعیف سمجھنے والے کا قول درست ہو، یا اس کے مخالف کا، یا دونوں کا قول درست ہو، ان حضرات کے نظریے کے مطابق جو کہتے ہیں کہ ہر مجتہد صواب پر ہے۔" (ص:۱۷)

شیخ رحمہ اللہ نے اس کے بعد حدیث کی تصحیح و تضعیف میں اختلاف کے متعدد اسباب ذکر کئے ہیں۔

چوتھا سبب... بعض احادیث کا مقررہ شرائط پر پورا نہ اترنا:

"ایک مجتہد، عادل و حافظ راوی کی خبر واحد میں ایسی شرائط کا لحاظ کرنا ضروری سمجھتا ہو جن کا لحاظ دوسروں کے نزدیک ضروری نہ ہو، مثلاً: حدیث کو کتاب و سنت پر پیش کرنا، یا مثلاً: حدیث جب دیگر اصولِ شرعیہ کے خلاف ہو تو راوی فقیہ ہونا چاہئے، یا مثلاً: حدیث جب ایسے مسئلے سے متعلق ہو جس کی ضرورت روز مرہ پیش آتی ہے تو اس کا مشہور ہونا۔" (ص:۲۰)

besturdubooks.wordpress.com

نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث پر کلام کرنے والوں کا قول امام بخاری اور امام مسلم پر حجت نہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے جن احادیث کو اپنی کتابوں میں لیا ہے وہ ان کے نزدیک صحیح ہیں، دوسروں کے نزدیک اگرچہ متکلم فیہ ہوں۔ ٹھیک اسی اصول پر امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے جن احادیث کو لیا ہے، اور ان سے تمسک فرمایا ہے، وہ ان کے نزدیک صحیح اور لائق احتجاج ہیں، اگر دیگر محدثین کو ان پر کلام ہے تو ان کے کلام کی حیثیت خلافی نوٹ کی سی ہوگی، جو مجتہد کے فیصلے پر اثرانداز نہیں ہوسکتے۔

اور یہاں ایک ضروری نکتہ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد نہیں، بلکہ یا تو خود مجتہد ہیں یا دیگر ائمہ اجتہاد کے مقلد ہیں، اس لئے یہ قدرتی امر ہے کہ ان کی کتابوں میں اپنے فقہی مسلک کا رنگ غالب ہوگا، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ تو جس مسلک کو اختیار کرلیتے ہیں، اسی کی دلیل ذکر کرتے ہیں، اور مخالف مسلک کی حدیث خواہ ان کی شرط پر بھی ہو اسے ذکر نہیں کرتے، بلکہ بسا اوقات اس حدیث کو خود اپنی کتاب میں روایت کرتے ہیں مگر متعلقہ باب میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے، اور دیگر ائمہ اگرچہ اکثر و بیشتر دونوں طرف کی احادیث ذکر کرتے ہیں، تاہم ان کی کتابوں میں غالب پہلو وہی نظر آتا ہے جو ان کے فقہی مسلک کے مطابق ہو۔ اس لئے صحاح ستہ کی احادیث کو حرف آخر سمجھ کر ان کے پیش نظر ائمہ احناف رحمہم اللہ کے خلاف یک طرفہ فیصلہ کردینا صحیح نہیں ہوگا۔

۸:... تعامل سلف کی اہمیت:

تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے زمانے میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اکابر تابعین کا تعامل کسی مسئلے میں حجت قطعیہ شمار ہوتا تھا، اور احادیث کی صحت و سقم کے لئے معیاری حیثیت رکھتا تھا، جو احادیث کہ اکابر صحابہ و تابعین کے تعامل کے خلاف ہوتیں، انہیں شاذ، منسوخ یا مؤول سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں جگہ جگہ تعامل اہل مدینہ کا حوالہ دیتے ہیں، اور جو احادیث اہل مدینہ کے تعامل کے خلاف ہوں انہیں غیر معمول بہا قرار دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی ہر

besturdubooks.wordpress.com

گئے تو ایک الگ شاذ روایت حجت نہیں تھی۔

اگر بنظرِ تحقیق دیکھا جائے تو تعامل ہی کی برکت سے ہمارے دین کا نصف حصہ عملاً متواتر ہے، اور تعامل ہی تعلیم و تعلّم کا قوی ترین ذریعہ ہے، اگر تعامل کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو محض روایات کو سامنے رکھ کر کوئی شخص نماز کا نقشہ بھی مرتب نہیں کر سکتا، جو دن میں پانچ بار پڑھی جاتی ہے، چہ جائیکہ پورے دین کا نظام مرتب کر دیا جائے۔ اس لئے صحیح طرزِ فکر یہ ہے کہ اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل اور روایت کو بیک وقت پیشِ نظر رکھ کر دونوں کے درمیان تطبیق دی جائے، اور یہی وہ کارنامہ ہے جو ائمۂ احناف رحمہم اللہ نے انجام دیا، انہوں نے کسی مسئلے میں بھی صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل سے صرفِ نظر نہیں کیا لیکن بعد کے فقہاء و محدثین کو اس معیار کا قائم رکھنا مشکل تھا، اس لئے انہوں نے روایات کی صحت و ضعف کو اصل معیار قرار دیا۔

۹:... اجتہاد و تقلید:

فروعی و اجتہادی مسائل میں اجتہاد یا تقلید کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اجتہاد و تقلید کے بارے میں چند حروف لکھ دینا مناسب ہے۔

صرف علمِ شریعت ہی نہیں بلکہ کسی بھی علم و فن میں اہلِ علم کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں، کچھ حضرات استنباط و اجتہاد کے اہل ہوتے ہیں، اور دوسرے حضرات ان کی روشنی کی تقلید اور ان کی آراء پر اعتماد کیا کرتے ہیں، کیونکہ جو شخص کسی علم و فن میں خود مرتبۂ اجتہاد پر فائز نہ ہو وہ اگر اس فن سے استفادہ کرنا چاہتا ہے، لامحالہ اسے اہلِ اجتہاد کے اصول و نظریات پر اعتماد کرنا ہوگا۔

ٹھیک یہی دو صورتیں عمل بالشریعت کی ہیں، جو شخص شریعت میں مجتہدانہ فہم و بصیرت رکھتا ہو، ایک ایک باب میں شارع کے مقصد و منشا پر جس کی نظر ہو، شریعت کے کلیات سے جزئیات کے استنباط کی صلاحیت رکھتا ہو، اور استنباط کے اصول و قواعد جس کے لئے محض "دانستنی" کا درجہ نہ رکھتے ہوں، بلکہ یہ اس کا فطری ملکہ بن گئے ہوں، اور وہ شارع کے مقاصد اور سلف صالحین کے تعامل کی روشنی میں متعارض نصوص کی جمع و تطبیق میں

مہارت رکھتا ہو اسے خود اجتہاد کرنا لازم ہے، اور کسی مجتہد کی تقلید اس پر حرام ہے۔ لیکن جس شخص کو فہم و بصیرت کا یہ درجہ اور استنباط و اجتہاد کا یہ ملکہ حاصل نہیں، نہ اجتہاد کے آلات اور شرائط اور ضروریات اسے میسر ہیں، وہ اگر شریعت سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اہل اجتہاد کے فہم و بصیرت پر اعتماد لازم ہے، اجتہادی صلاحیتوں اور ان کے آلات و شرائط کے بغیر اگر یہ اجتہاد کرے گا تو یہ خود رائی ہوگی، جس کا نتیجہ زیغ و ضلال کے سوا کچھ نہیں...!

ارشادِ نبوی ہے:

"من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار. وفي رواية: من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار" (مشکوٰۃ ص:۳۵ بروایت ترمذی)

ترجمہ:... "جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن میں کلام کیا، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے بغیر علم کے قرآن میں کلام کیا، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنائے۔"

ملتِ اسلامیہ میں جتنے لوگ زیغ و ضلال اور کج فکری کا شکار ہوئے، اگر غور و تامل سے دیکھا جائے تو ان کی گمراہی کا بڑا ایک سبب یہ تھا کہ انہوں نے اجتہادی صلاحیتوں سے محرومی کے باوصف ائمہ اجتہاد اور سلف صالحین پر اعتماد کرنے کے بجائے خود رائی و خود روی اختیار کی، اور قرآن و سنت میں بزعمِ خود اجتہاد کرنے بیٹھ گئے۔ اس سے واضح ہے کہ جس طرح جاہل کے لئے کسی عالم سے رجوع کرنا کوئی عار اور ذلت کی بات نہیں، بلکہ یہی اس کے مرضِ جہل کا علاج ہے، چنانچہ حدیثِ نبوی میں ہے: "فانما شفاء العي السؤال" (درماندہ کا علاج پوچھنا ہے) ٹھیک اسی طرح جو عالم کہ خود مرتبۂ اجتہاد پر فائز نہ ہو، اس کا اہلِ اجتہاد پر اعتماد کرنا بھی کوئی عار اور ذلت نہیں، بلکہ اس کی صحت میں خود رائی اور عجب و تکبر سے بچنے کا موجب ہے۔

جہاں تک مرتبۂ اجتہاد کے شرائط اور اس کے آلات و ضروریات کا تعلق ہے، ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، تاہم یہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ تیسری صدی کے بعد امت

besturdubooks.wordpress.com

مطالعہ، استحضار اور وقتِ نظر کے باوجود خود بھی فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک فقہ سے مشکل کوئی فن نہیں، چنانچہ میں تمام فنون میں اپنی مستقل رائے اور تجربہ رکھتا ہوں، جو چاہتا ہوں فیصلہ کرتا ہوں۔ اہلِ فن کے اقوال میں سے جس کو چاہتا ہوں منتخب کر لیتا ہوں، اور خود بھی رائے قائم کر لیتا ہوں۔ لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں، اس میں نقل و روایت کے سوا میری کوئی رائے نہیں۔"

(فیض الباری ج:۳ ص:۱۶۷)

اور "نفحۃ العنبر" میں حضرت رحمہ اللہ کا ارشاد اس طرح نقل کیا ہے:

"میں فقہ کے سوا دیگر عقلی و نقلی فنون میں کسی امام کا مقلد نہیں ہوں، ہاں! فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں، یعنی ہر علم و فن میں میری ایک مستقل رائے ہے سوائے فقہ کے..... اور بسا اوقات جب میں ائمہ مجتہدین کے اقوال کی تخریج میں غور کرتا ہوں تو میری فکری پرواز مدارکِ اجتہاد کے ادراک سے قاصر رہتی ہے، اور جب ائمہ اجتہاد کے مدارک کی وسعت و گہرائی پر ششدر رہ جاتا ہوں۔"

(ص:۸۸ طبع جدید)

پس جب یہ تمام اکابر اپنے تبحر علمی کے باوصف مجتہدین کی تقلید سے بے نیاز نہیں، تو دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ اور یہی بات ہے کہ اس زمانے میں اکابر کے اتباع و تقلید پر ہی عمل بالسنۃ کا مدار ہے، اور تقلید کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اب خواہ کوئی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی تقلید کرے، نہ بعد کے ایسے لوگوں کی جو علم و دانش، فہم و بصیرت، زہد و تقویٰ، طہارتِ قلب اور صفائے باطن میں ان اکابر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے..... واللہ الموفق۔

۱۰:...ائمہ فقہاء کا احترام:

از خدا جوئیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم گشت از فضلِ رب

مشرف ہو کر ان اولوالعزم صحابہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور یہ سعادت ان کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی، جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"طوبیٰ لمن رآنی ولمن رأی من رآنی ولمن
رأی من رأی من رآنی" (فیض القدیر ج:۴ ص:۲۷۰)

۲... حضرت امام رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کو کتب وابواب کی شکل میں مدون فرمایا ہے اور ان کی اقتدا میں امام مالک نے مؤطا لکھی۔

۳... ان کے فیضانِ صحبت سے ایسے ائمہ تیار ہوئے جن کی نظیر دوسرے اکابر کے تلامذہ میں نہیں ملتی، چنانچہ آپ کے سیرت نگاروں نے آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے، جن میں اکثر ائمہ ہوئے ہیں، مثلاً مغیرہ بن مقسم الضبی اور امام مالک رحمہما اللہ جیسے اکابر بھی آپ سے روایت کرتے ہیں، اور زکریا بن ابی زائدہ، مسعر بن کدام، سفیان ثوری، مالک بن مغول، یونس بن ابی اسحاق، حفص بن غیاث، جریر بن عبدالحمید، عبداللہ بن المبارک، وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون، مکی بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل، عبدالرزاق بن ہمام، ابو یوسف القاضی، داؤد بن نصیر الطائی اور فضیل بن عیاض رحمہم اللہ جیسے اکابر کو حضرت امام سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ غور فرمایئے کہ بعد کی امت کا کون شخص ہے جو حضرت امام کے ان فیض یافتوں کا خوشہ چین نہیں...

۴... اور حضرت امام رحمہ اللہ کا ایک اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ ان کے فقہی مسائل محض ان کی ذاتی و انفرادی رائے نہیں، بلکہ فقہاء، محدثین اور عباد و زہاد صالحین کی ایک بڑی جماعت نے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد ان کی منظوری دی ہے۔

شیخ ابن حجر مکی رحمہ اللہ "الخیرات الحسان" فصل دوم میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص نے امام وکیع بن جراح رحمہ اللہ کی موجودگی
میں یہ کہہ دیا کہ ابوحنیفہ نے غلطی کی ہے، امام وکیع نے اسے ڈانٹ
پلائی اور فرمایا: جو شخص ایسی بات کہے وہ چوپاؤں کی مانند ہے بلکہ
ان سے بھی زیادہ گمراہ، وہ کیسے غلطی کر سکتے تھے جبکہ ان کے

پس امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ایسے ائمہ فقہ موجود تھے، فلاں فلاں ائمہ حدیث موجود تھے، فلاں فلاں ائمہ لغت و عربیت موجود تھے، اور فضیل بن عیاضؒ اور داؤد الطائیؒ ایسے ائمہ زہد و ورع موجود تھے۔

وَمَنْ كَانَ أَصْحَابُهُ هٰؤُلَاءِ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَ لِأَنَّهُ إِنْ أَخْطَأَ رَدُّوْهُ لِلْحَقِّ۔ (اور جس کے رفقاء یہ لوگ ہوں، وہ غلطی نہیں کرسکتا، کیونکہ اگر وہ غلطی کرتا تو یہ حضرات اسے ضرور حق کی طرف لوٹا دیتے)۔" (ص ۳۸)

حضرت امام رحمہ اللہ کے علوم کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں، جس کی واضح دلیل ہے کہ جرح و تعدیل کے امام یحییٰ بن سعید القطانؒ، ان کے شاگرد یحییٰ بن معینؒ، امام الائمہ الثبت لیث بن سعد، امام شافعیؒ کے استاذ امام وکیع بن جراحؒ، اور امام بخاریؒ کے استاذِ کبیر امام مکی بن ابراہیم (رحمہم اللہ) ایسے جہابذہ محدثین حضرت امامؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے، اور امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کو جنہیں دربارِ علم سے "امیر المؤمنین فی الحدیث" کا خطاب ملا ہے، حضرت امامؒ سے تلمذ پر فخر تھا۔

مناسب ہے کہ حضرت امام رحمہ اللہ کے معاصرین اور بعد کے چند اکابر کے موقر جملے حضرت امامؒ کے حق میں نقل کردیئے جائیں:

۱... امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۰ھ):

حضرت امامؒ کے اس خواب کا ذکر تقریباً سبھی نے کیا ہے کہ گویا آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھول رہے ہیں، امام محمد بن سیرینؒ سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا: "یہ شخص علومِ نبوت کو پھیلائے گا۔" (مناقب ذہبی ص ۲۳)

۲... امام مغیرہ بن مقسم الضبی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۶ھ):

جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں کہ موصوف نے مجھے تاکید فرمائی: "امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضری دیا کرو، فقیہ بن جاؤ گے، اور اگر ابراہیم نخعی حیات ہوتے تو وہ بھی ان کی ہم نشینی اختیار کرتے۔" (مناقب ذہبی ص ۱۸)

besturdubooks.wordpress.com

۸:... امام عبدالعزیز بن ابی رواد رحمہ اللہ (متوفی ۱۵۹ھ):

"جو شخص امام ابوحنیفہؒ سے محبت رکھے وہ سنی ہے، اور جو ان سے بغض رکھے وہ بدعتی ہے۔" اور ایک روایت میں ہے: "ہمارے پاس لوگوں کے جانچنے کے لئے ابوحنیفہؒ معیار ہیں، جو ان سے محبت اور دوستی رکھے وہ اہل سنت میں سے ہے، اور جو ان سے بغض رکھے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بدعتی ہے۔" (خیرات الحسان ص:۳۲)

۹:... امام شعبہ بن الحجاج رحمہ اللہ (متوفی ۱۶۰ھ):

"اللہ کی قسم! امام ابوحنیفہؒ بہت عمدہ فہم اور جید حافظے کے مالک تھے، لوگوں نے آپ پر ایسی باتوں میں طعن و تشنیع کی، جن کو وہ ان لوگوں سے زیادہ جانتے تھے، اللہ کی قسم! یہ لوگ اپنی اس بدگوئی کی سزا اللہ تعالیٰ کے یہاں پائیں گے۔" امام شعبہؒ حضرت امامؒ کے حق میں بکثرت دعائے رحمت کیا کرتے تھے۔ (مناقب ذہبی ص:۱۸، خیرات الحسان ص:۳۲)

۱۰:... امام داؤد بن نصیر الطائی رحمہ اللہ (متوفی ۱۶۰ھ):

"آپ ایک روشن ستارہ تھے، جس سے راہ رو رات کی تاریکیوں میں راستہ پاتا ہے، آپ کے پاس وہ علم تھا جس کو اہل ایمان کے قلوب قبول کرتے ہیں۔"

(الخیرات الحسان ص:۳۳)

۱۱:... امام سفیان بن سعید الثوری رحمہ اللہ (متوفی ۱۶۱ھ):

ایک شخص حضرت امامؒ کے پاس آیا تھا، امام ثوریؒ نے اس سے فرمایا: "تم روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے آئے ہو" نیز فرمایا: "جو شخص حضرت امام کی مخالفت کرتا ہے، اسے اس کی ضرورت ہے کہ مرتبت اور وفورِ علم میں آپ سے بڑھ کر ہو، لیکن بعید ہے کہ کوئی ایسا ثابت کر دکھائے۔" (الخیرات الحسان ص:۳۹)

۱۲:... امام دارالہجرت مالک بن انس رحمہ اللہ (متوفی ۱۷۹ھ):

حضرت امامؒ کے بارے میں فرمایا: "سبحان اللہ! میں نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا" نیز فرمایا: "اگر وہ اس ستون کے بارے میں دعویٰ کریں کہ سونے کا ہے تو اسے دلیل سے ثابت کر دیں گے۔" (الخیرات الحسان ص:۳۸)

۱۳۔ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ (متوفی ۱۸۱ھ):

حضرت امامؒ کے بڑے قدر شناس تھے، وہ آپ کی مدح و توصیف میں ان کے بہت سے اقوال بیان فرماتے تھے "جب لوگ حضرت امامؒ کا ذکر برائی سے کرتے ہیں تو مجھے بہت ہی صدمہ ہوتا ہے، اور مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان پر اللہ کا غضب نہ ٹوٹ پڑے گا" (مناقب ذہبی ص ۲۲) نیز فرماتے تھے: "اگر اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہؒ اور سفیانؒ کے ذریعے میری دستگیری نہ کرتا تو میں بدعتی ہوتا" (مناقب ذہبی ص ۱۸)

۱۴۔ امام حفص بن غیاث رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۵ھ):

"حضرت امام ابوحنیفہؒ کا کلام بال سے زیادہ باریک ہے، اور اس میں عیب چینی صرف جاہل ہی کرسکتا ہے" (مناقب ذہبی ص ۲۰)

۱۵۔ امام وکیع بن الجراح رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۷ھ):

"میں نے حضرت امامؒ سے زیادہ فقیہ اور ان سے اچھی نماز پڑھنے والا کوئی نہیں دیکھا" (خیرات الحسان ص ۳۱)

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: "میں نے کسی کو نہیں دیکھا جسے وکیع بن جراح پر ترجیح دوں، وہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کی احادیث کے حافظ تھے، انہوں نے حضرت امامؒ سے بہت زیادہ احادیث سنی تھیں" (جامع بیان العلم لابن عبدالبر ج ۲ ص ۱۴۹)

۱۶۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۸ھ):

"میری آنکھوں نے ابوحنیفہؒ جیسا شخص نہیں دیکھا" (مناقب ذہبی ص ۱۹)

"دو چیزوں کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کوفہ کے پل سے پار نہیں جائیں گی، مگر وہ تو زمین کے آخری کناروں تک پہنچ گئیں، ایک حمزہؒ کی قراءت اور دوسری ابوحنیفہؒ کی فقہ" (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۷، مناقب ذہبی ص ۲۰)

۱۷۔ امام عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۸ھ):

"اصحابِ حدیث میں سفیان ثوری سب کے امیر المؤمنین ہیں، سفیان بن عیینہ امیر العلماء ہیں، شعبہ حدیث کی کسوٹی ہیں، عبداللہ بن مبارک حدیث کے صراف

ہیں، یحییٰ بن سعید القطان قاضی العلماء ہیں اور ابو حنیفہ علماء کے قاضی القضاۃ ہیں، جو شخص تم سے اس کے علاوہ کچھ اور کہے اسے بنو سلیم کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دو۔"

(مناقب موفق ج:۲ ص:۲۵)

۱۸:... امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۸ھ):

"ہم اللہ کے سامنے جھوٹ نہیں بولتے (یعنی خدا گواہ ہے کہ) ہم نے امام ابو حنیفہؒ سے اچھی رائے کسی کی نہیں سنی، اور ہم نے ان کے اکثر اقوال کو لیا ہے۔"

(تاریخ بغداد ج:۱۳ ص:۳۴۵، مناقب ذہبی ص:۱۹)

۱۹:... علی بن عاصم الواسطی رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۱ھ):

"اگر امام ابو حنیفہ کی عقل کا نصف اہل زمین کی عقل سے موازنہ کیا جائے تب بھی حضرت امامؒ کا پلہ بھاری رہے گا۔" (مناقب ذہبی ص:۲۳)

نیز فرماتے تھے: "اگر امام ابو حنیفہؒ کا علم ان کے اہل زمانہ کے علم سے تولا جائے تو امامؒ کے علم کا پلہ بھاری ہوگا۔" (مناقب ذہبی ص:۲۰)

۲۰:... امام شافعی (محمد بن ادریس رحمہ اللہ) (متوفی ۲۰۴ھ):

"لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کے عیال ہیں۔" (مناقب ذہبی ص:۱۹)

"جو شخص فقہ میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابو حنیفہؒ کا محتاج ہے۔" "امام ابو حنیفہؒ فقہ کے موفق تھے۔" "جو شخص فقہ کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہو وہ امام ابو حنیفہ کے اصحاب کو لازم پکڑے۔" (تاریخ بغداد ج:۱۳ ص:۳۴۶)

"لوگ علم کلام میں امام ابو حنیفہؒ کے خوشہ چین ہیں۔" (تاریخ بغداد ج:۱۳ ص:۱۶۱)

امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک بار حضرت امامؒ کی قبر کے پاس صبح کی نماز پڑھی تو اس میں قنوت نہیں پڑھی، وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: "اس صاحب قبر کا ادب مانع ہوا۔"

(الخیرات الحسان ص:۹۴)

۲۱:... امام نضر بن شمیل رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۴ھ)

"لوگ علم فقہ سے خواب میں تھے، امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی شرح و تفصیل کرکے

تب ان کی حالت پر حسرت و افسوس کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے؟ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وائے ہزار وائے از تعصبہائے بارد ایشاں و از نظرہائے فاسد ایشاں، بانی فقہ ابوحنیفہ است، و سہ حصہ از فقہ او را مسلم داشتہ اند، و در ربع باقی ہمہ شرکت دارند با وے، در فقہ صاحب خانہ اوست، و دیگراں ہمہ عیالِ وے اند ... با وجود التزام این مذہب مرا با امام شافعی گویا محبت ذاتی است، و بزرگ میدانم، لہٰذا در بعض اعمال نافلہ تقلید مذہب او میکنم، اما چہ کنم کہ دیگراں را با وجود وفور علم و کمال تقوی در جنب امام ابی حنیفہ در رنگ طفلاں می یابم، والامر الی اللہ سبحانہ۔" (مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ، مکتوب نمبر ۵۵)

ترجمہ: "افسوس ہزار افسوس ان کے تعصب بارد اور ان کی نظر فاسد پر، فقہ کے بانی ابوحنیفہ ہیں، اور فقہ کے تین حصے آپ کے لئے مسلم رکھے ہیں، اور باقی چوتھائی میں دوسرے حضرات آپ کے ساتھ شریک ہیں، فقہ میں صاحب خانہ وہ ہیں، اور دوسرے ان کے عیال ہیں، مذہب حنفی کے التزام کے باوجود امام شافعی کے ساتھ مجھے گویا ذاتی محبت ہے، اور ان کی عظمت و بزرگی کا قائل ہوں۔ اس لئے بعض نفلی اعمال میں ان کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں، لیکن کیا کروں، دوسرے حضرات کو وفور علم اور کمال تقویٰ کے باوجود امام ابوحنیفہ کے مقابلے میں بچوں کے رنگ میں پاتا ہوں۔"

اس بحث کے آخر میں مناسب ہے کہ حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۵ھ) کی کتاب "تاریخ اہلحدیث" سے دو اقتباس نقل کر دئے جائیں۔

ایک زمانے میں مجھ کو حضرت امام رحمۃ اللہ کے خلاف تحقیق کا شوق پیدا ہوا،

سے بے ادبی کرتا ہے، اس کا خاتمہ اچھا نہیں ہوتا۔"

(تاریخ اہل حدیث ص:۲۳۴)

(مقتبس از "مقام ابی حنیفہ" از مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ ص:۱۲۸، ۱۲۹)

حق تعالیٰ شانہٗ اس آفت سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے اور سب کا خاتمہ بخیر فرمائے:

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

ترجمہ... "بس تجربہ کرلیا ہم نے اس مکافات کی دُنیا میں کہ جو (شرابِ محبت کی) تلچھٹ پینے والوں کے ساتھ اُلجھا وہ تباہ ہوگیا۔"

ان تمہیدی نکات کے بعد اب سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

سوالِ اوّل:... کیا صحیحین کی روایت مقدم ہے؟

"سوال:... متفق علیہ کی احادیث اگر دُوسری کتب میں
موجود کسی حدیث سے متصادم ہوں تو کسے اختیار کرنا چاہئے؟"

جواب:... بعض شافعیہ نے یہ اُصول ذکر کیا ہے کہ صحیحین کی روایت زیادہ صحیح ہے، پھر بخاری کی، پھر مسلم کی، پھر جو دونوں کی شرط پر مشتمل ہو، پھر جو ان میں سے ایک کی شرط پر مشتمل ہو، پھر جس میں صحت کی عام شرائط پائی جائیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اُصول محلِ نظر ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ غیرصحیحین کی روایت صحیحین کی روایت سے اصح ہو، یا اس کے مساوی ہو۔ شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ "فتح القدیر" (ج:۱ ص:۳۱۷ باب النوافل) میں لکھتے ہیں:

"وَكَوْنُ مُعَارِضِهِ فِي الْبُخَارِيِّ لَا يَسْتَلْزِمُ تَقْدِيْمَهُ بَعْدَ اِشْتِرَاكِهِمَا فِي الصِّحَّةِ، بَلْ يُطْلَبُ التَّرْجِيْحُ مِنْ خَارِجٍ، وَقَوْلُ مَنْ قَالَ: "أَصَحُّ الْأَحَادِيْثِ مَا فِي الصَّحِيْحَيْنِ، ثُمَّ مَا انْفَرَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ، ثُمَّ مَا انْفَرَدَ بِهِ مُسْلِمٌ، ثُمَّ مَا اشْتَمَلَ عَلٰى شَرْطِهِمَا مِنْ غَيْرِهِمَا، ثُمَّ مَا اشْتَمَلَ عَلٰى شَرْطِ أَحَدِهِمَا" تَحَكُّمٌ لَا يَجُوْزُ التَّقْلِيْدُ فِيْهِ. إِذِ الْأَصَحِّيَّةُ لَيْسَ إِلَّا لِاشْتِمَالِ رُوَاتِهِمَا عَلَى الشُّرُوْطِ الَّتِي اعْتَبَرَاهَا فَإِذَا فُرِضَ وُجُوْدُ تِلْكَ الشُّرُوْطِ فِي رُوَاةِ حَدِيْثٍ فِي غَيْرِ الْكِتَابَيْنِ أَفَلَا يَكُوْنُ الْحُكْمُ بِأَصَحِّيَّةِ مَا فِي الْكِتَابَيْنِ عَيْنَ التَّحَكُّمِ ثُمَّ حُكْمُهُمَا أَوْ حُكْمُ أَحَدِهِمَا بِأَنَّ الرَّاوِيَ الْمُعَيَّنَ مُجْتَمِعٌ تِلْكَ الشُّرُوْطَ لَيْسَ مِمَّا

يقطع فيه بمطابقته للواقع فيجوز كون الواقع خلافه."

ترجمہ: "اور اس حدیث کی معارض حدیث کے بخاری میں ہونے سے لازم نہیں آتا کہ بخاری کی روایت مقدم ہو، جبکہ دونوں صحت میں مشترک ہیں، بجز ترجیح خارج سے ثابت کی ہوئی کے۔ اور جس شخص نے یہ کہا: صحیحین کی روایت زیادہ صحیح ہے، پھر بخاری کی، پھر مسلم کی، پھر جو دونوں کی شرائط پر مشتمل ہو، پھر جو ان میں سے ایک کی شرائط پر مشتمل ہو، اس کا قول محض تحکم اور سینہ زوری ہے، جس کی تقلید جائز نہیں، کیونکہ زیادہ صحیح ہونے کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ حدیث ان شرائط پر مشتمل ہے جو بخاریؒ و مسلمؒ نے اپنے راویوں میں ملحوظ رکھی ہیں، پس جب ان ہی شرائط کا وجود کسی ایسی حدیث میں فرض کیا جائے جو ان دونوں کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہو، اس صورت میں ان دونوں کتابوں کی روایت کو اصح کہنا محض سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر بخاری و مسلم کا یا ان میں سے کسی ایک کا کسی خاص راوی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ اس میں یہ سب شرائط پائی جاتی ہیں، ایسی چیز نہیں جو قطعی طور پر واقع کے مطابق بھی ہو، ہو سکتا ہے کہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔"

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ ائمہ مجتہدین (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کا زمانہ مؤلفین صحاح ستہ سے مقدم ہے، اس لئے صحیحین کی روایت کے راجح ہونے یا نہ ہونے کا سوال بعد کے لوگوں کے بارے میں تو پیدا ہو سکتا ہے، لیکن ائمہ مجتہدینؒ کے حق میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ائمہ مجتہدینؒ کے سامنے مرفوع، موقوف، مرسل احادیث اور صحابہؓ و تابعینؒ کے فتاویٰ اور خیر القرون کے تعامل کا پورا ذخیرہ موجود تھا، انہوں نے ان تمام امور کی روشنی میں فقہی مسائل کو مدون کیا اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے مدرک اجتہاد اور فہم و بصیرت کے

مطابق بہتر سے بہتر پہلو کو اختیار کیا۔

محدثین کا منصب احادیث و روایات کو اسانید سے نقل کر دینا ہے، لیکن ان میں کون ناسخ ہے، کون منسوخ؟ کون راجح ہے، کون مرجوح؟ کس میں شرعی اصول اور قواعد کا ذکر کیا گیا ہے اور کس میں کسی جزئی صورت کا ذکر ہے؟ وغیرہ وغیرہ، یہ وہ امور ہیں جن کی تنقیح فقہائے امت اور ائمہ اجتہاد کا منصب ہے، جس طرح ائمہ احادیث کی تصحیح و تحسین اور راویوں کی جرح و تعدیل میں محدثین کے محتاج ہیں، اسی طرح کتاب و سنت کے فہم و استنباط، متعارض نصوص کے درمیان توفیق و تطبیق اور ترجیح میں حضرات فقہائے امت کے محتاج ہیں۔

الغرض کسی حدیث کے صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ معمول بہا بھی ہو، اور عمل کے اعتبار سے راجح بھی ہو، خود صحیح بخاری میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے، لیکن امام بخاری کا فتویٰ اس کے مطابق نہیں، اور کوئی عقل مند اس چیز کو دیکھ کر امام بخاری رحمہ اللہ کی جانب سے سوءِ ظن میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اسی طرح اگر ائمہ اجتہاد کسی صحیح حدیث کو نہیں لیتے تو یقیناً اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی، یہاں بھی سوءِ ظن نہیں ہونا چاہئے۔

اور یہ امر بھی واضح ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا کسی حدیث کو اپنی کتاب میں درج کر دینا امام بخاری کی طرف سے اس کی تصحیح ہے، اسی طرح ائمہ مجتہدین جب کسی حدیث سے استدلال فرماتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے حدیث کی تصحیح ہے، گو بعد کے لوگوں کو وہ حدیث سندِ ضعیف سے پہنچی ہو۔

سوالِ دوم:... فاتحہ خلف الامام:

"سوال: قرآن کریم کی کوئی آیت اگر قوی حدیث نبوی سے متصادم ہو تو کسے اختیار کرنا چاہئے؟ (مثلاً- قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ: "جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو" اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ: "جب سورۂ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھو" یہ پڑھنا امام کی آیت پر مقتدی کی حالت میں ہو کہ امام کے سورۂ فاتحہ تلاوت کرنے کے بعد، یا ساتھ ساتھ، یا نہ پڑھے؟ یا حدیث کے مطابق جس کا مفہوم ہے: "جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی" اگر امام کا ہی فاتحہ پڑھنا کافی ہے، پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے؟ جیسے ثناء، تسبیحات، تشہد، درود وغیرہ؟)"

جواب:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاداتِ طیبہ، قرآن کریم کی شرح و تفسیر ہیں، اس لئے واقعہ نفس الامری کے اعتبار سے قرآن کریم اور حدیثِ صحیح کے درمیان تعارض یا تصادم ممکن ہی نہیں، اگر بظاہر تعارض نظر آئے (اور ان میں سے کسی ایک کا حکم منسوخ بھی نہ ہو) تو یہ دونوں میں سے کسی ایک کے مفہوم اور منشا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوگا، اور دونوں کے درمیان توفیق و تطبیق کی ضرورت ہوگی، اور یہ بہت دقیق کام ہے، جس کے لئے غیرمعمولی فہم و بصیرت اور قوتِ اجتہاد کی ضرورت ہے۔

زیرِ بحث مسئلے میں قرآن کریم اور احادیثِ طیبہ میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ قرآن کریم کی یہ آیت:

"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (الاعراف:۲۰۴)

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ... "اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس پر کان دھرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

نماز اور خطبے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابن مسعود، ابوہریرہ، ابن عباس اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم کے، اور تابعینؒ میں سے سعید بن جبیر، عطا بن ابی رباح، عبدالرحمن بن زید بن اسلم، ابراہیم نخعی، شعبی، حسن بصری، ابن شہاب زہری، مجاہد، قتادہ اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ کے ارشادات نقل کئے ہیں۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیرؒ ج:۲ ص:۲۸۰، ۲۸۱)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

"وَقَدِ اسْتَفَاضَ عَنِ السَّلَفِ أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي الْقِرَاءَةِ فِي الصَّلٰوةِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ فِي الْخُطْبَةِ وَذَكَرَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ الْإِجْمَاعَ عَلٰى أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي ذٰلِكَ"

(طبع قدیم ج:۲ ص:۱۴۵، طبع جدید ج:۲۳ ص:۲۶۹)

ترجمہ... "اور سلف سے استفاضہ و شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت قراءت فی الصلوٰۃ کے بارے میں نازل ہوئی، اور بعض کا قول ہے کہ خطبے کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ یہ نماز اور خطبے کے بارے میں نازل ہوئی۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"أَحَدُهَا مَا ذَكَرَهُ الْإِمَامُ أَحْمَدُ مِنْ إِجْمَاعِ النَّاسِ عَلٰى أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي الصَّلٰوةِ وَفِي الْخُطْبَةِ وَكَذٰلِكَ قَوْلُهٗ: وَإِذَا قُرِئَ فَأَنْصِتُوْا." (ج:۲ ص:۲۱۲، ج:۲۳ ص:۳۱۳)

ترجمہ... "ایک وجہ جو امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اسی طرح ارشاد نبوی: "وَإِذَا قُرِئَ فَأَنْصِتُوْا" بھی۔"

اور موفق ابن قدامہ رحمہ اللہ "المغنی" میں لکھتے ہیں:

"قال احمد فی روایة ابی داؤد: اجمع الناس
علی ان هذه الآیة نزلت فی الصلوٰة۔" (ج:۱ ص:۵۶۳)

ترجمہ:... "ابوداؤد کی روایت ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا:
لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی۔"

پس یہ آیت کریمہ نماز باجماعت میں امام اور مقتدی دونوں کا الگ الگ وظیفہ مقرر کرتی ہے کہ امام کا وظیفہ قراءت ہے، اور مقتدی کا وظیفہ امام کی قراءت کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا۔ اس آیت کی روشنی میں مقتدی کا وظیفہ خود قراءت کرنا نہیں، بلکہ اس کے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ خاموش ہوکر امام کی قراءت کی طرف متوجہ رہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قراءت فرض نہیں، ورنہ اسے خاموشی کا حکم نہ دیا جاتا، بلکہ قراءت کا فرض ادا کرنے کا حکم دیا جاتا۔ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وذکر الاجماع علی انه لا تجب القراءة علی
المأموم حال الجهر۔" ([illegible])

ترجمہ:... "اور امام احمدؒ نے اس پر بھی اجماع نقل کیا ہے
کہ امام جب جہری قراءت کرے تو مقتدی کے ذمے قراءت
واجب نہیں۔"

موفق ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس کی تفصیل امام احمد بن حنبلؒ کے حوالے سے یوں نقل کی ہے:

"قال احمد: ما سمعنا احدا من اهل الاسلام
یقول ان الامام اذا جهر بالقراءة لا تجزئ صلوٰة من
خلفه اذا لم یقرأ، وقال: هذا النبی صلی الله علیه وسلم
واصحابه والتابعون، وهذا مالک فی اهل الحجاز، وهذا
الثوری فی اهل العراق، وهذا الاوزاعی فی اهل الشام،

besturdubooks.wordpress.com

وهذا الليث في أهل مصر ما قالوا لرجل صلّى وقرأ امامه ولم يقرأ هو صلوته باطلة۔" (المغنی ج:۱ ص:[illegible])

ترجمہ:... "امام احمد فرماتے ہیں کہ: ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب امام جہری قراءت کرے تو مقتدی کی نماز صحیح نہیں ہوتی جبکہ وہ خود قراءت نہ کرے۔ امام احمد نے فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ و تابعین ہیں، یہ اہل حجاز میں امام مالک ہیں، یہ اہل عراق میں امام ثوری ہیں، یہ اہل شام میں امام اوزاعی ہیں، یہ اہل مصر میں امام لیث ہیں، ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جب امام قراءت کرے اور مقتدی قراءت نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔"

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ نے اس آیت سے یہی سمجھا ہے کہ جب مقتدی کو خود قراءت کرنے کے بجائے امام کی قراءت کی طرف متوجہ ہونے اور خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ نکلتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قراءت فرض نہیں، بلکہ اس کا فریضہ امام کی قراءت کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام کی قراءت صرف اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے، ورنہ مقتدیوں کو امام کی قراءت کے استماع و انصات کا حکم نہ دیا جاتا۔ پس اگرچہ قراءت نماز میں فرض ہے مگر مقتدی اس فرض کو خود اپنی زبان سے ادا نہیں کرے گا، بلکہ اس کا یہ فرض امام کی زبان سے ادا ہوگا، اور امام کی قراءت مقتدی کی بھی قراءت سمجھی جائے گی۔

الغرض یہ تین مضمون ہیں جو اس آیت کریمہ سے ارشاد ہوئے ہیں:

اول: مقتدی کا کام قراءت کرنا نہیں، بلکہ امام کی قراءت کو سننا اور خاموش رہنا ہے۔

دوم: قراءت مقتدی کے ذمہ فرض نہیں، بلکہ یہ فرض اس کی جانب سے امام ادا کرے گا۔

سوم:... امام کی قراءت تنہا اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے، اس لئے امام کی قراءت مقتدی ہی کی قراءت ہے۔

ان تین نکات کو خوب اچھی طرح ذہن میں رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ پر غور فرمایئے تو وہاں بھی امام اور مقتدی کے تعلق میں انہی تین چیزوں کی تفصیل دکھائی دے گی، چنانچہ:

۱:... صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"انَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَنَا، فَبَيَّنَ لَنَا سُنَّتَنَا وَعَلَّمَنَا صَلٰوتَنَا، فَقَالَ: اِذَا صَلَّيْتُمْ فَاَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ، ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ اَحَدُكُمْ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا (وفي حديث جرير عن سليمان عن قتادة من الزيادة: "وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا") وَاِذَا قَالَ: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، فَقُوْلُوْا: آمِيْنَ، يُجِبْكُمُ اللهُ، فَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا. الحديث."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۷۴، باب التشہد، نسائی ج:۱ ص:[illegible]، ابوداؤد ج:۱ ص:[illegible]، ابن ماجہ ص:۶۱، مسند احمد ج:۴ ص:[illegible])

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، پس ہمارے لئے ہمارا طریقہ کار واضح فرمایا، اور ہمیں ہماری نماز سکھائی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم نماز شروع کرو تو صفیں خوب اچھی طرح سیدھی کرلیا کرو، پھر تم میں کا ایک شخص امام بنے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو۔ (اور بروایت جریر عن سلیمان عن قتادہ اس حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ:) "اور جب وہ قراءت شروع کرے تو تم خاموش ہوجاؤ" اور جب وہ "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کریں گے، پھر جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو۔"

تصریح ہے کہ امام کی قراءت میں امام اور مقتدی دونوں شریک ہیں، اور یہ شرکت امام کی قراءت اور مقتدی کی خاموشی کے دو طرفہ عمل کی بدولت ہے، پس اگر مقتدی خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ اپنی قراءت میں مشغول ہو جائے تو ایک تو وہ اپنے اس وظیفے سے روگردانی کرنے والا ہوگا، جو قرآن کریم اور حدیث نبوی نے اس کے لئے متعین فرمایا ہے، یعنی استماع و انصات، دوسرے ایسی حالت میں امام کی قراءت میں اس کی شرکت متصور نہیں ہو سکتی جبکہ شارع کا مقصد اور مطمح نظر مقتدی کو امام کی قراءت میں شریک کرنا ہے۔

سوم:... یہ کہ مقتدی کو حکم دیا گیا ہے کہ جب امام "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو مقتدی "آمین" کہے، جس سے ایک تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امام کی قراءت شروع ہونے کے بعد مقتدی کو پہلی بار سورۂ فاتحہ کے ختم پر بولنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے قبل اس کے لئے سوائے خاموشی کے کوئی وظیفہ مقرر نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ مقتدی، امام کی فاتحہ پر "آمین" کہنے کے لئے اسی لئے مأمور کیا گیا کہ سورۂ فاتحہ میں جو درخواست امام پیش کر رہا ہے، وہ صرف اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہا، بلکہ پوری قوم کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اس لئے ختمِ فاتحہ پر تمام مقتدی "آمین" کہہ کر اس کی درخواست کی تائید کرتے ہیں۔ اگر یہ حکم ہوتا کہ امام اپنی فاتحہ پڑھے اور مقتدی اپنی اپنی پڑھیں تو اس طرح اجتماعی "آمین" کہنے کا حکم نہ دیا جاتا، بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی فاتحہ پر "آمین" کہنے کا حکم ہوتا۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام اور مقتدی سب کو امام کی فاتحہ پر "آمین" کہنے کا حکم فرمایا، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ نماز باجماعت میں سورۂ فاتحہ پڑھ کر درخواست کی جاتی ہے، وہ ہر ایک کی انفرادی درخواست نہیں، بلکہ ایک وفد کی شکل میں اجتماعی درخواست ہے، امام اس وفد کا امیر ہے، اور وہی پوری قوم کی جانب سے متکلم ہے، اس لئے اس اجتماعی درخواست پر "آمین" بھی اجتماعی مقرر فرمائی گئی۔ اور اگر ایک شخص کو علیحدہ علیحدہ اجتماعی درخواست پیش کرنا منظور نہ ہوتا تو نماز باجماعت کی ضرورت ہی نہ ہوتی، ہر شخص اپنی انفرادی نماز میں انفرادی درخواست کر لیا کرتا، وہ جماعت، جماعت نہیں کہلاتی، اور نہ وہ وفد، وفد ہوتا ہے جس کا

یک امیر اور ایک متکلم نہ ہو، بلکہ ہر شخص انفرادی طور پر اپنی اپنی درخواست پیش کیا کرے۔

چہارم:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقتدی کے فرائض کی تشریح کرتے ہوئے تمہیداً یہ ارشاد فرمایا ہے:

"إنما جعل الإمام ليؤتم به." (نسائی ج:۱ ص:۱۴۶)

ترجمہ:... "امام اسی لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔"

اس میں تعلیم دی گئی ہے کہ مقتدی کا کام امام کی اقتدا و متابعت کرنا ہے، نہ کہ اس کی مخالفت، اور متابعت و مخالفت ہر رکن میں اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہوگی۔ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہنا متابعت ہے، اس سے پہلے تکبیر کہہ لینا یا اس کی تکبیر پر تکبیر نہ کہنا مخالفت ہے۔ اسی طرح جب وہ رکوع کرے تب رکوع کرنا متابعت ہے، اس سے پہلے رکوع کرلینا، یا اس کے رکوع میں جانے کے باوجود مقتدی کا رکوع نہ کرنا اس کی مخالفت ہے۔ اور رکوع سے اٹھ کر جب وہ "سمع الله لمن حمده" کہے تو جواب میں "ربنا ولك الحمد" کہنا متابعت ہے، اور وہی فقرہ جو امام نے کہا ہے اس کا دہرانا متابعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح جب امام قراءت شروع کرے تو مقتدی کا اپنے ذکر و اذکار بند کرکے امام کی قراءت کی طرف متوجہ ہونا متابعت ہے، اور امام کے مقابلے میں اپنی قراءت شروع کردینا مخالفت ہے، جس کو حدیث میں منازعت سے تعبیر فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ شریعت نے مقتدی کو امام کی اقتدا اور متابعت کا حکم دیا ہے، اور اسی متابعت اور جماعیت کی غرض سے نماز باجماعت شروع کی گئی ہے، اور قراءت کے موقع پر امام کی متابعت یہی ہے کہ مقتدی امام کی قراءت کی طرف متوجہ رہے اور خاموش رہے، امام کے مقابلے میں خود اپنی قراءت شروع کردینا متابعت نہیں، بلکہ مخالفت اور منازعت ہے، اس لئے حکم دیا گیا:

ترجمہ:... "اور امام جب قراءت شروع کرے تو خاموش ہوجاؤ۔"

besturdubooks.wordpress.com

دوم:... اگر ابن شداد کی روایت کے مطابق اس کو مرسل بھی فرض کیا جائے تب بھی ظاہرِ قرآن و سنت اس کا مؤید ہے، جس کی تفصیل اوپر کی سطور میں گزر چکی ہے۔

سوم:... جماعتِ صحابہؓ و تابعینؒ کا فتویٰ اسی حدیث کے مطابق ہے، چنانچہ:

۱:... صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۱۵ میں عطاء بن یسار سے مروی ہے کہ انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے قراءت مع الامام کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:

"لا قراءة مع الامام في شيء."

(سنن نسائی ج:۱ ص:۱۴۶)

ترجمہ:... "امام کے ساتھ کسی نماز میں قراءت نہیں۔"

۲:... "سنن نسائی" ج:۱ ص:۱۴۶ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفِيْ كُلِّ صَلٰوةٍ قِرَاءَةٌ؟ قَالَ: نَعَمْ! قَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ: وَجَبَتْ هٰذِهٖ، فَالْتَفَتَ إِلَيَّ وَكُنْتُ أَقْرَبَ الْقَوْمِ مِنْهُ فَقَالَ: مَا أَرَى الْإِمَامَ إِذَا أَمَّ الْقَوْمَ إِلَّا قَدْ كَفَاهُمْ."

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قراءت ہوتی ہے؟ فرمایا ہاں! انصار میں سے ایک آدمی نے کہا: یہ تو واجب ہوگئی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف التفات فرمایا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر بیٹھا تھا، پس فرمایا کہ: امام جب کسی قوم کی امامت کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب کی طرف سے کافی ہے۔"

امام نسائی رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا ہے کہ: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں، بلکہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے، لیکن مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۱۰ میں طبرانی کی روایت سے یہ حدیث مرفوعاً مروی ہے، اور ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اس کی اسناد حسن ہے۔

وإذا صلى وحده فليقرأ. قال: وكان عبدالله بن عمر لا يقرأ خلف الإمام۔" (ص:۲۹، موطا امام محمد ص:۹۸)

ترجمہ:... "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جب دریافت کیا جاتا ہے کہ کیا امام کی اقتدا میں قراءت کی جائے؟ تو فرماتے کہ: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قراءت کافی ہے، اور جب تنہا پڑھے تو قراءت کرے۔ نافع کہتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قراءت نہیں کیا کرتے تھے۔"

ان کے علاوہ متعدد صحابہ و تابعین کے فتاویٰ موطا امام محمد، کتاب الآثار، شرح معانی الآثار طحاوی، مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں موجود ہیں۔

سوم:... جیسا کہ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس مرسل روایت کا سلسلۂ سند صحابی کے بجائے طبقۂ صحابہ کے تابعی پر ختم ہے، جو اکثر و بیشتر صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں مرسل روایت حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جن کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہوئی، اس لئے ان کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے، اور علمی طبقے کے لحاظ سے ان کو کبار تابعین میں شمار کیا جاتا ہے، اس لئے ان کی مرسل حدیث کی حیثیت ایک اعتبار سے مراسیل صحابہ کی ہے، جو بالاتفاق حجت ہیں، اور چونکہ ان کی بیشتر احادیث حضرات صحابہ کرام سے ہیں، اس لئے یہ حدیث بھی انہوں نے کسی صحابی سے سنی ہوگی، خصوصاً جبکہ بعض طرق صحیحہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واسطہ بھی مذکور ہے۔

الغرض: ان متعدد دلائل و شواہد کی روشنی میں حدیث: "من كان له امام فقراءة الامام له قراءة" بلاشبہ صحیح اور لائق حجت ہے، قرآن کریم، احادیث نبویہ اور آثار صحابہ سے مؤید ہے، امام اعظم ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ نے اس سے استدلال کیا ہے، اس لئے حنفیہ اور جمہور علماء امام کی قراءت کو مقتدی کے لئے کافی سمجھتے ہیں، اور مقتدی کو آیت اور حدیث کے

besturdubooks.wordpress.com

کی قراءت کے وقت مقتدی کے خاموش رہنے کو واجب جانتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے دلائل:

اور سوال میں جوڑ کر کیا گیا ہے: ''اور حدیثِ مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۂ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھو۔''

ذخیرۂ احادیث میں کوئی حدیث ایسی نہیں ملی جس میں مقتدی پر فاتحہ کی قراءت واجب ٹھہرائی گئی ہو، اور یوں بھی یہ بات عقلاً مستبعد ہے کہ ایک طرف قرآنِ کریم اور احادیث شریفہ میں مقتدی کو خاموش رہنے اور امام کی قراءت سننے کا حکم دیا گیا ہو، اور دوسری طرف عین امام کی قراءت کے وقت اسے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی دیا جائے۔ ایک طرف امام کی قراءت کو بعینہٖ مقتدی کی قراءت فرمایا گیا ہو، اور پھر مقتدی کے ذمے بھی قراءت کو واجب ٹھہرایا گیا ہو، البتہ اس مضمون کی احادیث ضرور مروی ہیں کہ بعض حضرات نے از خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قراءت شروع کردی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر فرمائی، اور پھر بعض روایات کے مطابق سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، ذیل میں ہم ان احادیث پر غور کرکے شارع علیہ السلام کے مقصد و مدعا کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

حدیث: ''لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ'':

جو حضرات فاتحہ خلف الامام کا حکم کرتے ہیں، صحت کے اعتبار سے ان کی سب سے قوی دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ۔ متفق علیہ،
وفی روایۃ لمسلم: لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فصاعدا۔''

(مشکوٰۃ ص ۷۸)

ترجمہ:... ''نماز نہیں اس شخص کی، جس نے نہیں پڑھی فاتحۃ الکتاب، یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے، اور صحیح مسلم کی ایک

besturdubooks.wordpress.com

قراءت واجب اور ضروری ہے، جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ جب کوئی شخص امام کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اسے فریضۂ قراءت خود ادا کرنا ہوگا یا امام اس کی طرف سے نمائندگی کرے گا؟ پہلے مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادِ گرامی: "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعدا" میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا وجوب تو متعین ہے، اور چونکہ سورۂ فاتحہ میں ہدایت کی درخواست کی گئی ہے، اور اس سے والناس تک پورا قرآن کریم اسی درخواست کا جواب ہے، اس لئے نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد اس کے جواب کا کچھ حصہ بھی واجب ہے، چنانچہ متعدد احادیث میں اس کے ساتھ "فصاعدا" اور "وما زاد" بھی مروی ہے، یعنی سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کا کچھ مزید حصہ بھی تلاوت کرنا ضروری ہے۔

بہرحال اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں قراءت کی مقدار واجب کو متعین فرمایا ہے، اور وہ ہے سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کا کچھ مزید حصہ۔

اور دوسرے مسئلہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد:

"من کان لہ امام فان قراءۃ الامام لہ قراءۃ"

(ابن ماجہ ص ۶۱، مسند احمد ج ۳ ص ۳۳۹)

ترجمہ: "جس کے لئے امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔"

میں بیان فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی کو چونکہ استماع و انصات کا حکم ہے، اس لئے وہ بذاتِ خود قراءت نہیں کرے گا، بلکہ امام اس کی جانب سے قراءت کا حق ادا کرے گا، اور امام کی قراءت مقتدی کی قراءت شمار ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کو "قاری" کے لقب سے ملقب فرماکر مقتدی کو اس کی قراءت پر "آمین" کہنے کا حکم دیا۔ مشکوٰۃ شریف ص ۸۰ میں صحیح بخاری کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی نقل کیا ہے:

"اذا امّن القاری فامّنوا فان الملٰئکۃ تؤمن"

فمن وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه۔ (صحیح بخاری ج۲ ص ۹۴۷)

ترجمہ… "جب" قراءت کرنے والا" آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں، پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوئی اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ فرشتے خود سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہیں کرتے، بلکہ صرف امام کی آمین پر آمین کہتے ہیں، اور ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین میں فرشتوں کی موافقت کا حکم فرمایا ہے، اور اس پر مغفرت ذنوب کا وعدہ فرمایا ہے، اور اس وعدے کو صرف آمین کہنے پر معلق فرمایا ہے نہ کہ خود بھی قراءت کرنے پر، پس امام کو "قاری" کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قراءت کرنا امام کا منصب ہے، اور مقتدی کا منصب امام کی قراءت کو سننا اور خاموش رہنا ہے۔ واللہ اعلم!

واقعہ یہ ہے جب دو الگ الگ مسئلوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الگ الگ حکم صادر فرمائے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسئلے سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے، اسے اٹھا کر دوسری جگہ چسپاں کر دیا جائے، اور دوسری جگہ کے لئے جو حکم فرمایا ہے، اسے بالکل چھوڑ دیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ مقتدی بھی سورۂ فاتحہ کی قراءت کرتا ہے، مگر بصورت خود نہیں بلکہ بحکم "من كان له امام فقراءة الامام له قراءة" امام کے واسطے سے قراءت کرتا ہے، اور شارع نے امام کی قراءت کو حکماً مقتدی کی قراءت قرار دیا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ چونکہ مقتدی نے قراءت نہیں کی، اس لئے اس کی نماز نہیں ہوئی۔

محمد بن اسحاق کی روایت:

ان حضرات کی ایک دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو محمد بن اسحاق کی روایت سے مروی ہے

"عن عبادة بن الصامت رضی الله عنه قال: كنا

خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صلوۃ الفجر فقرأ فثقلت علیہ القراءۃ، فلما فرغ قال: لعلکم تقرؤون خلف امامکم؟ قلنا: نعم یا رسول اللہ! قال: لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب، فانہ لا صلوۃ لمن لم یقرأ بھا۔ رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی معناہ، وفی روایۃ لابی داؤد قال: وانا اقول ما لی ینازعنی القرآن، فلا تقرؤوا بشیء من القرآن اذا جھرت الا بام القرآن۔" (مشکوٰۃ ج:۱ ص:۸۱)

ترجمہ:... "حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قراءت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قراءت دشوار ہوگئی، نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: شاید تم اپنے امام کے پیچھے قراءت کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: ایسا نہ کیا کرو سوائے فاتحۃ الکتاب کے، کیونکہ نماز نہیں اس شخص کی جو اس کو نہ پڑھے۔ اس کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھی کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جارہا ہے (یعنی پڑھنے میں الجھن ہورہی ہے)۔ پس جب میں بلند آواز سے قراءت کروں تو کچھ نہ پڑھا کرو سوائے ام القرآن کے۔"

اگرچہ امام بیہقی، امام دارقطنی اور دیگر بعض شافعیہ رحمہم اللہ نے اپنے مسلک کے مطابق اس حدیث کی تصحیح کی ہے، چنانچہ امام خطابی رحمہ اللہ "معالم السنن" (ج:۱ ص:۲۰۵) میں فرماتے ہیں:

"ھذا الحدیث نص بان قراءۃ فاتحۃ الکتاب

واجبۃٌ علٰی من صلّٰی خلف الامام، سواءٌ جهر الامام بالقراءۃ أو خافت بها واسنادہٗ جیّدۃٌ لا طعن فیه۔"

ترجمہ:... "یہ حدیث نص ہے اس بات پر کہ فاتحۃ الکتاب کا پڑھنا واجب ہے اس شخص پر جو امام کے پیچھے نماز پڑھے، خواہ امام جہری قراءت کرے یا سری، اور اس کی سند جید ہے، اس میں کوئی طعن نہیں۔"

لیکن یہ حدیث سند اور متن دونوں کے اعتبار سے مضطرب ہے، اور امام احمد اور دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ نے اس کی تضعیف کی ہے، شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وهذا الحدیث معلّلٌ عند أئمۃ الحدیث بأمور کثیرۃ، ضعّفه أحمد وغیرہ من الأئمۃ، وقد بسط الکلام علٰی ضعفه فی غیر هذا الموضع، وبیّن أن الحدیث الصحیح قول النبی صلی الله علیه وسلم: "لا صلٰوۃ الا بأم القرآن" فهذا الذی أخرجاہ فی الصحیحین ورواہ الزهری عن محمود بن الربیع عن عبادۃ رضی الله عنه وأما هذا الحدیث فغلط فیه بعض الشامیین وأصله أن عبادۃ کان یؤم ببیت المقدس فقال هذا، فاشتبه علیهم المرفوع بالموقوف علٰی عبادۃ۔"

(فتاوی ابن تیمیہ ج:۲۳ ص:۲۸۶، طبع جدید)

ترجمہ:... "یہ حدیث بہت سی وجوہ سے ائمہ حدیث کے نزدیک معلول ہے، امام احمدؒ اور دیگر ائمہ حدیث نے اس کی تضعیف کی ہے، اس حدیث کے ضعف پر دوسری جگہ تفصیل سے کلام کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صحیح حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ: "ام القرآن کے بغیر نماز نہیں" یہی حضرت

عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے جو سنن میں مروی ہے، اور اسے زہری نے بواسطہ محمود بن ربیع حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، لیکن یہ حدیث (جس میں اختلاط کا قصہ ہے) اس میں بعض شامیوں نے غلطی کی ہے، اور اصل اس کی یہ ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے امام تھے، اور یہ بات (قرأت خلف الامام کی) انہوں نے کہی تھی، لیکن راویوں کو اشتباہ ہوا، اور انہوں نے حضرت عبادہ کے قول کو حدیث مرفوع کی حیثیت سے نقل کر دیا۔"

شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جو لکھا ہے، اس کی طرف امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اشارہ فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"وقرأ عبادة بن الصامت بعد النبي صلى الله عليه وسلم خلف الإمام وتأوّل قول النبي صلى الله عليه وسلم لا صلوٰة إلا بقراءة فاتحة الكتاب."

(ترمذی ج:۱ ص:۴۲)

ترجمہ: "... اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام کے پیچھے قرأت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "لا صلوٰة إلا بقراءة فاتحة الكتاب" سے استدلال کیا۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس ارشاد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ: "لا صلوٰة إلا بفاتحة الكتاب" کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے جواز کے قائل تھے، یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا، جیسا کہ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے، راویوں کو اشتباہ ہوا اور انہوں نے اس کو مرفوع حدیث کی حیثیت سے نقل کر دیا۔

یہاں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع حدیث جو سنن کے حوالے سے نقل

جو بجائے خود ضعیف اور مضطرب ہے، لیکن اگر اس کے ضعف و اضطراب سے قطع نظر کرکے اس کو صحیح فرض کرلیا جائے تب بھی یہاں چند امور قابلِ غور ہیں۔

اوّل:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا کہ: "شاید تم اپنے امام کے پیچھے قراءت کیا کرتے ہو" اس امر کی دلیل ہے کہ اس واقعے سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قراءت خلف الامام شروع نہیں کی گئی تھی، اور جو حضرات امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم و اجازت کے بغیر کرتے تھے۔

دوم:... بجائے اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ: "شاید تم میرے پیچھے قراءت کیا کرتے ہو" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ: "شاید تم اپنے امام کے پیچھے قراءت کیا کرتے ہو" اس امر کی دلیل ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا منصبِ امامت کے خلاف ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر نکیر فرمارہے ہیں، اس لئے امام کے پیچھے قراءت کرنا شرعاً نادرست اور لائقِ نکیر ہے۔

سوم:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کے جواب میں ایک شخص یا چند اشخاص کا یہ کہنا کہ ہم ایسا کرتے ہیں، اس امر کی دلیل ہے کہ قراءت خلف الامام صحابہ کرامؓ کا عام معمول نہیں تھا، غالباً بعض حضرات جن کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، ایسا کرتے تھے۔ ابوداؤد میں ۱۱۹ پر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کا جو قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کو صبح کی نماز میں تاخیر ہوگئی، ابونعیم موٴذن نے نماز شروع کردی، اور حضرت عبادہؓ نے ان کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو نافع بن محمود نے حضرت عبادہؓ سے عرض کیا کہ امام قراءت کر رہا تھا اور آپ سورۂ فاتحہ پڑھ رہے تھے، دارقطنی میں ۱۲۱ کی روایت میں ہے:

"قلت لعبادة: قد صنعت شيئا، فلا أدري أسنة
هي أم سهو كانت منك؟" (دارقطنی ج:۱ ص:۳۱۸)

ترجمہ:... "نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہؓ سے
عرض کیا کہ آپ نے آج ایک ایسا کام کیا ہے، جس کے بارے
میں مجھے معلوم نہیں کہ آیا وہ سنت ہے یا آپ نے بھول کر کیا ہے؟"

لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دے دی گئی، کیونکہ نہی کے بعد امر اباحت کے لئے ہوتا ہے، وجوب کے لئے نہیں۔ پس حدیث عبادہ سے معلوم ہوا کہ قراءت فاتحہ کو مقتدی کے لئے مباح فرمایا گیا مگر یہ اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اباحت مرجوحہ تھی، چنانچہ ابن ابی شیبہ (ج:۱ ص:۳۷۴) میں حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ کی مرسل روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"أنّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال لأصحابه: هل تقرؤون خلف إمامكم؟ فقال بعض: نعم! وقال بعض: لا! فقال: إن كنتم لا بد فاعلين فليقرأ أحدكم فاتحة الكتاب في نفسه."

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم اپنے امام کے پیچھے قراءت کیا کرتے ہو؟ بعض نے اثبات میں جواب دیا، اور بعض نے نفی میں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم کو ضرور پڑھنا ہی ہے تو تم میں کا ایک فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرے۔"

اس روایت میں "اگر تم کو پڑھنا ہی ہے" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی کے لئے فاتحہ کا پڑھنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے، سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دی جارہی ہے مگر ایسے الفاظ میں جن سے ناگواری مترشح ہوتی ہے، اور یہ مطلب بھی اس صورت میں ہے کہ "دل میں پڑھنے" سے مراد زبان سے آہستہ پڑھنا ہو، اور اگر اس سے تدبر و تفکر مراد لیا جائے تو زبان سے پڑھنے کی اجازت بھی ثابت نہیں ہوتی۔

ششم:... چونکہ قراءت کی ممانعت اور سورۂ فاتحہ کی اجازت کے باوجود بھی الجھن کی صورت پیش آتی تھی، اس لئے مطلقاً ممانعت فرمادی گئی، جیسا کہ مؤطا امام مالک و نسائی کی روایت میں ہے:

"عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله

صلى الله عليه وسلم انصرف من صلاة جهر فيها بالقراءة فقال: هل قرأ معي أحد منكم آنفا؟ فقال رجل: نعم يا رسول الله، قال: إني أقول ما لي أنازع القرآن، قال: فانتهى الناس عن القراءة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما جهر فيه بالقراءة من الصلوات حين سمعوا ذلك من رسول الله صلى الله عليه وسلم."

(رواه مالك واحمد وابوداؤد والترمذی والنسائی

وروی ابن ماجہ نحوہ، مشکوٰۃ ص:۸۱)

ترجمہ:... "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی نماز سے، جس میں جہری قرأت فرمائی تھی، فارغ ہوئے تو فرمایا: کیا ابھی میرے ساتھ تم میں سے کسی نے کچھ پڑھا تھا؟ ایک شخص نے کہا: جی ہاں! میں نے پڑھا تھا۔ فرمایا: میں بھی سوچ رہا تھا کہ کیا بات ہے، مجھے قرآن پڑھنے میں کشمکش کیوں ہو رہی ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہری نمازوں میں قرأت کرنے سے رک گئے۔"

ہفتم: مقتدی کی قرأت خلف الامام سے امام کی قرأت میں گڑبڑ ہونے کا قصہ صرف جہری نمازوں سے مخصوص نہیں، بلکہ سری نمازوں میں بھی اس سے گڑبڑ پیدا ہوسکتی ہے، چنانچہ صحیح مسلم (ج:۱ ص:۱۷۲) میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"قال: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الظهر أو العصر فقال: أيكم قرأ خلفي بسبح اسم ربك الأعلى؟ فقال رجل: أنا، ولم أرد بها إلا الخير.

قال: قد علمتُ أنّ بعضکم خالجنیھا۔"

ترجمہ:... "فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو فرمایا: تم میں سے کس نے میرے پیچھے "سبح اسم ربک الاعلیٰ" پڑھی تھی؟ ایک شخص نے کہا کہ: میں نے پڑھی تھی، اور میں نے اس سے خیر کے سوا کسی چیز کا ارادہ نہیں کیا۔ فرمایا: میں سمجھ رہا تھا کہ تم میں سے بعض نے اس میں مجھ سے منازعت کی ہے۔"

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"قال: کانوا یقرؤون خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: خلطتم علیّ القرآن۔" (رواہ احمد وابو یعلیٰ والبزار، ورجال احمد رجال الصحیح، مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۱۰)

ترجمہ:... "لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قراءت کیا کرتے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم نے مجھ پر قراءت گڈمڈ کردی۔"

پس چونکہ مقتدی کے ذمے قراءت واجب نہیں کی گئی، بلکہ امام کی قراءت کو اس کے لئے کافی قرار دیا گیا ہے، اور چونکہ مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اور چونکہ اس کی قراءت کی وجہ سے امام کی قراءت میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے، اور چونکہ یہ اُمور سری اور جہری نمازوں میں یکساں ہیں، اس لئے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ قراءت خلف الامام کے مطلقاً قائل نہیں، اور جیسا کہ اُوپر معلوم ہوا، یہی جمہور تابعین کا عام معمول بھی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی، اور بعد میں بھی۔

سکتاتِ امام کی بحث:

اور جو حضرات قراءت خلف الامام کے قائل ہیں، وہ بھی عین امام کی قراءت کے وقت مقتدی کے لئے قراءت کرنے کو معیوب اور قرآنِ کریم کے ارشاد: "فاستمعوا لہ

وانصتوا" اور ارشادِ نبوی: "واذا قرأ فانصتوا" سے خارج سمجھتے ہیں، اس لئے وہ سکتاتِ امام میں پڑھنے کا حکم فرماتے ہیں، لیکن کسی حدیث میں امام کو مقتدی کی قراءت کے لئے سکتے کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، اور نہ امام کو مقتدیوں کے تابع کرنا صحیح ہوسکتا ہے۔ اگر سکتاتِ امام میں مقتدی پر قراءتِ فاتحہ لازم ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ امام کو اس کے لئے پابند کیا جاتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین سکتات فرماتے تھے، ایک قراءت سے پہلے، اور یہ صرف ثنا کے لئے ہوتا تھا، اس وقت اگر مقتدی فاتحہ پڑھے تو اس سے مقتدی کا فاتحہ میں تقدم لازم آتا ہے، اور جب تمام ارکان میں مقتدی کو امام سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں، تو یہاں یہ اجازت کیسے ہوسکتی ہے کہ امام کے قراءت شروع کرنے سے پہلے ہی قراءت کرتا رہے؟

اور ایک سکتہ سورۂ فاتحہ کے بعد اور ایک رکوع سے قبل ہوتا تھا، مگر یہ سکتات عام معمول کے مطابق ہوتے تھے، اور ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ سکیں۔ بہرحال سکتات میں مقتدی کا فاتحہ پڑھنا بھی بعض حضرات کا اجتہاد تھا، لیکن جب مقتدی کے ذمے قراءت واجب ہی نہیں تو ان کو اس تکلف کی ضرورت ہی کیوں ہو؟

ایک شبہ کا ازالہ:

اور سوال میں جو یہ شبہ کیا گیا ہے کہ:

"جب امام کا فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے، پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے؟ جیسے: ثنا، تسبیحات، تشہد، درود شریف وغیرہ۔"

اس کا جواب حدیث: "واذا قرأ فانصتوا" کی شرح میں اوپر گزر چکا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کو دوسرے ارکان تو امام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم فرمایا، لیکن امام کی قراءت کے وقت اس کو قراءت کرنے کا نہیں، بلکہ خاموش رہنے کا حکم فرمایا، جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام، مقتدی کی طرف سے قراءت کا تحمل کرتا ہے، دوسرے ارکان کا تحمل نہیں کرتا۔

besturdubooks.wordpress.com

سوالِ سوم:... اذان و اقامت کے کلمات:

"سوال... متفق علیہ کی حدیث میں اذان کے کلمات جفت اور اقامت طاق پڑھنے کا ذکر موجود ہے یا یہ کہ اگر اذان ترجیع سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے، تو سوال یہ ہے کہ اذان و اقامت دونوں جفت کہی جاتی ہیں، کس دلیل سے ہے؟ بحوالہ کتب احادیث وضاحت فرمائیں، ساتھ ہی صحت کے اعتبار سے کون سی اذان و اقامت بہتر ہے؟"

جواب:... اس بحث میں چند امور لائق ذکر ہیں:

۱:... سوال میں جس متفق علیہ حدیث کا ذکر ہے، وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: ذَكَرُوا النَّارَ وَالنَّاقُوْسَ، فَذَكَرُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، فَأُمِرَ بِلَالٌ أَنْ يَّشْفَعَ الْأَذَانَ وَأَنْ يُّوْتِرَ الْإِقَامَةَ، قَالَ إِسْمَاعِيْلُ: فَذَكَرْتُهُ لِأَيُّوْبَ فَقَالَ: إِلَّا الْإِقَامَةَ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۶۳)

ترجمہ:... "حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ نے (نماز کی اطلاع کے لئے) آگ جلانے اور گھنٹی بجانے کا تذکرہ کیا، تو یہود و نصاریٰ کا ذکر آیا، پس حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ اذان جفت کہا کریں اور اقامت طاق کہا کریں۔ اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ایوب سے ذکر کی تو انہوں نے فرمایا: مگر اقامت۔"

۲:... حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ابتدائے تشریعِ اذان کے

besturdubooks.wordpress.com

کلمات دو دو مرتبہ اور اقامت کے ایک مرتبہ ذکر ہیں۔" (ص:۷۰)

ب:... لیکن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی روایت میں ہے:

"فقام على المسجد فأذّن ثم قعد قعدة ثم قام فقال مثلها إلا أنه يقول قد قامت الصلوة."

(ابوداؤد ج:۱ ص:۷۵)

ترجمہ:... "وہ (فرشتہ) مسجد پر کھڑا ہوا، پس اس نے اذان کہی، پھر ذرا سا بیٹھا پھر کھڑا ہوا، تو اسی کی مثل الفاظ کہے، مگر اس میں "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ کیا۔"

ایک روایت میں اذان کے کلمات الگ الگ ذکر کر کے یہ کہا ہے:

"ثمّ أمهل هنيئةً ثمّ قام فقال مثلها إلّا أنّه قال زاد بعد حيّ على الفلاح قد قامت الصّلوة قد قامت الصّلوة." (ص:۷۵)

ترجمہ:... "پھر ذرا سا ٹھہرا، پھر اٹھا، پس اسی کے مثل الفاظ کہے مگر "حی علی الفلاح" کے بعد "قد قامت الصلوٰۃ" دو مرتبہ کا اضافہ کیا۔"

ایک روایت میں عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ صاحبِ واقعہ سے نقل کرتے ہیں:

"قال: كان أذان رسول الله صلى الله عليه وسلم شفعًا شفعًا في الأذان والإقامة." (ترمذی ج:۱ ص:۴۸)

ترجمہ:... "وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذان و اقامت دونوں میں دو دو مرتبہ الفاظ تھے۔"

ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں:

"حدثنا أصحاب رسول الله صلى الله عليه

وسلم أن عبدالله بن زيد الأنصاري جاء إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله! رأيت في المنام كأن رجلًا قام وعليه بردان أخضران فقام على جذمة حائط فأذن مثنى وأقام مثنى وقعد قعدة، قال: فسمع ذلك بلال، فقام فأذن مثنى وأقام مثنى." (ج:۱ ص:۲۰۳)

ترجمہ:... "ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے بیان کیا کہ عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، پس عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک آدمی جس نے دو سبز چادریں پہن رکھی تھیں، کھڑا ہوا، پس اس نے دو دو مرتبہ اذان کے اور دو دو مرتبہ اقامت کے کلمات کہے۔"

نصب الرایہ (ج:۱ ص:۲۶۷) میں اس روایت کو نقل کرکے حافظ ابن دقیق العید رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

"وهذا رجال الصحيح، وهو متصل على مذهب الجماعة في عدالة الصحابة وأن جهالة أسمائهم لا تضر."

ترجمہ:... "اس سند کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں، اور یہ محدثین کے مطابق سند متصل ہے، کیونکہ تمام صحابہ عادل ہیں اور ان کا نام نامعلوم ہونا مضر نہیں۔"

اور نصب الرایہ کے حاشیہ میں محلّی ابن حزم (ج:۳ ص:۱۵۸) سے نقل کیا ہے:

"وهذا إسناد في غاية الصحة من إسناد الكوفيين."

ترجمہ:... "اور یہ سند اہلِ کوفہ کی اسانید میں سے نہایت صحیح سند ہے۔"

۳:... ان روایات میں پہلی روایت میں عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ "حدثنا أصحابنا"

besturdubooks.wordpress.com

کہتے ہیں، دوسری میں "عن معاذ بن جبل" فرماتے ہیں، تیسری میں "عن عبد اللہ بن زید الانصاری" کہتے ہیں، اور چوتھی میں "حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم" فرماتے ہیں۔

دوسری اور تیسری روایت پر محدثین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کو حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبد اللہ بن زید الانصاری رضی اللہ عنہما سے سماع حاصل نہیں، اس لئے یہ دونوں روایتیں منقطع ہیں، مگر اصل قصہ یہ ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تواتر کے ساتھ سنا تھا، اس لئے وہ کسی ایک صحابی کے نام سے اس کی روایت نہیں کرتے، بلکہ کبھی "حدثنا اصحابنا" کہتے ہیں، اور کبھی "حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم" فرماتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ واقعہ حضرت عبد اللہ بن زید الانصاری رضی اللہ عنہ کا ہے، اس لئے وہ کبھی ارسالاً ان کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، اور چونکہ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی ذکر کیا گیا ہے، اس لئے ارسالاً ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، چنانچہ اگر انہوں نے حضرت عبد اللہ بن زید انصاری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے براہِ راست استفادہ نہ بھی کیا ہو، تب بھی چونکہ وہ کسی تابعی سے نہیں بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی کے واسطے سے نقل کرتے ہیں، اس لئے ان کا ارسال مضر نہیں۔

۵:... ان روایات میں اقامت کے بارے میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، مگر واقعے کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ اقامت کے کلمات ٹھیک وہی تھے جو اذان کے کلمات تھے، مگر اس میں "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ تھا، جیسا کہ متعدد روایات میں وارد ہے، اس لئے جس روایت میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اقامت کے کلمات مفرد ذکر کئے گئے ہیں، وہ اختصار پر محمول ہیں۔

۶:... چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان و اقامت فرشتے کی تعلیم کردہ اذان و اقامت کے مطابق تھی، اس لئے ان کی اذان بغیر ترجیع کے پندرہ کلمات پر مشتمل تھی، اور اقامت "قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ" کے اضافے کے ساتھ سترہ

مثنیٰ، لا اُمّ لک۔"　　　　[مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۵]

ترجمہ:... "حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اذان کے کلمات دو دو مرتبہ ہوتے ہیں، اور اقامت کے بھی، اور آپ ایک مؤذن کے پاس آئے جو ایک ایک مرتبہ اقامت کے کلمات کہتا تھا تو آپ نے فرمایا: تو نے اس کو دو دو مرتبہ کیوں نہ کہا، تیری ماں نہ رہے۔"

اور بیہقی کی خلافیات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: جس نے اقامت کو سب سے پہلے مفرد کیا، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔

۹:... اذان اور اقامت کے کلمات میں جو اختلاف ہے، وہ راجح اور مرجوح کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری، اہل کوفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے احادیث و آثار کی بنا پر اذان کے پندرہ اور اقامت کے سترہ کلمات کو ترجیح دی ہے، ان حضرات کے نزدیک اذان میں ترجیع اور اقامت میں افراد بھی جائز ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

یہ قریب قریب وہی الفاظ ہیں جو اوپر حدیث میں منقول ہوئے ہیں، اور قعدہ میں بیٹھنے کا ذکر کرتے ہوئے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"وإن كانت امرأة جلست على أليتها اليسرى وأخرجت رجليها من الجانب الأيمن لأنه أستر لها۔"

(ہدایہ ص:۹۳ مطبوعہ دہلی)

ترجمہ: "اگر عورت ہو تو اپنے سرین پر بیٹھ جائے اور پاؤں دائیں جانب نکال لے، کیونکہ یہ اس کے لئے زیادہ پردے کی چیز ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد فرمودہ اصول کی رعایت صرف فقہائے احناف ہی نے نہیں کی، بلکہ قریب قریب تمام ائمہ اور فقہائے امت نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے، جیسا کہ ان کی کتب فقہیہ سے واضح ہے، واللہ الموفق!

besturdubooks.wordpress.com

سوالِ پنجم:... فاتحہ خلف الامام اور مسئلۂ آمین:

"سوال:... نماز کے اندر امام کے پیچھے الفاتحہ پڑھنے سے اور آمین کا امام اور مقتدی کو جہری نماز میں جہر سے کہنے سے کس نے منع کیا ہے؟ جبکہ واضح احادیث و آثارِ صحابہ سے ثابت ہے، اگر منسوخ ہوچکا ہے تو قول اور صحت والی احادیث و آثارِ صحابہ سے دلیل دیں۔"

جواب:... فاتحہ خلف الامام کی بحث سوالِ دوم کے ذیل میں گزر چکی ہے، اور میں وہاں بتا چکا ہوں کہ قرآنِ کریم نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی امام کی اقتدا میں مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیا ہے، مگر چونکہ سوال میں دوبارہ دریافت کیا گیا ہے کہ اس سے کس نے منع کیا ہے؟ اس لئے مناسب ہے کہ اس سلسلے میں دو نکتے مزید عرض کردیئے جائیں، وباللہ التوفیق!

اوّل:... یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت:

"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (الاعراف:۲۰۴)

ترجمہ:... "اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس پر کان دھرو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس آیتِ کریمہ میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنی رحمت کو مقتدی کی خاموشی پر معلق فرمایا ہے، گویا جو مقتدی امام کے پیچھے خاموشی اختیار نہیں کرتا، بلکہ امام کی قراءت کے وقت اپنی قراءت خود شروع کردیتا ہے، وہ "لعلکم ترحمون" کے زمرے سے خارج ہے، یہی وجہ ہے کہ خطبہ کی حالت میں اگر کوئی تسبیح کی

besturdubooks.wordpress.com

ممانعت ہے، اور امر بالمعروف جو عام حالات میں واجب ہے، اس کی بھی ممانعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کو بھی لغو کا مرتکب قرار دیا ہے، جس سے جمعہ کا ثواب باطل ہوجاتا ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

"اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِکَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ: اَنْصِتْ! وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۱۲۲)

ترجمہ:... "جب تم نے جمعہ کے دن اپنے رفیق سے کہا کہ: خاموش رہو! جبکہ امام خطبہ دے رہا تھا تو تم نے لغو کا ارتکاب کیا۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ اس سے جمعہ کا ثواب باطل ہوجاتا ہے:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَکَلَّمَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَهُوَ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا، وَالَّذِیْ یَقُوْلُ لَهُ: اَنْصِتْ! لَیْسَ لَهُ جُمُعَةٌ."

(رواہ احمد، مشکوٰۃ ص:۱۲۳)

ترجمہ:... "ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جمعہ کے دن کوئی بات کی جبکہ امام خطبہ دے رہا تھا تو اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بوجھ اٹھائے پھرتا ہے، اور جو شخص بات کرنے والے کو خاموش رہنے کا حکم دے، اس کا بھی جمعہ نہیں۔"

جب خطبے کی حالت میں کلام کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قدر تشدید فرمائی تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نماز جو خطبے سے بدرجہا فائق ہے، اس میں امام کی قراءت کے وقت مقتدی کا اپنی قراءت میں مشغول ہونا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں کس قدر سنگین ہوگا...؟

besturdubooks.wordpress.com

دوم... یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے امام کے پیچھے قراءت کی صاف صاف ممانعت آتی ہے، اس سلسلے میں مصنف عبدالرزاق سے چند روایات نقل کرتا ہوں۔

۱:... "عن عبدالرحمن بن زيد بن أسلم عن أبيه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن القراءة خلف الامام، قال: وأخبرني أشياخنا أن عليًا رضي الله عنه قال: من قرأ خلف الامام فلا صلوة له، قال: وأخبرني موسى بن عقبة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبا بكر وعمر وعثمان كانوا ينهون عن القراءة خلف الامام۔" (ج:۲ ص:۱۳۹)

ترجمہ:... "عبدالرحمن بن زید بن اسلم اپنے والد زید بن اسلم سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرمایا۔ عبدالرحمن کہتے ہیں کہ مجھے میرے مشائخ نے بتایا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے اس کی نماز نہیں۔ اور موسیٰ بن عقبہ نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔"

۲:... "عن زيد بن أسلم عن ابن عمر رضي الله عنه كان ينهى عن القراءة خلف الامام۔" (ج:۲ ص:۱۴۰)

ترجمہ:... "زید بن اسلم سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔"

۳:... "عن محمد بن عجلان قال: قال علي:

besturdubooks.wordpress.com

من قرأ مع الامام فليس على الفطرة. قال: وقال ابن مسعود: ملئ فوه ترابا، قال. وقال عمر بن الخطاب: وددت أن الذي يقرأ خلف الامام في فيه حجر."

(ج ۲ ص ۱۳۸)

ترجمہ: "محمد بن عجلان، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: جو شخص امام کے ساتھ قراءت کرے، وہ فطرت پر نہیں۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا منہ مٹی سے بھرا جائے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے منہ میں پتھر ہو۔"

۴:... "عن عبدالله بن أبي ليلى قال: سمعت عليا يقول: من قرأ خلف الامام فقد أخطأ الفطرة."

(ج ۲ ص ۱۳۷)

ترجمہ:... "عبداللہ بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فرماتے سنا ہے کہ: جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے، اس نے فطرت کے خلاف کیا۔"

۵:... "عن زيد بن ثابت قال: من قرأ مع الامام فلا صلوة له." (ایضاً)

ترجمہ:... "زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جو شخص امام کے ساتھ قراءت کرے اس کی نماز نہیں۔"

۶:... "عن الأسود قال: وددت أن الذي يقرأ خلف الامام ملئ فاه ترابا." (ج ۲ ص ۱۳۸)

ترجمہ:... "اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں چاہتا ہوں کہ

کہ "آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کے جواز پر سب کا اتفاق ہے، البتہ ایک فریق کے نزدیک آہستہ کہنا زیادہ بہتر ہے اور دوسرے کے نزدیک جہراً کہنا۔ اس لئے سوال میں جو دریافت کیا گیا ہے کہ "جہر سے کس نے منع کیا؟" سوال کا یہ انداز صحیح نہیں، صحیح انداز یہ تھا کہ آپ کے نزدیک آہستہ کہنا کیوں بہتر ہے؟

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر ایک فریق کے نزدیک دلائل کی بنا پر ایک پہلو راجح ہو، اور دوسرے فریق کو دوسرا پہلو بہتر معلوم ہو تو کسی فریق کو دوسرے پر ملامت کرنے کا کوئی حق نہیں، اس لئے کہ ملامت سنتِ مؤکدہ کے ترک پر ہوتی ہے، مستحبات کے اخذ و ترک پر ملامت نہیں ہوا کرتی۔

دوم:... "آمین" ایک دُعا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۰۷) میں حضرت عطاء رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، مجمع البحار (ج:۱ ص:۱۰۵ طبع جدید حیدرآباد دکن) میں ہے:

"وَمَعْنَاهُ اِسْتَجِبْ لِیْ، اَوْ كَذٰلِكَ فَلْيَكُنْ."

ترجمہ:... "اس کے معنی ہیں: یا اللہ! میری دُعا قبول فرمایئے یہ کہ: ایسا ہی ہو۔"

جب معلوم ہوا کہ "آمین" ایک دُعا ہے تو سب سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ دُعا میں جہر افضل ہے یا اخفاء؟ بلاشبہ جہری دُعا بھی جائز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، مگر دُعا میں اصل اخفاء ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

"اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً." (الاعراف:۵۵)

ترجمہ:... "پکارو اپنے رَبّ کو گڑگڑا کر اور پوشیدہ۔"

اور حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرے میں فرمایا:

"اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا." (مریم:۳)

ترجمہ:... "جب پکارا اپنے رَبّ کو چھپی پکار سے۔"

چونکہ دُعا میں اصل اور افضل صورت اخفاء کی ہے، اس لئے آمین میں بھی اخفاء ہی اَولیٰ و بہتر ہوگا۔

besturdubooks.wordpress.com

سوم:... جو حضرات جہری نمازوں میں امام اور مقتدی کے جہراً آمین کہنے کو مستحب فرماتے ہیں، ان کا مدعا اس وقت ثابت ہوسکتا ہے جبکہ وہ یہ ثابت کردیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دائمی یا اکثری معمول آمین بالجہر کا تھا، یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو جہراً آمین کہنے کا حکم فرمایا تھا، مگر کسی صحیح و صریح حدیث میں یہ دونوں باتیں کم از کم میری نظر سے نہیں گزریں، امام بخاری رحمہ اللہ نے "جہر الامام بالتامین" اور "جہر المأموم بالتامین" کے دو الگ الگ باب قائم کئے ہیں، اور دونوں کے ذیل میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک ہی حدیث باختلافِ الفاظ نقل کی ہے، پہلے باب کے ذیل میں یہ الفاظ ہیں:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوْا فَإِنَّهُ مَنْ وَّافَقَ تَأْمِيْنُهُ تَأْمِيْنَ الْمَلٰئِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: وَكَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ آمِيْنَ." (بخاری ج:۱ ص:۱۰۸)

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوجائے گی، اس کے گزشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آمین کہا کرتے تھے۔"

اور دوسرے باب کے ذیل میں یہ الفاظ ہیں:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، فَقُوْلُوْا: آمِيْنَ، فَإِنَّهُ مَنْ وَّافَقَ قَوْلُهُ قَوْلَ الْمَلٰئِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ." (صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۰۸)

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب

besturdubooks.wordpress.com

امام "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہا کرو، جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے کے موافق ہوگا، اس کے گزشتہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔"

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، اس حدیث میں امام اور مقتدی کو آمین کہنے کا حکم ہے، اور اس کی فضیلت ارشاد فرمائی گئی ہے، لیکن یہ کہ آمین آہستہ کہنی ہوگی، یا جہراً؟ اس کی تصریح اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ قنوتِ فجر کی بحث میں لکھتے ہیں:

"ومن المعلوم بالضرورة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لو كان يقنت كل غداة ويدعو بهذا الدعاء ويؤمن الصحابة لكان نقل الأمة لذلك كلهم كنقلهم بجهره بالقراءة فيها وعددها ووقتها، وإن جاز عليهم تضييع أمر القنوت منها جاز عليهم تضييع ذلك، ولا فرق، وبهذا الطريق علمنا أنه لم يكن هديه الجهر بالبسملة كل يوم وليلة خمس مرات دائمًا مستمرًا ثم يضيع أكثر الأمة ذلك ويخفى عليها وهذا من أمحل المحال، بل لو كان ذلك واقعًا لكان نقله كنقل عدد الصلوات وعدد الركعات والجهر والإخفات وعدد السجدات ومواضع الأركان وترتيبها، والله الموفق.

والإنصاف الذي يرتضيه العالم المنصف أنه صلى الله عليه وسلم جهر وأسر وقنت وترك وكان إسراره أكثر من جهره وتركه القنوت أكثر من فعله۔"

(زاد المعاد ج:۱ ص ۲۷۳)

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ: ”اور یہ بات بدیہۃً معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر ہمیشہ صبح کو قنوت پڑھا کرتے اور یہ دعا (اللھم اھدنی فیمن ھدیت) پڑھا کرتے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس پر آمین کہا کرتے تو پوری کی پوری امت اس کو نقل کرتی، جیسا کہ امت نے نماز میں جہری قراءت کو، رکعتوں کی تعداد کو اور ان کے اوقات کو نقل کیا ہے، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امت نے قنوت کی نقل کو ضائع کر دیا تو ان مذکورہ بالا امور کا ضائع کرنا بھی بلا کسی فرق کے صحیح ہوگا۔ اور اسی طریقے سے ہم نے معلوم کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک جہراً بسم اللہ پڑھنے کا نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ شب و روز میں پانچ مرتبہ دوام و استمرار کے ساتھ جہراً بسم اللہ پڑھتے ہوں، اس کے باوجود اکثر امت اس کو ضائع کر دے، اور یہ بات اس پر مخفی رہ جائے؟ یہ سب سے بڑھ کر محال ہے، بلکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس کو بھی اسی طرح نقل کیا جاتا جیسے نماز کی تعداد کو، رکعات کی تعداد کو، قراءت کے جہر و اخفاء کو، سجدوں کی تعداد کو، ارکان کے مواضع اور ان کی ترتیب کو نقل کیا گیا۔

واللہ الموفق!

اور انصاف کی بات، جسے عالم منصف قبول اور پسند کرے گا، یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہر بھی کیا اور آہستہ بھی، قنوت پڑھی بھی اور چھوڑی بھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آہستہ پڑھنا جہر سے زیادہ تھا، اور قنوت کا ترک کرنا اس کے پڑھنے سے زیادہ تھا۔“

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے جو گفتگو بیت قنوت فجر اور جہر بالتسمیہ کے بارے میں کی ہے، وہ لفظ بلفظ آمین بالجہر میں جاری ہوتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دائمی معمول آمین بالجہر کا ہوتا، تو نا ممکن تھا کہ سے

تعداد رکعات کی طرح نقل نہ کیا جاتا، اس مسئلے میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کا اختلاف نہ ہوتا، اور امام بخاریؒ کو ایک ایسی حدیث سے استدلال کی ضرورت پیش نہ آتی جس میں جہر کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

چہارم:... امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے باوجود جہر کی تصریح نہ ہونے کے قرائن و قیاسات کی مدد سے جہر پر استدلال فرمایا ہے، جو حضرات اخفائے آمین کے قائل ہیں، وہ اسی حدیث کے اشارات سے اخفاء پر استدلال کرتے ہیں، مثلاً:

۱:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کے "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ" کہنے پر مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم فرمایا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام بلند آواز سے آمین نہیں کہتا، ورنہ اس کے "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ" کہنے پر آمین کہنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری روایت میں "جب امام آمین کہے" کے جو الفاظ ہیں، ان کو خود شافعیہ نے بھی مجاز پر محمول کیا ہے، یعنی جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے یا جب اس کے آمین کہنے کا وقت ہو جائے تو تم بھی آمین کہو۔

۲:... اسی حدیث کی ایک روایت میں یہ صریح اضافہ ہے: "وَإِنَّ الْإِمَامَ يَقُوْلُ آمِيْنَ" (اور امام بھی آمین کہتا ہے)۔

اگر امام کو جہراً آمین کہنے کا حکم ہوتا تو اس ارشاد کی ضرورت نہ تھی کہ "امام بھی آمین کہا کرتا ہے" کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہی معلوم کر سکتے تھے۔

۳:... حدیث میں ملائکہ کی آمین کے موافق ہونے پر مغفرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے، نمازی کی آمین میں فرشتوں کے ساتھ موافقت وقت میں بھی ہو سکتی ہے، خشوع و اخلاص میں بھی، اور کیفیت میں بھی، اسی موافقت کا دائرہ وسیع کر دیا جائے تو جہر و اخفاء میں بھی موافقت ہو سکتی ہے، فرشتوں کی آمین چونکہ اخفاء کے ساتھ ہوتی ہے، تو ہمیں بھی ان کی موافقت کرنی چاہئے۔

besturdubooks.wordpress.com

پنجم:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آمین بالجہر کے جو واقعات منقول ہیں، اوّل تو ان کی اسانید میں اہلِ علم کو کلام ہے، پھر اخفا و جہر تعلیم پر بھی محمول ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فاذا جهر به الامام احيانا ليعلم المأمومين فلا بأس بذلک، فقد جهر عمر بالاستفتاح ليعلم المأمومين وجهر ابن عباس بقراءة الفاتحة في صلوٰة الجنازة ليعلمهم انها سنة، ومن هذا ايضا جهر الامام بالتأمين." (زاد المعاد ج:۱ ص:۷۰)

ترجمہ:... "پس جب امام اس (قنوت) کو کبھی جہر کے ساتھ پڑھے تاکہ مقتدی جان لیں تو کوئی حرج نہیں، چنانچہ مقتدیوں کی تعلیم کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "سبحانک اللّٰھم" بلند آواز سے پڑھی تھی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ میں فاتحہ بلند آواز سے پڑھی تھی، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے، اور امام کا بلند آواز سے آمین کہنا بھی اسی قبیل سے ہے۔"

چنانچہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو جہر کی روایات میں سب سے قوی ہے، اس میں اس مضمون کی تصریح موجود ہے۔

"وقرأ غير المغضوب عليهم ولا الضآلين فقال: آمين، يمد بها صوته ما أراه الا يعلمنا. أخرجه ابو بشر الدولابي في الأسماء والكنى." (اعلاء السنن ج:۲ ص:۲۲۰)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب "غير المغضوب عليهم ولا الضآلين" کی قراءت سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچ رہے تھے، میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ

مسلم بھی تعلیم دینا چاہتے تھے۔"

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے زمانۂ خلافت میں مکہ مکرمہ میں بلند آواز سے آمین کہتے تھے اور ان کے مقتدی بھی، وہ بھی تعلیم ہی پر محمول ہے، تاکہ معلوم ہوجائے کہ اس موقع پر آمین کہنا سنت ہے، ورنہ آمین چونکہ خفیہ کہی جاتی ہے، اس سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ آمین کہنا ہی بدعت ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں امام مالک رحمہ اللہ امام کی آمین کہنے کے قائل نہیں۔

ششم:... علامہ ابن الترکمانی رحمہ اللہ نے "الجوہر النقی" میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین، اخفائے آمین پر عامل تھے، اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصل سنت یہی تھی، اور احیاناً اگر جہر فرمایا تھا تو نوواردوں کی تعلیم کے لئے تھا۔ یہاں چند آثار کا حوالہ دے دینا کافی ہوگا۔

۱:... کنز العمال (ج:۴ ص:۲۰۹) "کتاب الصلوٰۃ من قسم الافعال، باب المعلوم ما یتعلق بہ" میں ابن جریر کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"أَرْبَعٌ يُخْفِيْهِنَّ الْإِمَامُ: التَّعَوُّذُ، وَبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَآمِيْنَ، وَاللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ." (حدیث ۲۲۸۹۳)

ترجمہ:... "چار چیزوں کو امام خفیہ ادا کرے گا، اعوذ باللہ، بسم اللہ، آمین اور اللّٰھم ربنا لک الحمد۔"

۲:... "عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ قَالَ: كَانَ عَلِيٌّ وَعَبْدُاللهِ لَا يَجْهَرَانِ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَلَا بِالتَّعَوُّذِ وَلَا بِالتَّأْمِيْنِ." (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۰۸)

ترجمہ:... "ابووائل کہتے ہیں کہ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے نہیں کہتے تھے، نہ اعوذ باللہ، نہ آمین کو۔"

۳:... "عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ قَالَ: لَمْ يَكُنْ عُمَرُ وَعَلِيٌّ

يَجْهَرَانِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَلَا بِآمِيْنَ۔"

(رواه ابن جرير الطبري في تهذيب الآثار، الجوهر النقي ج:۲ ص:۱۳۰)

ترجمہ:... "ابووائل کہتے ہیں کہ: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے کہتے تھے اور نہ آمین کو۔"

۳:... مصنف عبدالرزاق (ج:۲ ص:۸۷) میں حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"اَرْبَعٌ يُخْفِيْهِنَّ الْاِمَامُ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَالْاِسْتِعَاذَةُ، وَآمِيْنَ، وَاِذَا قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، قَالَ: رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔"

ترجمہ:... "چار چیزیں ایسی ہیں کہ امام ان کا اخفا کرے گا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اعوذ باللہ، آمین، اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد۔"

دوسری روایت میں ہے:

"خَمْسٌ يُخْفِيْنَ: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَالتَّعَوُّذُ، وَبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَآمِيْنَ، وَاللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔"

ترجمہ:... "پانچ چیزیں آہستہ کہی جاتی ہیں: سبحانک اللہم وبحمدک، اعوذ باللہ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، آمین، اور اللہم ربنا لک الحمد۔"

besturdubooks.wordpress.com

سوالِ ششم:... رفع یدین کا مسئلہ:

"سوال:... رفع یدین صحاح ستہ سے کثرت سے اصحابِ رسولؐ روایت کرتے ہیں، جن کی تعداد تقریباً دس سے زائد ہے، بعض پچاس سے بھی زائد کہتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ احناف اس سنت کو ترک کر رہے ہیں اور اپنانے سے کتراتے ہیں بلکہ نماز کو فاسد بھی قرار دیتے ہیں؟ اگر یہ حکم منسوخ ہے تو دلیل ثبوت کم از کم تین اصحابِ رسولؐ سے (جو راوی کے اعتبار سے معتبر سمجھے جاتے ہوں) واضح فرمائیں۔"

جواب:... رفع یدین کے مسئلے میں بھی حنفیہ کا موقف ٹھیک سنتِ نبویؐ کے مطابق ہے، اس کو سمجھنے کے لئے چند اُمور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اوّل:... تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین باجماعِ اُمت مستحب ہے[1]، اور باقی مقامات میں اختلاف ہے، (نووی شرح مسلم ج:۱ ص:۱۶۸) اور اس اختلاف کا منشا یہ ہے کہ اس سلسلے میں روایات بھی مختلف وارد ہوئی ہیں، اور سلف صالحین کا عمل بھی مختلف رہا ہے، چنانچہ:

۱:... بعض روایات میں صرف تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے، (اس سلسلے کی احادیث آگے ذکر کی جائیں گی)۔

۲:... بعض روایات میں رُکوع میں جاتے اور رُکوع سے اُٹھتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے، یہ چونکہ خود سوال میں مذکور ہے، اس لئے اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔

۳:... بعض روایات میں سجدے کو جاتے ہوئے بھی رفع یدین کا ذکر ہے، (مشکوٰۃ

---

(۱) بعض حضرات اس موقع پر رفع یدین کے وجوب کے قائل ہیں۔

حدیث مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ (نسائی ج ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶)

۴... بعض روایات میں دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

(مثلاً حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما ابوداؤد ص ۱۰۵، نسائی ج ۱ ص ۱۶۵)۔

۵... بعض روایات میں دوسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

(مثلاً حدیث وائل بن حجر: "واذا رفع رأسه من السجود" ابوداؤد ص ۱۰۵)۔

۶... بعض روایات میں تیسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

(مثلاً حدیث ابن عمر صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۲ "واذا قام من الرکعتین رفع یدیه"، حدیث ابی حمید الساعدی: ابوداؤد ج ۱ ص ۱۰۶، ترمذی ص ۴۰ "ثم اذا قام من الرکعتین کبر ورفع"، حدیث ابی ہریرہ ابوداؤد ص ۱۰۵، حدیث ابن عمر ابوداؤد ص ۱۰۹، حدیث علی ابوداؤد ص ۱۰۹، ۱۱۰)۔

۷... بعض روایات میں ہر اونچ نیچ (عند کل خفض ورفع) کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔ (مثلاً حدیث عمیر بن حبیب، ابن ماجہ ص ۶۲ "یرفع یدیه مع کل تکبیرۃ")۔

رفع یدین کی یہ تمام صورتیں حدیث کی کتابوں میں مروی ہیں، اور سلف صالحین کے یہاں معمول بہا رہی ہیں، لیکن امام شافعی و احمد رحمہما اللہ صرف تین موقعوں پر رفع یدین کو مستحب سمجھتے ہیں، باقی جگہ نہیں، اور امام ابوحنیفہ (مشہور اور معتمد روایت کے مطابق) اور امام مالک رحمہما اللہ صرف تحریمہ کے وقت مستحب سمجھتے ہیں، باقی جگہ نہیں، اس طرح امام شافعی اور امام احمد باقی مقامات کے رفع یدین کو ترک کرنے کی وجہ سے تارکِ سنت نہیں کہلاتے اور نہ ان کے بارے میں کوئی شخص یہ کہے گا کہ "وہ سنت کو اختیار کرنے سے کتراتے ہیں"، اسی طرح اگر امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک دلائل و ترجیحات کی بنا پر یہ محقق ہوا کہ تحریمہ کے وقت رفع یدین سنت ہے، اور باقی مواقع میں ترکِ رفع یدین سنت ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو "تارکِ سنت" کا خطاب دیا جائے، یا "سنت کو اختیار کرنے میں ہچکچاہٹ" کا الزام دیا جائے۔

besturdubooks.wordpress.com

دوم:... تین مقامات (تحریمہ، رکوع اور قومہ) میں رفع یدین کی جو احادیث مروی ہیں، ان میں خاصا اختلاف اور اضطراب ہے، اور مختلف طرق سے مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہیں، مثال کے طور پر یہاں ان دو حدیثوں کا ذکر مناسب ہوگا جو رفع یدین کی احادیث میں سب سے اصح اور سب سے قوی سمجھی جاتی ہیں، اور امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ نے صحیحین میں رفع یدین کے استدلال میں صرف انہی دو حدیثوں پر اکتفا کیا ہے، ایک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت جو اس باب کی سب سے صحیح ترین حدیث سمجھی جاتی ہے، اور دوسری حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث جو اس سے دوسرے درجے پر ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے طرق ملاحظہ ہوں:

۱:... مدونۃ الکبریٰ (ج:۱ ص:۷۱) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں صرف تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے، اور اسی روایت کی بنا پر امام مالک رحمہ اللہ نے ترکِ رفع یدین کو اختیار کیا ہے۔

۲:... امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ امام حمیدی رحمہ اللہ کی مسند (ج:۲ ص:۲۷۷) اور صحیح ابوعوانہ (ج:۲ ص:۹۰) میں تحریمہ کے سوا باقی مقامات میں رفع یدین کی نفی ہے، (یہ حدیث آگے ترکِ رفع یدین کے دلائل میں نمبر۱ پر ذکر کروں گا)۔

۳:... مؤطا امام مالکؒ کی روایت میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، تحریمہ کے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت، اور سجدوں میں رفع یدین کی نفی ہے۔

۴:... صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۰۲) اور صحیح مسلم (ج:۱ ص:۱۶۸) کی روایت میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، اور سجدوں کے درمیان رفع یدین کی نفی ہے۔

۵:... صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۰۲) کی ایک روایت میں ان تینوں جگہوں کے علاوہ تیسری رکعت میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

۶:... امام بخاری رحمہ اللہ کے رسالے "جزء القراءۃ" (ص:۱۱) اور سنن نسائی (ج:۲ ص:۱۰۲ وغیرہ) کی روایت میں ان چار جگہوں کے علاوہ سجدے کے لئے رفع یدین کا

"لا نعلم مصرا من الأمصار تركوا باجماعهم رفع اليدين عند الخفض والرفع في الصلوة إلا أهل الكوفة وكلهم لا يرفع إلا في الإحرام۔"

(اتحاف شرح احیاء العلوم ج ۳ ص ۵۳)

ترجمہ: "ہمیں شہروں میں سے کوئی شہر معلوم نہیں کہ وہاں کے لوگوں نے نماز میں جھکتے اور اٹھتے کے وقت رفع الیدین بالاجماع ترک کیا ہو سوائے اہل کوفہ کے کہ وہ سب کے سب تحریمہ کے سوا کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے۔"

مطلب یہ ہے کہ بلاد اسلامیہ میں جہاں ترک رفع یدین کے عامل ہیں وہاں رفع یدین کے عامل بھی رہے ہیں، ایک کوفہ ایسا شہر ہے جس کے تمام علماء وفقہاء قدیماً وحدیثاً ہمیشہ ترک رفع یدین پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل کوفہ میں وہ صحابہ کرامؓ بھی شامل ہیں جو دور فاروقی سے دور مرتضوی تک کوفہ میں رونق افروز ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر اکابر صحابہؓ سے استفادہ کے علاوہ کوفہ کے اکابر تابعینؒ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دور خلافت میں خلفائے راشدینؓ اور دیگر اکابر صحابہؓ سے استفادہ کرنے کے لئے مدینہ طیبہ حاضری دیتے رہے، اگر ترک رفع یدین پر خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل نہ ہوتا تو کیا کوفہ کے تمام صحابہؓ و تابعینؒ ترک رفع یدین پر متفق ہو سکتے تھے...؟ الغرض صدر اول میں مدینہ طیبہ اور کوفہ کے حضرات کا ترک رفع یدین پر متفق ہونا اس امر کی علامت ہے کہ ترک رفع یدین صدر اول میں متواتر و متوارث چلا آتا تھا، اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت متواترہ ہے جس پر صحابہؓ و تابعینؒ عامل رہے۔

اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ حضرات محدثینؒ جہاں رفع یدین کا باب قائم کرتے ہیں، وہاں ترک رفع یدین کا باب بھی لکھتے ہیں، چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ نے "رفع الیدین للرکوع" کے بعد "الرخصة فی ترک ذلک" کا (ص ۱۶۱)، "باب رفع

الیدین للسجود" کے بعد "ترک رفع الیدین عند السجود" کا (ص ۱۶۵) اور "باب رفع الیدین عند الرفع من السجدۃ الأولی" کے بعد "ترک ذلک بین السجدتین" کا (ج ۱ ص ۱۷۱) عنوان قائم کیا ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے "باب رفع الیدین" اور "باب افتتاح الصلوٰۃ" کے بعد "باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع" رکھا ہے۔

ترمذی شریف کے بعض حالی نسخوں میں "ترک رفع یدین" کا باب سہو کتابت کی وجہ سے رہ گیا ہے، ورنہ صحیح نسخوں میں باب کا لفظ موجود ہے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے "باب رفع الیدین عند الرکوع" کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور اس کے ذیل میں "وفی الباب" کہہ کر ان صحابہؓ کی فہرست دی ہے جن سے رفع یدین کی احادیث مروی ہیں، اس کے بعد انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ترک رفع یدین پر نقل کی ہے اور اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"وفی الباب عن البراء بن عازب قال ابو عیسیٰ: حدیث ابن مسعود حدیث حسن وبه یقول غیر واحد من اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم والتابعین وهو قول سفیان واهل الکوفة۔"

ترجمہ: "اس باب میں براء بن عازبؓ سے بھی حدیث مروی ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث حسن ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہؓ و تابعین اسی کے قائل ہیں، یہی امام سفیان ثوری کا اور اہل کوفہ کا قول ہے۔"

"وفی الباب" کا لفظ بتاتا ہے کہ انہوں نے حدیث ابن مسعودؓ سے پہلے ترک رفع یدین کا مستقل باب باندھا ہے، چنانچہ مولانا قطب احمد مظاہری لکھتے ہیں:

besturdubooks.wordpress.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تب تو
اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھاتے، اور جب رکوع کا
ارادہ کرتے اور رکوع سے اُٹھتے تو تب نہیں اٹھاتے تھے، اور سجدوں
کے درمیان بھی نہیں اٹھاتے تھے۔"

۴:... امام ابوعوانہ رحمہ اللہ نے سفیان تک اس کی چار سندیں ذکر کی ہیں، چوتھی
سند امام بخاری کے استاذ حمیدی کی ہے:

"حدثنا الصائغ بمكة قال: حدثنا الحميدي
قال: حدثنا سفيان عن الزهري قال: أخبرني سالم عن
أبيه قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم مثله."

چنانچہ مسند حمیدی (ج:۲ ص:۲۷۷، حدیث نمبر:۶۱۴) میں یہ حدیث اسی سند سے
انہی الفاظ میں مذکور ہے:

"حدثنا الحميدي قال: حدثنا سفيان قال:
حدثنا الزهري قال: أخبرني سالم بن عبدالله عن أبيه
قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا افتتح
الصلوة رفع يديه حذو منكبيه، وإذا أراد أن يركع وبعد
ما يرفع رأسه فلا يرفع، ولا بين السجدتين."

ترجمہ: "حمیدی سفیان سے، وہ زہری سے، وہ سالم بن
عبداللہ سے، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھ کندھوں
تک اٹھاتے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے
تو رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور نہ دونوں سجدوں کے درمیان۔"

(۱) [illegible] کی عبارت میں طباعت کی غلطی سے [illegible] جیسا کہ اس کے محشی نے حاشیہ سے بھی ظاہر
کیا ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

صحیح ابوعوانہ کی احادیث کا صحیح ہونا سب کو مسلم ہے، اور مسند حمیدی کی یہ حدیث [illegible] صرف صحیح ہے، بلکہ صحیح ترین سند سے مروی ہے، امام حمیدی رحمہ اللہ (عبداللہ بن الزبیر بن عیسیٰ القرشی الحمیدی المکی المتوفی ۲۱۹ھ) امام بخاری کے استاذ ہیں، صحیح ابوعوانہ اور مسند حمیدی کی مذکورہ بالا حدیث نہ صرف صحیح ہے، بلکہ صحیح ترین سند سے مروی ہے۔

۳:..... مدونہ کبریٰ (ج ۱ ص ۷۱) میں ہے

"ابْنُ وَهْبٍ وَابْنُ الْقَاسِمِ عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ اِذَا افْتَتَحَ التَّكْبِيْرَ لِلصَّلٰوةِ۔"

ترجمہ: "ابن وہب اور ابن القاسم، امام مالکؒ سے، وہ ابن شہاب زہری سے، وہ سالم سے، وہ اپنے والد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے، جب نماز شروع فرماتے تھے۔"

یہ سند بھی صحیح الاسناد ہے، اس میں صرف افتتاح صلوٰۃ کے وقت رفع یدین ذکر کیا گیا ہے، اور اسی حدیث کی بنا پر امام مالک رحمہ اللہ نے ترک رفع یدین قبل الرکوع و بعد الرکوع کا مسلک اختیار کیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کا ذکر، امام مالکؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ صحیح ابوعوانہ اور مسند حمیدی کی روایت میں اس کی صراحت گزر چکی ہے۔

۴:..... نصب الرایہ (ج ۱ ص ۴۰۴) میں خلافیات بیہقی کے حوالے سے یہ حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَوْنٍ الْخَرَّازِ حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ

(۱) بحذف مجمعه بعدها و مهمته آخره [illegible]

صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ اذا افتتح الصلوٰۃ ثم لا یعود." (نصب الرایہ ج:۱ ص:۴۰۴)

ترجمہ:... "عبداللہ بن عون الخراز، مالک سے، وہ زہری سے، وہ سالم سے، وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کیا کرتے تھے جب نماز شروع فرماتے، پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔"

اس حدیث کو نقل کرکے امام بیہقیؒ، امام حاکمؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"ھذا باطل موضوع، ولا یجوز أن یذکر إلا علی سبیل القدح، فقد روینا بالأسانید الصحیحۃ عن مالک بخلاف ھذا." (نصب الرایہ ج:۱ ص:۴۰۴)

ترجمہ:... "یہ حدیث باطل موضوع ہے، اور جائز نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے مگر بطور اعتراض، کیونکہ ہم نے صحیح اسانید کے ساتھ امام مالکؒ سے اس کے خلاف روایت کیا ہے۔"

مگر امام حاکمؒ کا یہ فیصلہ یک طرفہ ہے، اگر اس کی سند میں کسی راوی پر کلام ہے تو اس کو ذکر کرنا چاہئے تھا، لیکن اگر راوی سب کے سب ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں، تو ان کی روایت کو باطل اور موضوع کہنا تحکم ہے، اور ان کی یہ دلیل بھی ناکافی ہے کہ ہم نے امام مالکؒ سے صحیح اسانید کے ساتھ اس کے خلاف روایت کیا ہے، اس لئے کہ اسانیدِ صحیحہ کے ساتھ امام مالکؒ سے ترکِ رفع یدین کی حدیث بھی منقول ہے، اور خود امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک بھی ترکِ رفع یدین ہے، تو کیا امام حاکمؒ، مالکیہ کو یہ اجازت دیں گے کہ چونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ترکِ رفع یدین امام مالکؒ سے صحیح اسانید کے ساتھ منقول ہے، اور چونکہ ترک ہی کی روایت امام مالکؒ کے نزدیک صحیح اور معتمد علیہ ہے، اور چونکہ اسی روایت پر امام مالکؒ نے ترکِ رفع یدین کو اختیار کیا ہے، اس لئے ابن عمرؓ کی روایت میں رفع یدین کا ذکر باطل اور موضوع ہے، ظاہر ہے کہ محض اپنے قرائن اور قیاسات سے ثقہ

کی نماز کی خبر نہ دوں؟ پس کھڑے ہوئے اور پہلی مرتبہ رفع یدین کیا، پھر دوبارہ نہیں کیا۔"

اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (اعلاء السنن ج ۳ ص ۴۲)

۲۔ "عن علقمة عن عبد الله عن النبي صلى الله عليه وسلم انه كان يرفع يديه في اول تكبيرة ثم لا يعود." (طحاوی شریف ج ۱ ص ۱۳۲)

ترجمہ: "حضرت علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے، پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔"

اس کی سند بھی قوی ہے۔

۳۔ "ابو حنيفة عن حماد عن ابراهيم عن الاسود ان عبد الله بن مسعود رضي الله عنه كان يرفع يديه في اول التكبير ثم لا يعود الى شيء من ذلك ويأثر ذلك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم."

(مسند امام اعظم ج ۱ ص ۳۵۵)

ترجمہ: "امام ابو حنیفہ اپنے شیخ حماد سے، وہ ابراہیم نخعی سے، وہ اسود سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلی تکبیر میں رفع یدین کیا کرتے تھے، اس کے بعد نماز کے کسی حصہ میں نہیں کرتے تھے، اور وہ اس عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔"

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی روایت کے طرق کو امام ابو محمد بخاری حارثی رحمہ اللہ نے مستقل کتاب الآثار میں جمع کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس حدیث کی بنیاد پر ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے، اس لئے یہ ان کی جانب سے حدیث کی تصحیح ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

۵:... "عن محمد بن جابر عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراہیم عن علقمۃ عن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال: صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر فلم یرفعوا ایدیھم الا عند استفتاح الصلوٰۃ۔"

ترجمہ:... "محمد بن جابرؒ، حماد بن ابی سلیمانؒ سے، وہ ابراہیم نخعیؒ سے، وہ علقمہؒ سے، وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی ہے، وہ تکبیرِ تحریمہ کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

یہ حدیث محمد بن جابر یمامی کی روایت سے ہے، جو صدوق تھے، مگر نابینا ہوگئے تھے، اس لئے ان کی احادیث میں اختلاط ہوگیا تھا، بعض محدثین نے محمد بن جابر کی وجہ سے اس روایت کو کمزور کہا ہے، اور ابن جوزی جیسے متشدد نے (جو بعض اوقات صحیح بخاری کی احادیث کو بھی موضوع کہہ جاتے ہیں) اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، لیکن محمد بن جابر سے امام شعبہ جیسے اکابر محدثین نے روایت کی ہے، (جیسا کہ نصب الرایہ ج:۱ ص:۳۹۶ میں نقل کیا ہے)، اور دارقطنی (ص:۱۱۱) میں ہے کہ اسحاق بن ابی اسرائیل اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وبہ ناخذ فی الصلوٰۃ کلہا۔"

ترجمہ:... "پوری نماز میں ہمارا عمل اسی حدیث پر ہے۔"

اس تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت محمد بن جابرؒ کے اختلاط سے پہلے زمانے کی ہے، اس لئے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث کا مضمون متواتر روایت سے ثابت ہے، کیونکہ اس حدیث میں دو چیزیں ذکر کی گئی ہیں، ایک یہ کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں، ظاہر ہے کہ ایک دو دن نہیں

کا انکار نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حضرات تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ مضمون بھی متواتر ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات میں مختلف طرق اور سندوں سے یہ مضمون مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا نقشہ دکھایا، اور اس میں رفع یدین نہیں فرمایا، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب سے ایک روایت بھی اس کے خلاف مروی نہیں، اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی سنت تو رفع یدین ہو، اور حضرت ابن مسعود، حضرت علی رضی اللہ عنہما اور ان کے اصحاب اس سنت کو ترک کردیں۔ پس جب محمد بن جابر کی روایت کے دونوں مضمون تواتر سے ثابت ہیں تو اس حدیث کے ثبوت میں کیا شبہ ہے...؟

حدیث جابر بن سمرہؓ

”... عن تميم بن طرفة عن جابر بن سمرة رضي الله عنه قال: خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ما لي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس؟ أسكنوا في الصلاة۔“

(صحیح مسلم ج:۱ ص:[illegible]، سنن نسائی ج:[illegible]
ص:[illegible]، ابوداؤد ج:۱ ص:۱۴۳)

ترجمہ: ”حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو فرمایا: کیا بات ہے، میں تمہیں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، گویا وہ سرکش گھوڑوں کی دُمیں ہیں، نماز میں سکون اختیار کرو۔“

اس حدیث کی صحت میں کسی کو کلام نہیں، البتہ بعض حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس حدیث میں سلام کے وقت اشارہ کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، جیسا کہ

besturdubooks.wordpress.com

صحیح مسلم ہی میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی دُوسری حدیث ہے:

۲:... "كُنَّا إِذَا صَلَّيْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ، وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى الْجَانِبَيْنِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَلَامَ تُوْمِئُوْنَ بِأَيْدِيْكُمْ كَأَنَّهَا أَذْنَابُ خَيْلٍ شُمْسٍ، إِنَّمَا يَكْفِيْ أَحَدَكُمْ أَنْ يَضَعَ يَدَهُ عَلَى فَخِذِهِ ثُمَّ يُسَلِّمُ عَلَى أَخِيْهِ مَنْ عَلَى يَمِيْنِهِ وَشِمَالِهِ."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۸۱)

ترجمہ:... "ہم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہتے وقت دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ہاتھوں سے اشارہ کس لئے کرتے ہو؟ جیسے وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دُمیں ہوں، تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ ہاتھ رانوں پر رکھے ہوئے دائیں بائیں اپنے بھائی کو سلام کیا کرو۔"

ان دونوں حدیثوں میں چونکہ "كَأَنَّهَا أَذْنَابُ خَيْلٍ شُمْسٍ" کا فقرہ آگیا ہے، غالباً اس سے ان حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہوگیا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعے سے متعلق ہیں، لیکن جو شخص ان دو حدیثوں کے سیاق پر غور کرے گا، اسے یہ سمجھنے میں قطعاً دُشواری نہیں ہوگی کہ یہ دونوں الگ الگ واقعے سے متعلق ہیں، اور ان دونوں کا مضمون ایک دُوسرے سے یکسر مختلف ہے، چنانچہ:

۱:... پہلی حدیث میں ہے کہ ہم اپنی نماز میں مشغول تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور دُوسری حدیث میں نماز باجماعت کا ذکر ہے۔

۲:... پہلی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا اور اس پر نکیر فرمائی، اور دُوسری حدیث میں ہے کہ سلام کے وقت

دائیں بائیں اشارہ کرنے پر نکیر فرمائی۔

۳:... پہلی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا اور دوسری میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کا طریقہ بتایا۔

۴:... اور پھر یہ دونوں حدیثیں الگ الگ سندوں سے مذکور ہیں، پہلی حدیث کے راوی دوسرے واقعے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے، اور دوسری حدیث کے راوی پہلے واقعے سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔

اس لئے دونوں حدیثوں کو جن کا الگ الگ مخرج ہے، الگ الگ قصہ ہے، الگ الگ حکم ہے، ایک ہی واقعے سے متعلق کہہ کر دل کو تسلی دے لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

اور اگر بطورِ تنزل تسلیم بھی کرلیا جائے کہ دونوں حدیثوں کی شانِ ورود ایک ہے، تب بھی یہ مسلّمہ اصول ہے کہ خاص واقعے کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین پر نکیر فرمائی ہے اور اس کے بجائے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے تو اس سے ہر صاحبِ فہم یہ سمجھے گا کہ رفع یدین سکون کے منافی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ترک کرنے کا حکم فرمایا ہے، مزید یہ کہ جب بوقتِ سلام رفع یدین کو سکون کے منافی سمجھا گیا، حالانکہ وہ نماز سے خروج کی حالت ہے، تو نماز کے عین وسط میں سکون کی ضرورت اس سے بدرجہا بڑھ کر ہوگی۔

حدیثِ ابنِ عباسؓ:

۱:... "عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُرْفَعُ الْأَيْدِيْ إِلَّا فِيْ سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: حِيْنَ يَفْتَتِحُ الصَّلٰوةَ، وَحِيْنَ يَدْخُلُ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَيَنْظُرُ إِلَى الْبَيْتِ، وَحِيْنَ يَقُوْمُ عَلَى الصَّفَا، وَحِيْنَ يَقُوْمُ عَلَى الْمَرْوَةِ، وَحِيْنَ يَقِفُ مَعَ النَّاسِ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ، وَبِجَمْعٍ." (طبرانی، بحوالہ نصب الرایہ ج:۱ ص:۳۹۰)

ترجمہ:... "حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت

besturdubooks.wordpress.com

اوّل:... ایک یہ کہ دارقطنی کی روایت میں "ثم لا یعود" کے بجائے "فی اول تکبیرۃ" کا لفظ ہے، اور جن روایتوں میں "ثم لا یعود" کا لفظ نہیں ان کا مفہوم بھی اس سے معلوم ہوا کیا ہے کہ صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کیا۔

دوم:... یہ کہ اس میں وہ واقعہ بھی ذکر کیا گیا ہے جس موقع پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی تھی، اور یہ راوی کے کمالِ ضبط کی علامت ہے۔

سوم:... یزید سے اس روایت کو یزید کے اکابر اصحاب نقل کرتے ہیں۔ مثلاً: امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اسمٰعیل بن زکریا، شعبہ، اسرائیل بن ابی اسحاق، حفص بن غیاث، اسمٰعیل، حمزہ زیات، ہشیم، شریک، محمد بن ابی لیلیٰ، کوئی وجہ نہیں کہ ان اکابر کی پوری جماعت کی روایت کے بعد بھی اس لفظ کو غیر محفوظ کہا جائے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث چونکہ متعدد طرق سے مروی ہے، اس لئے وہ محدثین کے اصول پر صحیح ہے۔

چہارم:... عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ جو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی روایت کرتے ہیں، ترکِ رفع یدین کے قائل تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۷)

اس سے واضح ہے کہ ترکِ رفع یدین ہی ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی جو انہوں نے صحابہ کرامؓ سے سیکھی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کی روایت بالکل صحیح ہے۔

پنجم:... دارقطنی کی روایت میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے صحابہؓ و تابعینؒ کے مجمع میں یہ حدیث بیان کی تھی، اس سے ترکِ رفع یدین کی سنت اور مؤکدہ ہو جاتی ہے۔

مرسل عباد بن عبداللہ بن الزبیرؒ

۱۰:... عن عباد بن الزبیر أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ فی أول

الصَّلٰوۃَ ثُمَّ لَمْ یَرْفَعْھُمَا فِیْ شَیْءٍ حَتّٰی یَفْرُغَ۔"

(نصب الرایہ ج:۱ ص:۴۰۴ بحوالہ خلافیات بیہقی)

ترجمہ:... "عباد بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تھے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے، پھر نماز سے فارغ ہونے تک کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

"بسط الیدین" (ص:۵۳) میں "المواہب اللطیفہ" کے حوالے سے یہ روایت مفصل نقل کی ہے:

۲:... "عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِیْ یَحْیٰی قَالَ: صَلَّیْتُ اِلٰی جَنْبِ عَبَّادِ بْنِ عَبْدِاللہِ بْنِ الزُّبَیْرِ رَضِیَ اللہُ عَنْھُمْ، قَالَ: فَجَعَلْتُ اَرْفَعُ اَیْدِیْ فِیْ کُلِّ رَفْعٍ وَّوَضْعٍ، قَالَ: یَا ابْنَ اَخِیْ! رَاَیْتُکَ تَرْفَعُ فِیْ کُلِّ رَفْعٍ وَّخَفْضٍ وَّاِنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوۃَ رَفَعَ یَدَیْہِ فِیْ اَوَّلِ صَلٰوۃٍ ثُمَّ لَمْ یَرْفَعْھُمَا فِیْ شَیْءٍ حَتّٰی یَفْرُغَ۔" (بسط الیدین)

ترجمہ:... "محمد بن ابی یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے عباد بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے پہلو میں نماز پڑھی۔ میں ہر اونچ نیچ میں رفع یدین کرنے لگا، انہوں نے فرمایا: بھتیجے! میں نے تجھے دیکھا ہے کہ تم ہر اونچ نیچ میں رفع یدین کر رہے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز شروع کرتے تھے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہونے تک رفع یدین نہیں کیا۔"

عباد بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم تابعی ہیں، اس لئے یہ روایت مرسل ہے، اور مرسل روایت، جبکہ اس کی سند صحیح ہو، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد اور اکثر فقہاء

۲:...حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ:

مسند ابی داؤد طیالسی ص:۲۶۶، حدیث نمبر:۲۰۲۶، مصنف عبدالرزاق ج:۲ ص:۲۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۲۰، مسند احمد ج:۳ ص:۱۲۵، ۱۳۲، ۱۵۱، ۲۵۷، ۲۷۲، سنن نسائی ج:۱ ص:۱۷۲، طحاوی ج:۱ ص:۱۰۸، بیہقی ج:۲ ص:۷۶۔

۳:...حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ:

مسند احمد ج:۲ ص:۴۷، ۱۵۲، سنن نسائی ج:۱ ص:۱۴۳، ۱۹۵، صحیح ابن خزیمہ ج:۱ ص:۴۸۹، حدیث نمبر:۵۲۶۔

۴:...حدیث ابی مالک الاشعری رضی اللہ عنہ:

عبدالرزاق ج:۲ ص:۹۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۰، ۲۳۱، مسند احمد ج:۵ ص:۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳۔

۵:...حدیث ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ:

مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۰، مسند احمد ج:۴ ص:۳۹۴، ۴۰۰، ۴۱۱، ۴۰۵، ۴۱۳، طحاوی ج:۱ ص:۱۰۸، البزار ج:۲ ص:۱۳۰۔

۶:...حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما:

مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۱، مسند احمد ج:۱ ص:۲۱۸، ۲۵۰، ۲۹۲، ۳۲۷، ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۵۱، صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۰۸، صحیح ابن خزیمہ ج:۱ ص:۲۹۰-۲۹۱، طحاوی ج:۱ ص:۱۰۸، بیہقی ج:۲ ص:۶۸۔

۷:...حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ:

مسند ابی داؤد طیالسی ص:۲۳۴، حدیث نمبر:۱۶۹۹، مسند بزار ج:۲ ص:۱۳۶۔

۸:...حدیث ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ:

مسند احمد ج:۳ ص:۱۸، صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۱۳، صحیح ابن خزیمہ ص:۲۹۱، حدیث نمبر:۵۸۰، مستدرک حاکم ج:۱ ص:۲۲۳، بیہقی ج:۲ ص:۱۸۔

۹:...حدیث ابی مسعود البدری رضی اللہ عنہ:

طحاوی ج:۱ ص:۱۰۸۔

۱۰:...حدیث رفاعۃ البدری رضی اللہ عنہ:

مسند ابی داؤد الطیالسی ص:۱۹۶، حدیث نمبر:۱۳۷۲، کتاب الام للشافعی ج:۱ ص:۸۸، مصنف عبدالرزاق ج:۲ ص:۳۷۰، حدیث نمبر:۳۷۳۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۸۷، مسند احمد ج:۴ ص:۳۴۰، مسند دارمی ص:۱۵۸، سنن ابی داؤد ج:۱ ص:۱۲۵، ترمذی ج:۱ ص:۳۰، سنن نسائی ج:۱ ص:۱۶۱، ۱۷۰، ۱۹۳، منتقی ابن الجارود ص:۶۷، صحیح ابن خزیمہ ج:۱ ص:۲۷۳، حدیث نمبر:۲۵۴، طحاوی ج:۱ ص:۱۱۳، مستدرک حاکم ج:۱ ص:۲۴۲، بیہقی ج:۲ ص:۳۷۳، ۳۷۴، المحلی ص:۷، ۹۰، ۱۰۔

آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ:

۱:...حضرت صدیقِ اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما رفع یدین نہیں کرتے تھے (دیکھئے: حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نمبر:۵)۔

۲:..."عن الاسود قال: صلیت مع عمر رضی اللّٰہ عنہ فلم یرفع یدیہ فی شیء من صلوتہ الا حین افتتح الصلٰوۃ، قال عبدالملک: ورأیت الشعبی وابراھیم وابا اسحاق لا یرفعون ایدیھم الا حین یفتتحون الصلٰوۃ۔"

(طحاوی ج:۱ ص:۱۱۱، مصنف ابن ابی شیبہ، موطا امام محمدؒ ج:۱ ص:۲۳۷، ج:۱ ص:۲۰۵)

ترجمہ:..."حضرت اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے، وہ نماز کے شروع کے علاوہ کسی جگہ بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ عبدالملک (راویِ حدیث) کہتے ہیں کہ: میں نے شعبیؒ، ابراہیم نخعیؒ اور ابواسحاقؒ کو دیکھا ہے کہ وہ ابتدائے نماز کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۳:... "عَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ، وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ عَلِيٍّ، أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللهُ وَجْهَهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي التَّكْبِيرَةِ الْأُولَى الَّتِي يَفْتَتِحُ بِهَا الصَّلٰوةَ ثُمَّ لَا يَرْفَعُهُمَا فِي شَيْءٍ مِنَ الصَّلٰوةِ."

(موطا امام محمد ص:۹۴، طحاوی ج:۱ ص:۱۱۰،
مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۶)

ترجمہ:... "عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب میں سے تھا، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کی صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے، اس کے بعد نماز کے کسی حصے میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

"نصب الرایہ" (ج:۱ ص:۴۰۶) میں فرماتے ہیں: "وھو اثر صحیح" حافظ ابن حجرؒ "الدرایہ" (ص:۸۵ طبع دہلی) میں فرماتے ہیں: "ورجاله ثقات وھو موقوف"۔

۴:... "عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي أَوَّلِ مَا يَسْتَفْتِحُ ثُمَّ لَا يَرْفَعُهُمَا."

(مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۶، طحاوی ج:۱ ص:۱۳۳)

ترجمہ:... "حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے، پھر نہیں کرتے تھے۔"

اس کی سند صحیح ہے (نصب الرایہ)، اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار (ج:۱ ص:۱۳۳) میں، امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب الحجۃ (ج:۱ ص:۹۶) اور ابن سعد رحمہ اللہ نے طبقات (ج:۶ ص:۱۹۰) میں امام اعمش رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ: میں نے حضرت ابراہیمؒ سے عرض کیا کہ: آپ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کیا کریں تو اس کی سند ذکر کیا کیجئے (کہ فلاں صاحب سے آپ نے یہ حدیث کی

ہے کہ ابو قیس نے کہا کہ جب میں یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تو یہ بات میں نے آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت سے سنی ہوتی ہے، اور جب کسی خاص شخص کے حوالے سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کروں تو یہ حدیث میں نے صرف انہی صاحب سے سنی ہوتی ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن (ج:۱ ص:۱۴۸) میں یحییٰ بن معین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی مراسیل صحیح ہیں، سوائے دو حدیثوں کے، حدیث تاجر بحرین اور حدیث الضحک فی الصلوٰۃ۔

(حاشیہ نصب الرایہ ج:۱ ص:۴۰۸)

۵:... "عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ: مَا رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَا يَفْتَتِحُ۔"

(طحاوی ج:۱ ص:۱۱۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج:۱ ص:۲۳۷)

ترجمہ... "امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ابتدائے نماز کے سوا رفع یدین کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔"

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے یہ روایت ابوبکر بن عیاش سے، انہوں نے حصین سے اور انہوں نے مجاہد سے نقل کی ہے، یہ سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے، چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر (ج:۲ ص:۷۲۵) میں ابوبکر بن عیاش عن حصین کی سند موجود ہے، اس لئے اس روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے تحت عرض کرچکا ہوں کہ ان سے مختلف احادیث مروی ہیں، رفع یدین کی بھی اور ترک رفع یدین کی بھی، ان کا یہ عمل، جو امام مجاہد رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، ترک رفع یدین کی روایت کے مطابق ہے۔

۶:... امام محمد رحمہ اللہ "موطا" (ص:۹۰) میں اور "کتاب الحجۃ" (ج:۱ ص:۹۵) میں امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں:

"أَخْبَرَنِي نُعَيْمٌ الْمُجْمِرُ وَأَبُو جَعْفَرٍ الْقَارِئُ أَنَّ

besturdubooks.wordpress.com

أنّ أبا هريرة رضي الله عنه كان يصلّي بهم فيكبّر كلّما خفض ورفع، وكان يرفع يديه حين يكبّر ويفتتح الصلوة."

(كتاب الحجه ص ٩٥)

ترجمہ: ... "امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے نعیم بن عبداللہ مجمر اور ابوجعفر القاری نے بتایا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو نماز پڑھاتے تھے تو ہر اونچ نیچ میں تکبیر کہتے تھے، اور رفع یدین نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے وقت کرتے تھے۔"

۷: مصنف ابن ابی شیبہ (ج:۱ ص:۲۳٦) میں ہے:

"حدثنا وكيع وأبو أسامة عن شعبة عن أبي إسحاق قال: كان أصحاب عبدالله وأصحاب علي لا يرفعون أيديهم إلّا في افتتاح الصلوة، قال وكيع: ثم لا يعودون."

ترجمہ: ... "ہم سے وکیع اور ابواسامہ نے بیان کیا شعبہ سے، انہوں نے ابواسحاق سے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب صرف نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

یہ سند بھی نہایت صحیح ہے، اور اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب کا ترکِ رفع یدین پر اجماع تھا۔

۸: ... "حدثنا يحيى بن سعيد عن إسماعيل قال: كان قيس يرفع يديه أوّل ما يدخل في الصلوة ثم لا يرفعهما." (ایضاً)

ترجمہ: ... "اسماعیل کہتے ہیں کہ حضرت قیس بن ابی حازم صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے، پھر نہیں

کرتے تھے۔"

قیس بن ابی حازم البجلی الاحمسی رحمہ اللہ، کبار تابعین میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "تقریب" میں لکھتے ہیں:

"انہوں نے زمانہ نبوت پایا اور کہا جاتا ہے کہ ان کو شرفِ زیارت بھی حاصل ہے، یہ واحد آدمی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو عشرہ مبشرہ سے روایت کا اتفاق ہوا ہے، ۹۰ھ کے بعد یا اس سے پہلے انتقال ہوا، ان کی عمر مبارک سو سے متجاوز تھی، اور آخر میں تغیر پیدا ہو گیا تھا۔"

یہ جلیل القدر تابعی جن کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں، ترکِ رفع یدین پر عامل تھے، اگر ترکِ رفع یدین اکابر صحابہ کے زمانے میں متواتر نہ ہوتا تو یہ اس پر عامل نہ ہوتے۔

۹: "عن الاسود وعلقمة انهما كانا يرفعان ايديهما اذا افتتحا ثم لا يعودان." (ایضاً ج۱ ص:۲۳۷)

ترجمہ: "حضرت اسودؒ و علقمہؒ صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے، پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔"

۱۰: "حدثنا معاوية بن هشيم عن سفيان بن مسلم الجهني قال: كان ابن ابي ليلى يرفع يديه اول شيء اذا كبر."

ترجمہ: "سفیان بن مسلم جہنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

۱۱: "عن خيثمة وابراهيم كانا لا يرفعان ايديهما الا في بدء الصلوة." (ج۱، ص۲۳۶)

ترجمہ: "حضرت خیثمہؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ دونوں رفع

besturdubooks.wordpress.com

پہلے نماز میں سکون ہوتا ہو، پھر حرکات شروع ہوگئی ہوں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع یدین کی روایات بھی مروی ہیں اور ترکِ رفع یدین کی بھی، مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترکِ رفع یدین تھا۔

۴:... امام حازمی رحمہ اللہ نے متعارض روایات میں ترجیح کے جو اصول بیان فرمائے ہیں، ان میں سے دُوسرا اصول یہ بیان کیا ہے کہ: ایک روایت کا راوی اگر حفظ و اتقان میں دُوسرے سے بڑھ کر ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی:

"الوجه الثاني: أن تكون أحد الراويين أحفظ وأتقن"۔ (ص:۱۱)

۵:... دسواں اصول یہ لکھا ہے کہ: ایک راوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ قرب حاصل ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی۔

"العاشر: أن يكون أحد الراويين أقرب مكانًا من رسول الله صلى الله عليه وسلم فحديثه أولى بالتقديم۔" (ص:۱۳)

۶:... گیارہواں اصول یہ لکھا ہے کہ: اگر ایک راوی کا اپنے شیخ سے زیادہ تعلق رہا ہو، وہ اپنے شیخ سے طویل صحبت رکھتا ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی:

"الحادي عشر: أن يكون أحد الراويين أكثر ملازمة لشيخه، قال: وطول الصحبة له زيادة تأثير فيرجح به۔" (کتاب الاعتبار ص:۱۳)

۷:... تیئسواں اصول یہ لکھا ہے: جب دو روایتوں کے راوی حفظ و اتقان میں یکساں ہوں، مگر ان میں سے ایک روایت کے راوی فقیہ ہوں اور احکام کے عارف ہوں تو ان کی روایت مقدم ہوگی:

"الثالث والعشرون: أن يكون رواة أحد الحديثين مع تساويهم الحفظ والإتقان فقهاء عارفين

besturdubooks.wordpress.com

حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے اور اس بارے میں غایت احتیاط و ورع سے کام لیتے تھے، ان کے تلامذہ ان پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتے تھے، ان کا شمار سادات صحابہ، فقہائے علم اور اہل فتویٰ میں ہوتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ چونکہ حفظ و اتقان، طول صحبت اور فقاہت میں دوسرے حضرات سے فائق ہیں، اس لئے ان کی روایت مقدم ہوگی۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بہ سند صحیح نقل کیا ہے:

"مغیرہ بن مقسم الضبی کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کیا کرتے تھے، فرمانے لگے: اگر حضرت وائل رضی اللہ عنہ نے ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پچاس بار ترک رفع یدین کرتے دیکھا ہے۔

عمرو بن مرہ کہتے ہیں کہ: میں حضرموت کی مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ علقمہ بن وائل اپنے والد حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کرتے تھے۔ میں نے ابراہیم نخعی سے اس کا ذکر کیا تو غضب ناک ہوکر فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے دیکھا ہے؟ ابن مسعودؓ اور ان کے رفقاء نے نہیں دیکھا؟"

(طحاوی ص:۱۱۰ مطبوعہ مجتبائی ص:۱۳۳، کتاب الآثار امام ابو یوسف ص:۲۱)

۸:... پیچھے معلوم ہوچکا ہے کہ رفع یدین کے باب میں جو احادیث مروی ہیں، ان میں اختلاف و اضطراب ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث

اضطراب سے پاک ہے، چنانچہ ان سے رفع یدین کی ایک روایت بھی نہیں ہے، پس جو حدیث کہ اختلاف و اضطراب سے پاک ہو، وہ مقدم ہوگی۔

۹:... کسی حدیث میں یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین کا حکم فرمایا ہو، اس کے برعکس حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ممانعت موجود ہے، اور جب قولی احادیث اور فعلی احادیث میں اختلاف ہو تو قولی احادیث مقدم ہوتی ہیں۔

۱۰:... جن احادیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کرتے تھے، ان میں سے کسی صحیح حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل دائمی اور تا وفات تھا، اور نہ کسی حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نماز رفع یدین کے ساتھ ہوئی تھی، جب تک ان دو باتوں میں سے ایک بات ثابت نہ ہو، رفع یدین کا سنت دائمہ مستمرہ ہونا ثابت نہیں، اس کے مقابلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ترکِ رفع یدین احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، بلکہ رفع یدین کی ممانعت بھی موجود ہے، اور حضرات خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی ترکِ رفع الیدین پر ثابت ہے، ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع الیدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دائمہ نہیں، بلکہ سنت متروکہ ہے، واللہ اعلم!

دو شبہات کا ازالہ:

آخر میں دو شبہوں کا ازالہ ضروری ہے، جن کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے:

اول:... یہ کہ رفع الیدین میں اختلاف جواز یا عدم جواز کا نہیں، بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہے، جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی عبارت ابھی سے پہلے نقل کرچکا ہوں، اس لئے حنفیہ کے نزدیک رفع الیدین سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ ان کے نزدیک یہ عمل سنت متروکہ ہونے کی وجہ سے خلافِ اولیٰ ہے۔

دوم:... یہ کہ سوال میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ رفع الیدین کے باب میں چار سو سے زائد صحابہ روایت کرتے ہیں، یہ محض مبالغہ ہے، یہاں تک کہ دس کی روایت کا حوالہ محدثین

سے تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین کے لئے دیا ہے، چنانچہ علامہ شوکانی (نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۸۰) میں لکھتے ہیں:

"وجمع العراقي عدد من روى رفع اليدين في ابتداء الصلاة فبلغوا خمسين صحابيا منهم العشرة المشهود لهم بالجنة."

ترجمہ: "علامہ عراقی رحمہ اللہ نے ان حضرات کا شمار کیا ہے جن سے ابتدائے نماز میں رفع یدین کی احادیث مروی ہیں، چنانچہ ان کی تعداد پچاس صحابہ تک پہنچی ہے، جن میں حضرات عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ پچاس صحابہ سے تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین کی احادیث مروی ہیں، جو باجماعِ امت مستحب ہے، اور جس سے حنفیہ کو بھی اختلاف نہیں، جس مسئلے میں اختلاف ہے وہ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع الیدین ہے، اس میں پچاس صحابہ کی روایت تو کجا، ایک صحابی کی بھی ایسی روایت نہیں جو صحیح بھی ہو اور اختلاف و معارضہ سے خالی بھی ہو، اس لئے اس مقام پر یہ کہنا کہ پچاس صحابہ کی روایات کا تواتر ہے محض مغالطہ ہے۔ دراصل اس مسئلے میں اصل حقائق کے بجائے مبالغہ آرائی سے زیادہ کام لیا گیا ہے، ان مبالغات کی دو دلچسپ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے رسالہ جزء رفع الیدین میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے:

"كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفعون أيديهم في الصلاة."

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نماز میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

امام بصری رحمہ اللہ کے اس قول کو نقل کرکے امام بخاری لکھتے ہیں:

"ولم يستثن الحسن أحدا ولا ثبت عن أحد

besturdubooks.wordpress.com

من الصحابة انه لم يرفع يديه."

(بحوالہ نصب الرایہ ج ۱ ص ۴۰۴)

ترجمہ... "امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا، اور نہ کسی صحابی سے یہ ثابت ہے کہ اس نے رفع یدین نہ کیا ہو۔"

لیجئے...! حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے اس قول سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ سے رفع یدین ثابت کر دیا، اور اس کے مقابلے میں وہ تمام روایات صحیحہ غلط قرار پا گئیں جن میں صحابہ کرامؓ کا رفع یدین نہ کرنا ثابت ہے۔

اس سے قطع نظر، حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول کسی سند سے امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، اوّل تو اس میں صرف رفع یدین کا ذکر ہے، متنازعہ فیہ رفع یدین کا ذکر نہیں، پھر اگر دو چار صحابہؓ سے بھی رفع الیدین ثابت ہو تو امام حسن بصریؒ کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ صحابہ کرامؓ سے رفع یدین بھی ثابت ہے، لیکن امام بخاریؒ نے امام حسن بصریؒ کے قول کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے، اس سے مبالغہ آرائی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ جن کا سماع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی محدثین تسلیم نہیں کرتے، ان کا قول یہاں تمام صحابہ کرامؓ کے حق میں حجت مان لیا گیا، اور ان کے مقابلے میں اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کی تصریحات مسترد کر دی گئیں۔ رفع الیدین کے متنازع فیہ مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے جن حضرات نے کاوشیں فرمائی ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر نے اسی قسم کے مغالطوں سے کام چلایا ہے۔

اس کی دوسری مثال شیخ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کی عبارت ہے جو "سفر السعادۃ" میں لکھتے ہیں:

"در این سه موضع برداشتن دست ثابت شده، نزد تحریمه و

از کثرت روات این معنی بحد تواتر رسیده است، چهار صد خبر و اثر در این

باب صحیح شده، و عشره مبشره روایت کرده اند که لا یزال عمل آنحضرت

برین کیفیت بود تا از این جهان رحلت کرد، و غیر از این چیزے ثابت

besturdubooks.wordpress.com

قطعہ ما۔"	(شرح سفر السعادۃ ص ۶۴)

ترجمہ: "ان تین مواضع میں رفع یدین ثابت ہے، اس کے علاوہ نہیں، اور راویوں کی کثرت کی وجہ سے متواتر کے مشابہ ہے، چنانچہ اس مسئلے میں چار سو صحیح حدیثیں مرفوع و موقوف ثابت ہیں، اس کو عشرہ مبشرہ نے روایت کیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی کیفیت پر رہے ہیں، یہاں تک کہ اس عالم سے رحلت فرما گئے، اور رفع الیدین کے خلاف کوئی روایت بھی ثابت نہیں۔"

قرب مبالغہ آرائی کا کمال دیکھئے کہ شیخ فیروز آبادی نے ایک ہی سانس میں کتنی باتیں کہہ ڈالیں:

۱:... "ان تین مواضع میں رفع یدین ثابت ہے۔" حالانکہ پورے ذخیرۂ حدیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو صحیح بھی ہو اور سالم عن المعارضہ بھی ہو۔

۲:... "رفع یدین پر چار سو صحیح حدیثیں ہیں" حالانکہ امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ کو ان کی شرط کے مطابق صرف دو حدیثیں ملی ہیں، وہ بھی شدید الاضطراب ہیں اور محدثین کی اصطلاح میں ایسی مضطرب روایات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

۳:... چار سو حدیثوں کے باوجود مسئلہ شیخ فیروز آبادی کے نزدیک پھر بھی متواتر نہیں بلکہ "متواتر کے مشابہ" ہے۔ خدا جانے کہ ان کے نزدیک کسی مسئلے کے متواتر ہونے کے لئے کتنے "چار سو" کی ضرورت ہوگی؟

۴:... "رفع یدین عشرہ مبشرہ کی روایت سے ثابت ہے" حالانکہ عشرہ مبشرہ میں سے کسی ایک سے بھی صحیح سند سے ثابت نہیں، اس کے مقابلے میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے، جو عشرہ مبشرہ کے سرخیل ہیں، ترکِ رفع یدین صحیح اسانید سے ثابت ہے۔ افسوس ہے کہ شیخ فیروز آبادی کی عشرہ مبشرہ سے مروی روایت کا سراغ امام بخاری و امام مسلم کو نہ ملا، ورنہ یہ روایتیں صحیحین کی زینت ضرور بنتیں۔

۵:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دم تک رفع یدین کرتے رہے" غالباً شیخ

کے پیشِ نظر ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منسوب کردہ وہ روایت ہے جس کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن میں ذکر کیا ہے:

"فما زالت تلک صلوتہ حتی لقی اللہ تعالی۔"

(نصب الرایہ ج:۱ ص:۴۱۰)

ترجمہ:... "پس ہمیشہ رہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی نماز یہاں تک کہ جاملے اللہ تعالیٰ سے۔"

مگر یہ روایت موضوع ہے، اس کے دو راوی کذاب ہیں۔ (حاشیہ نصب الرایہ)

عجیب بات یہ ہے کہ امام بیہقی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ ایسے اکابر بھی بے تبصرہ اس روایت پر خاموشی سے گزر گئے، بلکہ اس کو رفع یدین کے دلائل میں ذکر کر جاتے ہیں، اس سے ان حضرات کی اس مسئلے میں بے بسی واضح ہے۔

۲:... شیخ فیروز آبادی فرماتے ہیں کہ: "ترکِ رفع یدین کی کوئی حدیث ثابت نہیں" حالانکہ اکابر محدثین سے صحیح روایات اوپر نقل ہوچکی ہیں۔

رفع الیدین کے مسئلے میں بے جا غلو اور مبالغوں سے کام لیا جاتا ہے، جو خلاصہ یہ ہے کہ روایات و آثار دونوں جانب مروی ہیں، امام شافعی و احمد رحمہما اللہ اور ان کے متبعین تین مواقع میں رفع الیدین کو راجح سمجھتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ... جن کا زمانہ اول الذکر حضرات سے قدیم ہے... ترکِ رفع یدین کو راجح سمجھتے ہیں۔ اور امت کا بیشتر تعامل اسی پر رہا ہے، چنانچہ صدرِ اول میں اسلام کے دو مرکزی شہروں مدینہ اور کوفہ میں ترک ہی پر عمل تھا، مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں رفع یدین کا رواج ہوا، جن کا شمار صغار صحابہ میں ہے، ورنہ صحابہؓ و تابعینؒ کی اکثریت ترکِ رفع یدین پر عامل تھی، صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد ائمہ مجتہدین کا زمانہ آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں احناف اور مالکیہ... جو امت کا دو تہائی حصہ ہیں... ترکِ رفع یدین ہی پر عامل چلے آتے ہیں، اس لئے روایت و درایت اور توارث و تعامل کے لحاظ سے ترکِ رفع یدین ہی اقویٰ اور راجح ہے۔

واللہ الموفق لکل خیر وسعادۃ!

besturdubooks.wordpress.com

سوال ہفتم:...سجدۂ سہو کا طریقہ:

"سوال:...سجدۂ سہو جو عام رائج ہے، دائیں جانب ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرنا یہ کس دلیل پر بنیاد ہے؟ جبکہ متفق علیہ کی احادیث سے صاف اور واضح ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سہو ہونے پر اس وقت سجدۂ سہو کیا، جب نماز اپنے آخری مرحلے سے گزر رہی تھی، یعنی قریب سلام پھیرنے کے تھے، جب آپ نے دو سجدے کئے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ ایک سلام پھیرنے (تشہد کے بعد) اور پھر دوبارہ تشہد و درود پڑھنے کا کیا ثبوت ہے؟"

جواب:...اس سلسلے میں چند امور قابلِ توجہ ہیں:

اوّل:...سجدۂ سہو کے بارے میں متفق علیہ روایات صرف سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرنے کی نہیں، بلکہ اس سلسلے میں بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ سہو سلام سے پہلے کیا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو صحاحِ ستہ میں ہے، اور سوال میں اسی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں تشہد کئے بغیر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے اور نماز پوری کرکے سلام سے قبل سجدۂ سہو کیا۔

(بخاری ج:۱ ص:۱۶۳، مسلم ج:۱ ص:۲۱۱، ابوداؤد ج:۱ ص:۱۴۸،
نسائی ج:۱ ص:۱۸۲،۱۸۶، ترمذی ج:۱ ص:۵۱، ابن ماجہ ص:۸۵)

دوسری قسم ان احادیث کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا، چنانچہ:

۱... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھیں، عرض کیا گیا کہ کیا نماز میں اضافہ ہو گیا ہے؟ فرمایا: کیسا؟ کیا بات ہوئی؟ عرض کیا گیا: آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد دو سجدے کئے۔

(بخاری ج ۱ ص ۱۶۳، مسلم ج ۱ ص ۲۱۲، نسائی ج ۱ ص ۱۶۵، ابوداؤد ج ۱ ص ۱۴۹، ترمذی ج ۱ ص ۵۲، ابن ماجہ ص ۸۵)

۲... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ نماز پوری کی، پھر بیٹھ کر سلام کے بعد دو سجدے کئے۔

(بخاری ج ۱ ص ۱۶۳، مسلم ج ۱ ص ۲۱۳، ابوداؤد ج ۱ ص ۱۴۳، نسائی ج ۱ ص ۱۸۲، ترمذی ج ۱ ص ۵۳، ابن ماجہ ص ۸۶)

۳... حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نماز پڑھائی تو دو رکعتوں پر تشہد کئے بغیر اٹھ گئے، جب نماز پوری کر کے سلام پھیرا تو دو سجدے کئے، اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

(ابوداؤد ج ۱ ص ۱۴۸، ترمذی ج ۱ ص ۴۸، ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۶)

۴... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا، پھر دو رکعتیں اور پڑھیں، پھر سلام پھیرا، پھر سجدۂ سہو کیا۔ (ابن ماجہ ص ۸۶)

تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سلام کئے، ایک سجدۂ سہو سے پہلے اور ایک بعد، چنانچہ:

۱... حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور رکعت پڑھی، پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کئے، پھر سلام پھیرا۔

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۱۴، ابوداؤد ج:۱ ص:۱۴۹، نسائی ج:۱ ص:۱۸۱، ابن ماجہ ص:۸۶، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۸)

۲... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا، پھر دو رکعتیں اور پڑھیں اور سلام پھیرا، پھر سجدۂ سہو کیا، پھر سلام پھیرا۔ (ابن ماجہ ص:۸۶)

۳... حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ دو رکعتوں پر قعدہ کئے بغیر کھڑے ہوگئے، جب نماز پوری ہوئی تو سلام پھیرا، اور سجدۂ سہو کیا، اور پھر سلام پھیرا، پھر فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا تھا۔

(ترمذی ج:۱ ص:۵۲ وقال: ہذا حدیث حسن صحیح، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۳)

۴... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعت پر سلام پھیر دیا، پھر دو رکعتیں اور پڑھیں، پھر سلام پھیرا، پھر سجدۂ سہو کیا، پھر سلام پھیرا۔ (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۸)

۵... طحاوی (ص:۲۰۲)، مسند احمد (ج:۱ ص:۴۲۹)، سنن کبریٰ (ج:۱ ص:۳۳۵) میں بروایت ابوعبیدہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث ہے:

"فانه یسلم ثم یسجد سجدتی السهو ویسلم۔" (حاشیہ نصب الرایہ ج:۲ ص:۱۶۷)

ترجمہ: "سجدۂ سہو کا طریقہ یہ ہے کہ سلام پھیرے، پھر سجدۂ سہو کرے، پھر سلام پھیرے۔"

دوم... ان مختلف احادیث کے درمیان توفیق و تطبیق یا ترجیح کے مسئلے میں ائمہ اجتہاد کا اختلاف ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس مسئلے میں پانچ قول نقل کئے ہیں:

۱... امام شافعی رحمہ اللہ سلام سے پہلے سجدۂ سہو کے قائل ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com

۲:... امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: سجدۂ سہو نماز میں زیادتی کی وجہ سے ہو، تو سلام کے بعد ہوگا، اور اگر نماز میں کمی رہ جانے کی وجہ سے ہو تو سلام سے قبل ہوگا۔

۳:... امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدۂ سہو کی جو صورتیں منقول ہیں، ان پر اسی طرح عمل کیا جائے گا، چنانچہ:

الف... اگر بھول سے پہلا قعدہ چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو سلام سے پہلے ہوگا، جیسا کہ حضرت ابن بحینہؓ کی حدیث میں ہے۔

ب:... اگر ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ لیں، تو سجدۂ سہو سلام کے بعد ہوگا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔

ج... اگر ظہر یا عصر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو سلام کے بعد ہوگا، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔

د:... اور جن صورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم منقول نہیں، وہاں سجدۂ سہو سلام سے پہلے ہوگا۔

۴:... امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کا یہ قول امام احمد رحمہ اللہ کے موافق ہے، البتہ آخری شق میں انہیں اختلاف ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ: جن صورتوں کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں، وہاں زیادتی کی صورت میں سجدۂ سہو سلام کے بعد، اور کمی کی صورت میں سلام سے پہلے ہوگا۔

۵:... امام سفیان ثوری رحمہ اللہ اور بعض اہل کوفہ کے نزدیک ہر صورت میں سجدۂ سہو سلام کے بعد ہوگا، یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

سوم:... مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں کہ سجدۂ سہو قبل از سلام اور بعد از سلام دونوں طرح جائز ہے، اختلاف صرف افضلیت میں ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

"وهذا الخلاف في الأولوية."

ترجمہ: "یہ اختلاف صرف اولویت میں ہے۔"

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم (ج:۱ ص:۲۱۰) میں فرماتے ہیں:

"وَلَا خِلَافَ بَیْنَ ھٰؤُلَاءِ الْمُخْتَلِفِیْنَ وَغَیْرِھِمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ اَنَّهٗ لَوْ سَجَدَ قَبْلَ السَّلَامِ اَوْ بَعْدَهٗ لِلزِّیَادَةِ وَلِلنَّقْصِ اَنَّهٗ یُجْزِیْهِ، وَلَا تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ وَاِنَّمَا اخْتِلَافُھُمْ فِی الْاَفْضَلِ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔"

ترجمہ:... "ان اختلاف کرنے والے حضرات اور دیگر علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کسی نے سجدۂ سہو سلام سے پہلے کرلیا یا بعد میں کرلیا، خواہ زیادتی کی صورت میں ہو یا نقصان کی صورت میں، تو سجدۂ سہو بہرصورت صحیح ہے، اختلاف ہے تو اس میں ہے کہ افضل کونسی صورت ہے۔"

چہارم:... احناف رحمہم اللہ نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کے طریقے کو چند وجوہ سے راجح قرار دیا ہے۔

ایک یہ کہ اس طریقے سے تمام احادیث جمع ہوجاتی ہیں، اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا، چنانچہ جن احادیث میں دو سلاموں کا ذکر آتا ہے، وہ بھی اسی طریقے کی تائید کرتی ہیں۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل سے بھی یہی طریقہ راجح معلوم ہوتا ہے، چنانچہ بیشتر متفق علیہ احادیث اس مضمون کی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ سہو سلام کے بعد کیا، اور اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حسبِ ذیل ہیں:

۱:... صحیح بخاری (ج:۱ ص:۵۸)، ابوداؤد (ج:۱ ص:۱۴۶)، نسائی (ج:۱ ص:۱۸۳) میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِهٖ فَلْیَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْیُتِمَّ عَلَیْهِ ثُمَّ یُسَلِّمْ ثُمَّ لِیَسْجُدْ سَجْدَتَیْنِ۔"

besturdubooks.wordpress.com

فسهاء فسجد سجدتين ثم تشهد ثم سلم."

(ترمذی ج ۱ ص ۵۴)

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو ہوگیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ سہو کیے، پھر تشہد پڑھا، پھر سلام پھیرا۔"

اوپر حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح مسلم وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہے، جس میں دو مرتبہ سلام پھیرنے کا ذکر تھا، حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی ان دونوں روایتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا، پھر سجدۂ سہو کیا، پھر تشہد پڑھا اور پھر آخری سلام پھیرا۔

۳:- ابوداؤد (ج:۱ ص:۱۴۷) میں ابوعبیدہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اذا كنت في صلوة فشككت في ثلاث او اربع، واكبر ظنك على اربع، تشهدت ثم سجدت سجدتين وانت جالس قبل ان تسلم، ثم تشهدت ايضا ثم تسلم."

ترجمہ: "جب تم نماز میں ہو، تو تمہیں اس میں شک ہوجائے کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ اور زیادہ خیال چار کا ہو تو تشہد کے بعد سجدۂ سہو کرلو، آخری سلام سے پہلے دوبارہ تشہد پڑھو، اور پھر سلام پھیرو۔"

امام ابوداؤد رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ: متعدد حضرات (جن کے نام انہوں نے ذکر کئے ہیں) اس حدیث کو مرفوعاً نقل نہیں کرتے۔

۴:... مصنف ابن ابی شیبہ (ج:۲ ص:۳۱) میں ابوعبیدہ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے) اور ابراہیم نخعی رحمہما اللہ کی روایت سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ سجدۂ سہو کے بعد تشہد ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

سوالِ ہشتم:... مسائلِ وتر:

"سوال:... وتر کی نماز میں دو رکعات پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا، اور آخری یعنی تیسری رکعت میں فاتحہ اور سورت کی تلاوت کے بعد "اللہ اکبر" کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک اُٹھانا، اور پھر نیت باندھ کر قنوت پڑھنا، کس دلیل سے ثابت ہے؟ واضح فرمائیں۔ جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین، پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے، تو تشہد کے لئے دو رکعات پر نہ بیٹھے، بلکہ آخری رکعت پر ہی صرف بیٹھتے تھے، ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے، اسی ضمن میں وضاحت مطلوب ہے کہ قنوت دونوں ہاتھ دُعا کی طرح اُٹھاکر پڑھیں یا ہاتھ باندھ کر پڑھیں، احادیثِ نبوی سے کوئی ثبوت دے کر آگاہ فرمائیں۔"

جواب:... یہ سوال وتر سے متعلق چند مسائل پر مشتمل ہے۔

۱:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین ہی رکعتیں پڑھتے تھے، یا ایک، پانچ، سات بھی؟

۲:... وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ بھی فرماتے تھے یا نہیں؟

۳:... قنوتِ وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین؟

۴:... قنوتِ وتر ہاتھ اُٹھاکر پڑھی جائے یا ہاتھ باندھ کر؟

ان مسائل کو ترتیب وار لکھتا ہوں، واللہ الموفق!

پہلا مسئلہ:... وتر کی رکعات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک وتر کی تین رکعات کا تھا، ایک رکعت

الوتر." (نسائی ج:۱ ص:۲۴۸، موطا امام محمد ص:۱۵۱)

ترجمہ:... "سعد بن ہشام کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔"

۲:... امام حاکمؒ نے مستدرک (ج:۱ ص:۳۰۴) میں سعد بن ہشام کی روایت کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

"كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُسَلِّمُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الْوِتْرِ."

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔"

امام حاکم رحمہ اللہ اس کو نقل کرکے لکھتے ہیں:

"هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ وَلَمْ يُخْرِجَاهُ." (تلخیص ذہبی)

ترجمہ:... "یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔"

۳:... امام حاکم رحمہ اللہ نے سعد بن ہشام کی یہی روایت ایک اور سند سے نقل فرمائی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ، لَا يُسَلِّمُ إِلَّا فِي آخِرِهِنَّ، وَهٰذَا وِتْرُ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، وَعَنْهُ أَخَذَهُ أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ."

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے، اور صرف ان کے آخر میں سلام پھیرتے تھے، اور امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح وتر پڑھتے تھے،

besturdubooks.wordpress.com

اور اخیر میں سے اسی عدد نے اختیار کیا۔"

۵:... مسند احمد (ج:۶ ص:۲۵۴) میں سعد بن ہشام کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى الْعِشَاءَ دَخَلَ الْمَنْزِلَ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ صَلَّى بَعْدَهُمَا رَكْعَتَيْنِ أَطْوَلَ مِنْهُمَا، ثُمَّ أَوْتَرَ بِثَلَاثٍ، لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ، يَرْكَعُ وَهُوَ جَالِسٌ، وَيَسْجُدُ وَهُوَ جَالِسٌ۔"

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نمازِ عشاء سے فارغ ہوتے تو گھر میں تشریف لاتے، پھر دو رکعتیں پڑھتے، پھر ان کے بعد دو رکعتیں ان سے طویل پڑھتے، پھر تین وتر پڑھتے، ان کے درمیان فصل نہیں کرتے تھے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے، ان میں بیٹھ کر رکوع و سجود کرتے۔"

۶:... "عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِيْ قَيْسٍ قَالَ: قُلْتُ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: بِكَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ؟ قَالَتْ: كَانَ يُوْتِرُ بِأَرْبَعٍ وَثَلَاثٍ، وَسِتٍّ وَثَلَاثٍ، وَثَمَانٍ وَثَلَاثٍ، وَعَشْرٍ وَثَلَاثٍ، وَلَمْ يَكُنْ يُوْتِرُ بِأَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثَ عَشْرَةَ وَلَا أَنْقَصَ مِنْ سَبْعٍ۔"

(ابوداؤد ج:۱ ص:۱۹۳، طحاوی ج:۱ ص:۱۳۹)

ترجمہ:... "عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھا کرتے تھے؟ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر پڑھا کرتے تھے چار اور تین کے ساتھ، چھ اور

تین کے ساتھ، نو تھا اور تین کے ساتھ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی رکعتیں تیرہ سے زیادہ اور سات سے کم نہیں ہوتی تھیں۔"

یہاں وتر سے مراد مجموعی طور پر نمازِ تہجد ہے، تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں، اور باقی تہجد کی۔

۷:... "عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بْنِ جُرَيْجٍ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا بِأَيِّ شَيْءٍ كَانَ يُوْتِرُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ: كَانَ يَقْرَأُ فِي الْأُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى، وَفِي الثَّانِيَةِ بِقُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، وَفِي الثَّالِثَةِ بِقُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ. قَالَ أَبُوْ عِيْسٰى: هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔" (ترمذی ج:۱ ص:۹۱)

ترجمہ:... "عبدالعزیز بن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن سورتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے؟ فرمایا: پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی، دوسری میں قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ، اور تیسری میں قُلْ ھُوَ اللهُ اَحَدٌ اور معوذتین پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

۸:... "عَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ، يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَةِ الْأُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى، وَفِي الثَّانِيَةِ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، وَفِي الثَّالِثَةِ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ. هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ. وَقَالَ الذَّهَبِيُّ: رُوَاتُهُ ثِقَاتٌ عَنْهُ وَهُوَ عَلٰى شَرْطِ الْبُخَارِيِّ

وَیُصَلِّیْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ۔“

(نسائی ج:۱ ص:۲۴۹، واللفظ له، طحاوی ج:۱ ص:۱۳۰)

ترجمہ:... ”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے، اور وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے، اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے۔“

۱۱:... ”عَنْ سَعِیْدِ بْنِ جُبَیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ: کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْتِرُ بِثَلٰثٍ یَقْرَأُ فِی الْاُوْلٰی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی، وَفِی الثَّانِیَۃِ قُلْ یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ وَفِی الثَّالِثَۃِ قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔“

(سنن دارمی ج:۱ ص:۳۱۱، جامع ترمذی ج:۱ ص:۶۱، ابن ماجہ ص:۸۳، طحاوی ص:۱۴۰، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۸، محلی ابن حزم ج:۳ ص:۵۰)

ترجمہ:... ”سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے، پہلی رکعت میں ”سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی“، دوسری میں ”قُلْ یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ“ اور تیسری میں ”قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ“ پڑھا کرتے تھے۔“

نصب الرایہ (ج:۲ ص:۱۱۹) میں ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ نے ”خلاصہ“ میں اس کو باسناد صحیح لیا ہے۔ وتر کی تین رکعتوں میں تین سورتیں پڑھنے کی احادیث حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ کرام سے بھی مروی ہیں:

۱:... حضرت عبدالرحمن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ

(نسائی ج:۱ ص:۲۵۱، طحاوی ج:۱ ص:۱۴۳، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۸، عبدالرزاق ج:۳ ص:۳۳)

besturdubooks.wordpress.com

۲:... حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔

(نسائی ج:۱ ص:۲۴۸، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۰۰)

۳:... حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

(ترمذی ج:۱ ص:۶۱، عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۳، طحاوی ج:۱ ص:۱۴۳)

۴:... حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۲)

۵:... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۱)

۶:... حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۲)

۷:... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۱)

۸:... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۱)

۹:... حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ۔

(طحاوی ج:۱ ص:۱۴۲، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۸،
مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۱، کنز العمال ج:۱ ص:۹۳)

۱۰:... ابو خیثمہ عن ابیہ معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۱)

۱۱:... معارف السنن (ج:۴ ص:۲۲۲، ۲۲۶) میں حضرت جابر اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہما کا بھی حوالہ دیا ہے۔

۱۲:... "عَنْ عَامِرِ الشَّعْبِيِّ قَالَ: سَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: كَيْفَ كَانَ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ؟ فَقَالَا: ثَلٰثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً، ثَمَانٍ وَيُوْتِرُ بِثَلٰثٍ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْفَجْرِ." (طحاوی ج:۱ ص:۱۴۳)

ترجمہ:... "امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کا کیا معمول تھا؟ دونوں نے فرمایا کہ: تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے، آٹھ تہجد کی، تین وتر کی،

besturdubooks.wordpress.com

اور دو رکعتیں صبح صادق کے بعد۔"

۱۳:... "عَنْ ثَابِتِ الْبُنَانِيِّ قَالَ: قَالَ لِيْ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ: يَا ثَابِتُ! خُذْ عَنِّيْ، فَإِنَّكَ لَنْ تَأْخُذَ عَنْ أَحَدٍ أَوْثَقَ مِنِّيْ، إِنِّيْ أَخَذْتُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَخَذَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ جِبْرِيْلَ وَأَخَذَهُ جِبْرِيْلُ عَنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، قَالَ: ثُمَّ صَلَّى بِيَ الْعِشَاءَ ثُمَّ صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ يُسَلِّمُ بَيْنَ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَوْتَرَ بِثَلَاثٍ يُسَلِّمُ فِيْ آخِرِهِنَّ. رَوَاهُ الرُّوْيَانِيُّ وَابْنُ عَسَاكِرَ وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ." (کنز العمال ج:۸ ص:۶۶)

ترجمہ:... "حضرت ثابت بنانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: مجھ سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ثابت! مجھ سے سیکھ لو تم مجھ سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی سے حاصل نہیں کرسکو گے، میں نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے، اور جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، پھر چھ رکعتیں پڑھیں، پھر تین وتر پڑھ کر ان کے آخر میں سلام پھیرا۔"

۱۴:... "أَخْبَرَنَا أَبُوْ حَنِيْفَةَ، حَدَّثَنَا أَبُوْ جَعْفَرٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مَا بَيْنَ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ إِلٰى صَلٰوةِ الصُّبْحِ ثَلٰثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً، ثَمَانُ رَكَعَاتٍ تَطَوُّعًا، وَثَلٰثُ رَكَعَاتِ الْوِتْرِ وَرَكْعَتَيِ الْفَجْرِ."

(موطا امام محمد ص:۱۴۹)

ترجمہ:... "امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام باقر رحمہ اللہ سے

روایت کرتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عشاء اور نمازِ فجر کے درمیان تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، آٹھ نفل، تین رکعت وتر، اور دو رکعت سنتِ فجر۔"

ان احادیث سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:

الف:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تین وتر کا تھا۔

ب:۔ یہ تینوں رکعتیں ایک ہی سلام سے پڑھی جاتی تھیں۔

ج:۔ ان تین رکعتوں میں خاص خاص سورتوں کی تلاوت کا معمول تھا۔

اب اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۱:... "عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُوْتِرُوْا بِثَلٰثٍ، وَأَوْتِرُوْا بِخَمْسٍ أَوْ سَبْعٍ، وَلَا تَشَبَّهُوْا بِصَلٰوةِ الْمَغْرِبِ۔"

(طحاوی ج:۱ ص:۲۰۰، دارقطنی ص:[illegible] وقال رجاله ثقات، مستدرک حاکم ج:۱ ص:۳۰۴ وقال صحیح علی شرط الشیخین)

ترجمہ:۔ "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صرف تین رکعت وتر نہ پڑھا کرو، بلکہ پانچ یا سات رکعت پڑھا کرو، اور نمازِ مغرب کے ساتھ مشابہت نہ کرو۔"

۲:... "عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: صَلٰوةُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ النَّهَارِ فَأَوْتِرُوْا صَلٰوةَ اللَّیْلِ۔" (مصنف عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۸)

وَلِأَحْمَدَ عَنْهُ أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: صَلٰوةُ الْمَغْرِبِ أَوْتَرَتْ صَلٰوةَ النَّهَارِ فَأَوْتِرُوْا صَلٰوةَ

besturdubooks.wordpress.com

اللَّیْلِ. قَالَ الْعِرَاقِیُّ: سَنَدُہٗ صَحِیْحٌ۔"

(تخریج احیاء للعراقی. احیاء العلوم ج:۱ ص:۲۲۴، زرقانی شرح موطا ج:۱ ص:۲۵۹، اعلاء السنن ج:۶ ص:۱۱)

ترجمہ:... "ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نمازِ مغرب دن کے وتر ہیں، پس رات کی نماز کو وتر بنایا کرو۔

مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نمازِ مغرب نے دن کی نمازوں کو وتر بنادیا، پس رات کی نماز کو بھی وتر بنایا کرو۔"

۳:- "عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَلْوِتْرُ ثَلٰثٌ کَثَلٰثِ الْمَغْرِبِ۔"

(مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۲ رواہ الطبرانی فی الکبیر، وفیہ ابو بحر البکراوی وفیہ کلام کثیر. قلت: ورواہ الدارقطنی کما فی نصب الرایۃ ج:۲ ص:۱۲۰ عن اسماعیل المکی عن الحسن عن سعد بن ہشام عن عائشۃ مرفوعاً واسماعیل بن مسلم المکی فیہ ضعیف الحدیث من رجال الترمذی وابن ماجہ، کما فی التقریب)

ترجمہ:... "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وتر کی تین رکعتیں ہیں، جیسے نمازِ مغرب کی تین رکعتیں ہیں۔"

۴:- "عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: وِتْرُ اللَّیْلِ ثَلٰثٌ کَوِتْرِ النَّہَارِ صَلٰوۃِ الْمَغْرِبِ۔"[1] (رواہ الدارقطنی نصب الرایۃ ج:۲ ص:۱۲۰)

(۱) ان دونوں روایتوں کے مرفوع ہونے میں محدثین کو کلام ہے، لیکن اوّل تو ان کا مضمون دوسری صحیح احادیث سے مؤید ہے، پھر متعدد طرق کی وجہ سے یہ دونوں حدیثیں حسن ہیں، علاوہ ازیں حضرت عائشہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے ارشادات صحیح سند سے ثابت ہیں (جیسا کہ آگے آتا ہے) اور یہ بات عقل و رائے اور قیاس سے نہیں کہی جاسکتی، اس لئے موقوف احادیث بھی مرفوع کے حکم میں ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ...... "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کے وتر کی تین رکعتیں ہیں، جیسے کہ دن کے وتر کی یعنی نماز مغرب کی۔"

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ شارع علیہ السلام کی نظر میں وتر کی ٹھیک اسی طرح تین رکعتیں ہیں جس طرح نماز مغرب کی، نماز مغرب کی تین رکعتیں اس لئے مشروع کی گئیں تاکہ ان کے ذریعہ دن کی تمام نمازیں وتر (طاق) ہوجائیں "ان اللہ وتر یحب الوتر" ٹھیک اسی طرح وتر کی تین رکعتیں مشروع کی گئیں تاکہ ان کے ذریعہ رات کی نماز وتر (طاق) بن جائے، اسی لئے شارع علیہ السلام نے صرف تین وتر پر اکتفا کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ وتر سے پہلے کم از کم دو یا چار رکعات نفل پڑھنے کا حکم فرمایا، تاکہ نماز وتر اور نماز مغرب کے درمیان امتیاز ہوجائے، کیونکہ نماز مغرب سے پہلے نوافل نہیں پڑھے جاتے۔ خلاصہ یہ کہ رکعات کی تعداد میں نماز وتر مغرب کے مشابہ ہے، اس لئے دونوں کے درمیان فرق و امتیاز کی یہ صورت تجویز فرمائی گئی کہ مغرب سے پہلے نوافل نہیں، اور وتر سے پہلے کم از کم دو چار نوافل ضرور ہونے چاہئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلے میں صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) کا تعامل کیا تھا؟

۱:... "عن المسور بن مخرمة رضی اللہ عنہ قال: دفنا ابابکر رضی اللہ عنہ لیلا فقال عمر رضی اللہ عنہ: انی لم اوتر، فقام فصففنا وراءہ، فصلی بنا ثلث رکعات لم یسلم الا فی آخرھن۔"

(طحاوی ج:۱ ص:۱۷۳، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۳، عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۰)

ترجمہ:... "حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رات کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دفن سے فارغ

besturdubooks.wordpress.com

ہوئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے ابھی وتر نہیں پڑھے، پس وہ وتر کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو ہم نے بھی ان کے پیچھے صف باندھ لی، پس آپؓ نے تین رکعتیں پڑھائیں، جن میں صرف تیسری رکعت پر سلام پھیرا۔"

ظاہر ہے کہ اس موقع پر اکابر صحابہؓ موجود تھے، جنھوں نے اس عمل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی، ان اکابر کے عمل سے معلوم ہوا کہ وتر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولِ مبارک ایک سلام سے تین رکعت کا تھا۔

۲:... اوپر مستدرک حاکم (ج:۱ ص:۳۰۴) کے حوالے سے سعد بن ہشام کی روایت گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تیسری رکعت پر سلام پھیرا کرتے تھے، اس روایت کے آخر میں تھا:

"وَهٰذَا وِتْرُ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ."

ترجمہ:... "اور وتر میں یہی طریقہ تھا، امیرالمؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا۔"

۳:... "عَنْ إِبْرَاهِيْمَ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: مَا أُحِبُّ أَنِّيْ تَرَكْتُ الْوِتْرَ بِثَلَاثٍ وَأَنَّ لِيْ حُمْرَ النَّعَمِ." (موطا امام محمد ص:۱۴۹)

ترجمہ:... "حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: میں تین رکعات وتر کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا، خواہ اس کے بدلے میں مجھے سرخ اُونٹ بھی مل جائیں۔"

۴:... "عَنِ الْحَسَنِ، قِيْلَ لَهُ: كَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا يُسَلِّمُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنَ الْوِتْرِ، فَقَالَ: كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَفْقَهَ مِنْهُ، كَانَ يَنْهَضُ فِي الثَّالِثَةِ بِالتَّكْبِيْرِ."

(مستدرک حاکم ج:۱ ص:۳۰۴)

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ:... "حضرت حسن بصریؒ سے کہا گیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وتر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا کرتے تھے، فرمایا: ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ فقیہ تھے، وہ دوسری رکعت پر سلام پھیرے بغیر تکبیر کہہ کر اٹھ جایا کرتے تھے۔"

۵:... "عَنْ مَكْحُوْلٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهُ اَوْتَرَ بِثَلَاثِ رَكَعَاتٍ لَمْ يَفْصِلْ بَيْنَهُنَّ بِسَلَامٍ."

(ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۴)

ترجمہ:... "حضرت مکحولؒ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے، ان کے درمیان سلام کے ساتھ فصل نہیں کرتے تھے۔"

۶:... "عَنْ زَاذَانَ اَبِيْ عُمَرَ اَنَّ عَلِيًّا كَرَّمَ اللهُ وَجْهَهُ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ." (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۵)

ترجمہ:... "زاذان ابو عمر کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہی کیا کرتے تھے۔"

۷:... "عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اَلْوِتْرُ ثَلَاثٌ كَوِتْرِ النَّهَارِ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ."

(موطا امام محمد ص:۱۵۰، طحاوی ج:۱ ص:۱۷۳، عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۰، وقال الہیثمی فی الزوائد ج:۲ ص:۲۴۲ اخرجہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح)

ترجمہ:... "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں، جیسا کہ دن کے وتر یعنی نمازِ مغرب کی تین رکعتیں ہیں۔"

۸:... "عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ: اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَهْوَنُ مَا يَكُوْنُ الْوِتْرُ ثَلَاثُ

besturdubooks.wordpress.com

رکعات۔" (مؤطا امام محمد ص:۱۵۰)

ترجمہ: "حضرت علقمہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہمیں بتایا کہ وتر کی کم سے کم تین رکعتیں ہیں۔"

۹:... "عن ابراهيم عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قال: ما اجزأت ركعة واحدة قط۔" (مؤطا امام محمد ص:۱۵۰)

ترجمہ:... "حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت کبھی کافی نہیں ہوتی۔"

۱۰:... "عن عقبة بن مسلم قال: سألت عبدالله بن عمر رضي الله عنهما عن الوتر، فقال: أتعرف وتر النهار؟ قلت: نعم! صلوة المغرب، قال: صدقت وأحسنت۔" (طحاوی ج:۱ ص:۲۰۲، باسناد صحیح)

ترجمہ:... "عقبہ بن مسلمؒ کہتے ہیں: میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وتر کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی کتنی رکعتیں ہیں؟) تو فرمایا کہ تم دن کے وتر کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! نمازِ مغرب۔ فرمایا: تم نے ٹھیک کہا اور بہت اچھا جواب دیا (یعنی جتنی اس کی رکعتیں ہیں اتنی ہی رات کے وتر کی ہیں)۔"

۱۱:... "عن انس رضي الله عنه قال: الوتر ثلث ركعات، وكان يوتر بثلث ركعات۔"

(طحاوی ج:۱ ص:۲۰۳، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۳، وقال الحافظ فی الدرایہ: اسنادہ صحیح ص:۱۱۵)

ترجمہ:... "حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہوتی ہیں، اور وہ تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔"

رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے، بلکہ نمازِ مغرب کی طرح تیسری رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔"

۱۸:... "عن ابی غالب ان ابا امامة رضی الله عنه کان یوتر بثلاث." (طحاوی ج:۱ ص:۲۰۰، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۵)

ترجمہ:... "ابو غالب کہتے ہیں کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ تین وتر پڑھا کرتے تھے۔"

۱۹:... "عن ابی خالدة قال: سألت ابا العالیة عن الوتر فقال: علمنا اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم او علمونا ان الوتر مثل صلوٰة المغرب غیر انا نقرأ فی الثالثة، فهذا وتر اللیل وهذا وتر النهار." (طحاوی ج:۱ ص:۱۴۳)

ترجمہ:... "ابو خالدہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو العالیہ سے وتر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ وتر کی نماز مغرب کی نماز کی طرح پڑھی جاتی ہے، ماسوا اس کے کہ ہم اس کی تیسری رکعت میں بھی قراءت کرتے ہیں، پس یہ رات کا وتر ہے، اور مغرب دن کا وتر ہے۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک نمازِ مغرب اور نمازِ وتر کے درمیان کیفیت ادا میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں تھا کہ مغرب کی تیسری رکعت میں قراءت ضروری نہیں، اور وتر میں ضروری ہے۔

۲۰:... "عن القاسم قال: رأینا اناسا منذ ادرکنا یوترون بثلاث وان کلا لواسع وارجو ان لا یکون بشیء منه بأس." (بخاری ج:۱ ص:۱۳۵)

ترجمہ:... "قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ: ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، لوگوں کو تین وتر پڑھتے دیکھا ہے، دونوں طرح

besturdubooks.wordpress.com

گنجائش ہے، اور مجھے توقع ہے کہ کسی چیز میں بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔"
مطلب یہ ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو تین ہی وتر پڑھتے دیکھا ہے، چونکہ ان کے زمانے میں بعض حضرات اپنے اجتہاد سے ایک رکعت کے جواز کا بھی فتویٰ دینے لگے تھے، اس لئے اختلاف اجتہاد کی بنا پر فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کی اصل سنت تو تین ہی وتر ہے، ہاں! جو لوگ ایک رکعت کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، ان کا قول چونکہ اجتہاد پر مبنی ہے، اس لئے موافقہ ان سے بھی نہیں ہوگا۔

۲۱:... "عن علقمة قال: الوتر ثلاث."

(ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۳)

ترجمہ:... "حضرت علقمہؒ کا ارشاد ہے کہ: وتر کی تین رکعتیں ہیں۔"

۲۲:... "عن ابراهيم وكان يقال: لا وتر اقل من ثلاث." (ایضاً)

ترجمہ:... "حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ: (صحابہؓ کے زمانے میں) کہا جاتا تھا کہ تین سے کم وتر نہیں ہوتے۔"

۲۳:... "عن ابي اسحاق قال: كان اصحاب علي واصحاب عبدالله لا يسلمون في ركعتي الوتر."

(ایضاً ص:۲۹۵)

ترجمہ:... "ابواسحاقؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے اصحاب وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرا کرتے تھے۔"

۲۴:... "ثنا عبدالرحمن بن ابي الزناد عن ابيه عن المشيخة سعيد بن المسيب، وعروة بن الزبير، والقاسم بن محمد، وابي بكر بن عبدالرحمن، وخارجة

بن زید، وعبید اللہ بن عبداللہ، وسلیمان بن یسار، فی مشیخة سواھم أھل فقہ وصلاح وفضل، وربما اختلفوا فی الشیء، فأخذ بقول أکثرھم وأفضلھم رأیا فکان مما وعیت عنھم علی ھذہ الصفة أن الوتر ثلاث لا یسلم إلا فی آخرھن۔" (طحاوی ج:۱ ص:۲۰۲)

ترجمہ:... "ابوالزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ کے سات فقہاء یعنی سعید بن مسیبؒ، قاسم بن محمدؒ، عروہ بن زبیرؒ، ابوبکر بن عبدالرحمنؒ، خارجہ بن زیدؒ، عبیداللہ بن عبداللہؒ، سلیمان بن یسارؒ کا زمانہ اور ان کے علاوہ ایسے مشائخؒ کا زمانہ پایا ہے، جو علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ کبھی ان حضرات کا کسی مسئلے میں اختلاف ہوجاتا تو ان میں سے اکثر و افضل کے قول پر عمل کیا جاتا تھا، ان حضرات سے اسی شان کے ساتھ جو مسئلہ میں نے محفوظ کیا، وہ یہ تھا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔"

۲۵:... "عن أبی الزناد قال: أثبت عمر بن عبدالعزیز الوتر بالمدینة بقول الفقھاء، ثلاثا لا یسلم إلا فی آخرھن۔" (طحاوی ج:۱ ص:۲۰۳)

ترجمہ:... "ابوالزنادؒ فرماتے ہیں کہ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ نے فقہاء کے قول کے مطابق فیصلہ کیا تھا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں، جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔"

۲۶:... "عن الحسن قال: أجمع المسلمون علی أن الوتر ثلاث لا یسلم إلا فی آخرھن۔"

(ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۹۳)

ترجمہ:... "حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا

اس پر اطمینان ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں، ان کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار، مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ اور دیگر اکابر تابعین کے فتویٰ اور خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فیصلے سے وتر بھی تین معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زمانۂ صحابہ کرامؓ اور صحابہ کرامؓ سے تابعین عظامؒ تک تین وتر کی تعلیم بتوارث و تواتر کے ساتھ چلی آتی تھی، اسی کو امام حسن بصری رحمہ اللہ "مسلمانوں کے اجماع" سے تعبیر فرماتے ہیں۔

دوم یہ کہ بعض روایات کے پیش نظر بعض حضرات صحابہ و تابعین ایک رکعت وتر کے بھی قائل تھے، ان حضرات فقہاء نے ان روایات کی تحقیق و تنقیح کے بعد فتویٰ دیا (اور ان کے فتویٰ پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا) کہ احادیث صحیحہ اور جمہور صحابہ کے تعامل کے پیش نظر تین وتر کا قول ہی جادۂ مستقیم ہے، اس کے مقابلے میں دوسرے اقوال و آراء مرجوح اور شاذ ہیں۔

مخالف روایات پر ایک نظر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک اور حضرات صحابہ و تابعین کا تعامل و توارث معلوم ہو جانے کے بعد ان روایات کی تشریح بھی ضروری ہے جن کی طرف سوال میں اشارہ کر کے شبہ کیا گیا ہے:

"حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین، پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے اور تہجد کے لئے دو رکعات پڑھتے تھے، ان میں سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے۔"

اس قسم کی روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ذیل میں ہر روایت کی تشریح کی جاتی ہے۔

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا:

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، جنہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "أعلم أهل الأرض بوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم" فرمایا ہے، یعنی روئے زمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی سب سے زیادہ عالم۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۵۶)

وتر کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان سے متعدد راویوں نے مختلف طرق اور مختلف الفاظ سے نقل کی ہے، بعض حضرات نے ان مختلف الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی مختلف صورتیں قرار دیا ہے، حالانکہ اگر تمام طرق کو جمع کیا جائے تو قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین رکعتیں دو قعدوں اور ایک سلام کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے طرق پر غور کیا جاتا ہے۔

روایت سعد بن ہشام:

صحیح مسلم (ج۱ ص:۲۵۶) میں سعد بن ہشام انصاری کی روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا:

"أَنْبِئِينِي عَنْ وِتْرِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: كُنَّا نُعِدُّ لَهُ سِوَاكَهُ وَطَهُورَهُ، فَيَبْعَثُهُ اللهُ مَا شَاءَ أَنْ يَبْعَثَهُ مِنَ اللَّيْلِ، فَيَتَسَوَّكُ وَيَتَوَضَّأُ، وَيُصَلِّي تِسْعَ رَكَعَاتٍ لَا يَجْلِسُ فِيهَا إِلَّا فِي الثَّامِنَةِ، فَيَذْكُرُ اللهَ وَيَحْمَدُهُ وَيَدْعُوهُ، ثُمَّ يَنْهَضُ وَلَا يُسَلِّمُ، ثُمَّ يَقُومُ فَيُصَلِّي التَّاسِعَةَ، ثُمَّ يَقْعُدُ فَيَذْكُرُ اللهَ وَيَحْمَدُهُ وَيَدْعُوهُ، ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيمًا يُسْمِعُنَا، ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ وَهُوَ قَاعِدٌ، فَتِلْكَ إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً يَا بُنَيَّ! فَلَمَّا أَسَنَّ نَبِيُّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَخَذَهُ اللَّحْمُ أَوْتَرَ بِسَبْعٍ وَصَنَعَ

ترجمہ:... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔“

اور مستدرک حاکم (ج:۱ ص:۳۰۴) میں یہی حدیث ان الفاظ سے ہے:

”کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ لَا يُسَلِّمُ إِلَّا فِيْ اٰخِرِهِنَّ۔“

ترجمہ:... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے، اور صرف ان کے آخر میں سلام پھیرا کرتے تھے۔“

اور مسندِ احمد (ج:۶ ص:۱۵۶) میں سعد بن ہشام کی یہی حدیث ان الفاظ میں ہے:

”اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا صَلَّى الْعِشَاءَ دَخَلَ الْمَنْزِلَ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ صَلَّى بَعْدَهُمَا رَكْعَتَيْنِ اَطْوَلَ مِنْهُمَا، ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ۔“

ترجمہ:... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نمازِ عشاء سے فارغ ہوکر گھر میں تشریف لاتے تو پہلے دو رکعتیں پڑھتے، پھر دو رکعتیں ان سے طویل پڑھتے، پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے، ایسے طور پر کہ ان کے درمیان سلام کا فصل نہیں کرتے تھے، پھر بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے۔“

یہ ایک ہی راوی کی روایت کے مختلف الفاظ ہیں، ان تمام طرق و الفاظ کو جمع کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ:

الف:... سعد بن ہشام کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل نو رکعتیں پڑھتے تھے، جن میں وتر اور وتر کے بعد کے دو نفل بھی شامل تھے۔

ب:... ہر دو رکعت پر قعدہ کرتے تھے۔

ج:... ان میں تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں۔

۵:... وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ کرتے تھے مگر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

۶:... وتر کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھتے تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح مسلم میں سعد بن ہشام کی روایت میں جن نو رکعتوں کا ذکر ہے، ان میں چھ رکعتیں تہجد کے نوافل تھے، اور تین رکعتیں وتر کی، مگر روایت میں وتر سے ماقبل و مابعد کے نوافل کو ملا کر ذکر کر دیا گیا، جس سے اشکال پیدا ہوا۔ چونکہ ان کا سوال صلوٰۃ اللیل کے بارے میں نہیں، بلکہ وتر کے بارے میں تھا، اس لئے جواب میں حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے صلوٰۃ اللیل کی رکعات کو تو اجمالاً بیان فرمایا، اور ان رکعات میں سے جو رکعات وتر کی تھیں، ان کی تفصیل بیان فرمائی کہ آٹھویں رکعت پر جو وتر کی دوسری رکعت تھی، قعدہ فرماتے تھے مگر سلام نہیں پھیرتے تھے، اور نویں رکعت پر، جو وتر کی تیسری رکعت تھی، سلام پھیرتے تھے۔

یہی مضمون کو سعد بن ہشام کی دوسری روایات میں بیان فرمایا گیا ہے، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، پس صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ام المؤمنین کا یہ ارشاد کہ:

"نو رکعتیں پڑھتے تھے، ان میں نہیں بیٹھتے تھے مگر آٹھویں
میں، پس ذکر و حمد اور دعا کے بعد اٹھ جاتے تھے اور سلام نہیں پھیرتے
تھے، بلکہ نویں رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے تھے۔"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان آٹھ رکعتوں میں قعدہ ہوتا ہی نہیں تھا، کیونکہ یہ مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی احادیث کے خلاف ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آٹھویں رکعت پر بغیر سلام کے جو قعدہ فرماتے تھے، پچھلی رکعتوں میں ایسا قعدہ نہیں فرماتے تھے، بلکہ ماقبل کی رکعتوں میں ہر دوگانہ پر سلام پھیرتے تھے، مگر چونکہ ساتویں اور آٹھویں رکعت کو نویں رکعت کے ساتھ ملا کر تین وتر پڑھنا مقصود ہوتا تھا، اس لئے آٹھویں رکعت پر قعدۂ سلام نہیں کرتے تھے، بلکہ قعدہ کرنے کے بعد سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے تھے۔ اس تقریر کے بعد سعد بن ہشام کی روایات متفق ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا، اور ایک ہی راوی کی روایت، ایک ہی سند سے مختلف الفاظ میں مروی ہو، تو اس کو

besturdubooks.wordpress.com

متعدد واقعات پر محمول کر کے یہ سمجھ لینا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ایسا کرتے ہوں گے اور کبھی ایسا کرتے ہوں گے، صحیح طرزِ فکر نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ہی واقعے کی مختلف تعبیرات ہیں، ایک ہی واقعے کو جب نقل کرنے والے مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں نقل کریں تو وہ متعدد واقعات نہیں بن جاتے۔

روایتِ عروہؒ عن عائشہؓ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وتر کی نماز نقل کرنے والوں میں سے ایک ان کے خواہر زادہ حضرت عروہ بن زبیرؒ ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی روایت بھی مختلف الفاظ سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے:

"يُصَلِّيْ بِاللَّيْلِ إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُوْتِرُ مِنْهَا بِوَاحِدَةٍ، فَإِذَا فَرَغَ مِنْهَا اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ حَتّٰى يَأْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۴)

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے ان میں سے ایک رکعت سے وتر کیا کرتے تھے، اس سے فارغ ہوتے تو داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے، یہاں تک کہ مؤذن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو دو ہلکی پھلکی رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔"

دوسری روایت میں ہے:

"يُصَلِّيْ فِيْمَا أَنْ يَفْرُغَ مِنْ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ إِلَى الْفَجْرِ إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ، فَإِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ مِنْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَجَاءَهُ وَتَبَيَّنَ لَهُ الْفَجْرُ قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ، ثُمَّ اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ حَتّٰى يَأْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلْإِقَامَةِ۔"

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۴)

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ:... "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عشاء سے فارغ ہونے سے لے کر فجر تک گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، ہر دو رکعت کے درمیان سلام پھیرتے اور ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھتے، پھر جب مؤذن اذانِ فجر سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا اور صبح روشن ہوجاتی، تو دو ہلکی سی رکعتیں پڑھتے، پھر داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے، یہاں تک کہ مؤذن اقامت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا۔"

تیسری روایت میں ہے:

"کَانَ یُصَلِّیْ بِاللَّیْلِ ثَلٰثَ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً، ثُمَّ یُصَلِّیْ اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ رَکْعَتَیْنِ خَفِیْفَتَیْنِ۔" (طحاوی ج:۱ ص:۱۹۵)

ترجمہ:... "رات میں تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، پھر جب فجر کی اذان سنتے تو دو ہلکی سی رکعتیں پڑھتے۔"

چوتھی روایت میں ہے:

"یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ ثَلٰثَ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً یُوْتِرُ مِنْ ذٰلِکَ بِخَمْسٍ وَلَا یَجْلِسُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا فِیْ اٰخِرِھَا۔"

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۴)

ترجمہ:... "رات میں تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، ان میں سے پانچ کے ساتھ وتر پڑھتے اور ان پانچ میں نہیں بیٹھتے تھے مگر ان کے آخر میں۔"

اور پانچویں روایت میں ہے:

"کَانَ یُصَلِّیْ ثَلٰثَ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً بِرَکْعَتَیِ الْفَجْرِ۔"

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۴)

ترجمہ:... "آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتِ فجر سمیت تیرہ

besturdubooks.wordpress.com

رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔"

حضرت عروہ رحمہ اللہ کی ان روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری احادیث سے بھی متعارض نظر آتی ہیں، مگر ہمارے نزدیک یہ روایات متعارض نہیں، اور نہ متعدد واقعات پر محمول ہیں، بلکہ ایک ہی واقعے کی مختلف تعبیرات ہیں۔

چنانچہ جس روایت میں فرمایا گیا ہے کہ: "گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے، اور ایک رکعت سے وتر کیا کرتے تھے" اس میں دو حکم الگ الگ ذکر کئے گئے ہیں، ایک ہر دو رکعت پر بیٹھنا، اور دوسرے ایک رکعت کو ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر وتر بنانا، پہلا حکم وتر سے قبل کی نفل رکعتوں سے متعلق ہے اور دوسرا حکم وتر کی تین رکعات سے متعلق ہے، پس روایت کا یہ مطلب نہیں کہ وتر کی تنہا ایک رکعت پڑھتے تھے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ گیارھویں رکعت کو ماقبل کے دوگانہ سے ملا کر وتر بناتے تھے۔ اگر کسی شخص نے ایک وتر کا نظریہ پہلے سے ذہن میں نہ جما رکھا ہو تو ہم نے اس روایت کا جو مطلب بیان کیا، وہ روایت کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے، جس پر دو صاف اور صریح قرینے موجود ہیں، ایک یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متواتر روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے، اور خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ صرف تین رکعت وتر نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ اس سے قبل دو یا چار رکعتیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔ الغرض جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعدد حضرات کی صحیح روایات موجود ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے، تو حضرت عروہ کی روایت کو بھی اسی پر محمول کرنا لازم ہوگا۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ خود حضرت عروہ رحمہ اللہ کا فتویٰ فقہائے سبعہ کے فتویٰ میں گزر چکا ہے:

"الوتر ثلاث لا یفصل بینھن بسلام۔"

ترجمہ:... "وتر کی تین رکعتیں ہیں، جن کے درمیان سلام کے ساتھ فصل نہیں کیا جاتا۔"

اب اگر ان کی روایت "یوتر بواحدۃ" کا مطلب یہ ہوتا کہ تنہا ایک وتر پڑھتے تھے تو ان کا فتویٰ غلط ہوتا، پس ان کی روایت کا صحیح مطلب وہی ہوگا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باقی احادیث کے بھی مطابق ہے، اور خود حضرت عروہؒ کے اپنے فتویٰ کے بھی موافق ہے۔

اور جس روایت میں یہ ہے کہ: "پانچ رکعت وتر پڑھتے تھے ان کے صرف آخر میں بیٹھتے تھے" اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان پانچ رکعتوں میں نہ قعدہ کرتے تھے اور نہ سلام پھیرتے تھے، کیونکہ یہ مطلب خود حضرت عروہؒ کی مذکورہ روایت کے خلاف ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: "ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے" اور ایک ہی راوی کی ایک ہی سند سے روایت شدہ حدیث کو الگ الگ واقعات پر محمول کرنا قطعاً غیرمعقول ہے، بلکہ اس کا صحیح مطلب جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث اور خود حضرت عروہ رحمہ اللہ کی روایت اور فتویٰ کے مطابق ہے، یہ ہے کہ صلوٰۃ اللیل کی تیرہ رکعتیں ہوتی تھیں، ان میں سے چھ رکعتوں کے درمیان تو وقفہ فرماتے تھے لیکن پانچ رکعتیں ایک ساتھ پڑھتے تھے، پہلے دو نفل اور پھر تین وتر، ان کے درمیان وقفہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ پانچ رکعتیں پڑھ کر بیٹھتے تھے۔ الغرض اس روایت میں وتر سے پہلے کی دو رکعتوں پر سلام پھیرنے کی نفی نہیں، نہ وتر کے بیچ قعدے کی نفی ہے، بلکہ ان پانچ رکعتوں کی وحدت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کے درمیان وقفہ نہیں فرماتے تھے۔ یا یوں کہئے کہ اس روایت میں "جلوس فی الصلوٰۃ" کی نفی نہیں، بلکہ "جلوس بعد السلام" کی نفی ہے، اور اس کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے جمع کرنے کو یوں تعبیر فرمایا:

"صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثمانیا جمیعا وسبعا جمیعا۔" (صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۴۶)

ترجمہ:... "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتیں اکٹھی اور سات رکعتیں اکٹھی پڑھی ہیں۔"

اب اس کا مطلب کوئی عاقل یہ نہیں سمجھے گا کہ ظہر و عصر کی آٹھ رکعتیں اور مغرب و

عشاء کی سات رکعتیں ایک ہی سلام اور ایک ہی قعدے کے ساتھ پڑھی ہوں گی، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں میں جب ایک وقت جمع فرمایا تو یہ مطلوب ہوتا ہے۔ اسی طرح زیرِ بحث روایت کا مطلب سمجھنا چاہئے کہ یہاں پانچ رکعتوں میں وقفہ بیٹھنے کی نفی ہے، سلام یا قعدے کی نفی نہیں۔

ابن ابی شیبہ (ج:۲ ص:۲۹۴) میں عروہ کی روایت میں ہے:

"کَانَ یُوْتِرُ بِرَکْعَۃٍ، وَکَانَ یَتَکَلَّمُ بَیْنَ الرَّکْعَتَیْنِ وَالرَّکْعَۃِ۔"

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھتے تھے، اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان کلام فرماتے تھے۔"

اس روایت میں "یُوْتِرُ بِرَکْعَۃٍ" کا مطلب تو وہی ہے جو اوپر ذکر کرچکا ہوں، یعنی آخری رکعت کو ما قبل کی دو رکعتوں کے ساتھ ملاکر تین وتر پڑھتے تھے، اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان جو کلام کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد بعد کی دو رکعتیں ہیں، جیسا کہ دیگر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مروی ہے کہ وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابوسلمہ بن عبدالرحمن، عمرۃ بنت عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی قیس، اور عبدالعزیز بن جریج رحمہم اللہ بھی وتر کی حدیث نقل کرتے ہیں، اور ان میں تین وتر کی صراحت موجود ہے۔ سعد بن ہشام، مسروق بن اجدعؒ، اور یحییٰ بن جزار رحمہم اللہ بھی روایت کرتے ہیں، ان کی روایات میں تین وتر کی اگرچہ صراحت نہیں، لیکن ان روایات کو دوسری روایت کے ساتھ ملاکر پڑھا جائے تو تین ہی وتر نکلیں گے۔ الغرض حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو بقول اہلِ علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی سب سے زیادہ عالم ہیں، ان کی تمام روایات کو جمع کیا جائے تو مجموعہ تین ہی وتر نکلتی ہے، اور سعد بن ہشام اور عروہ بن زبیر رحمہما اللہ کی جن ایک دو روایتوں سے اس کے خلاف کا وہم

ہوتا ہے، اس کا صحیح جواب اوپر عرض کیا جاچکا ہے۔

یہاں اس امر پر بھی تنبیہ کرنا ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ تہجد (صلوٰۃ اللیل) کی رکعات میں تو کمی بیشی ہوجاتی تھی، لیکن تین وتر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا، اس کو بھی حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے واضح فرمادیا، چنانچہ سعد بن ہشام، مسروق بن اجدعؒ اور یحییٰ بن جزار رحمہم اللہ کی روایت میں کبرسنی سے پہلے اور بعد کی نماز کا فرق بیان فرمایا گیا ہے مگر وتر دونوں جگہ تین ہیں، اور عبداللہ بن ابی قیسؒ کی روایت میں ہے:

"بِأَرْبَعٍ وَثَلَاثٍ، وَسِتٍّ وَثَلَاثٍ، وَثَمَانٍ وَثَلَاثٍ۔"

(ابوداؤد ج:۱ ص:۱۹۳، طحاوی ج:۱ ص:۱۳۹)

ترجمہ: "چار اور تین، چھ اور تین، اور آٹھ اور تین۔"

یعنی تہجد کی رکعتیں کبھی چار، کبھی چھ اور کبھی آٹھ ہوتی تھیں، مگر وتر بہرصورت تین رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی رکعات میں بھی کوئی تغیر ہوتا تو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اسے بھی ضرور بیان فرماتیں، خصوصاً جبکہ عبداللہ بن ابی قیسؒ کا سوال وتر کے بارے میں تھا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"قُلْتُ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: بِكَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ؟"

ترجمہ: "میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے؟"

اگر وتر کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مختلف ہوتی تو اس موقع پر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اس کا اظہار ضرور فرماتیں، رکعاتِ تہجد میں کمی بیشی کو بیان کرنا اور وتر کی رکعات کو بہرصورت تین بیان کرنا اس امر کی طرف صاف اور واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول تین رکعت وتر تھا، اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل!

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک رات اپنی خالہ ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اسی مقصد کے لئے قیام کیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام لیل کا مشاہدہ کریں۔ ان کی یہ روایت بھی مختلف طرق اور مختلف الفاظ میں مروی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"والحاصل ان قصة مبيت ابن عباس رضي الله عنهما يغلب على الظن عدم تعددها، فلهذا ينبغي الاعتناء بالجمع بين مختلف الروايات فيها، ولا شك ان الأخذ بما اتفق عليه الأكثر والأحفظ أولى مما خالفهم فيه من هو دونهم ولا سيما ان زاد أو نقص."

(فتح الباری ج:۲ ص:۴۸۴ طبع مصر)

ترجمہ:... "حاصل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کاشانۂ نبوت میں رات گزارنے کا واقعہ غالب خیال یہ ہے کہ ایک ہی بار کا ہے، اس لئے اس قصے میں جو مختلف روایات وارد ہیں، ان کو جمع کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے، اور کوئی شک نہیں کہ جس قصے پر اکثر اور احفظ متفق ہوں، وہ اولیٰ ہوگا، بہ نسبت ان راویوں کے جو ان سے فروتر ہوں، خصوصاً جبکہ کمی یا زیادتی ہو۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعدد راوی تین وتر کی تصریح کرتے ہیں، مثلاً:

۱:... ابن عباس رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے علی بن عبداللہ کی روایت میں ہے:

"ثم أوتر بثلاث."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۶۱، نسائی ج:۱ ص:۲۴۹، طحاوی ج:۱ ص:۱۴۰)

ترجمہ:... "پھر آپ نے تین وتر پڑھے۔"

۲:... یحییٰ بن الجزار کی روایت میں ہے:

"کَانَ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ ثَمَانَ رَکْعَاتٍ وَیُوْتِرُ بِثَلَاثٍ وَیُصَلِّیْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ."

(نسائی ج:۱ ص:۲۴۹، طحاوی ص:۱۹۰)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں آٹھ رکعتیں پڑھتے، تین وتر پڑھتے اور دو رکعتیں نمازِ فجر سے پہلے پڑھتے تھے۔"

۳:... کریبؒ مولیٰ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے:

"فَصَلّٰی رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَکْعَتَیْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ."	(طحاوی ج:۱ ص:۱۴۱)

ترجمہ:... "پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے بعد دو رکعتیں پڑھیں، پھر دو رکعتیں، پھر دو رکعتیں، پھر دو رکعتیں، پھر تین وتر پڑھے۔"

اور صحیحین میں کریب رحمہ اللہ کی روایت سے ہے:

"فَصَلّٰی رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ اَوْتَرَ."

(بخاری ج:۱ ص:۱۳۵، مسلم ج:۱ ص:۲۶۰)

ترجمہ:... "پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر وتر پڑھے۔"

چونکہ علی بن عبداللہ، یحییٰ بن جزار اور خود کریب رحمہم اللہ کی مذکورہ روایات میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین وتر پڑھے تھے، اس لئے صحیحین کی روایت میں جو چھ مرتبہ دو دو رکعت کا ذکر کرنے کے بعد "ثُمَّ اَوْتَرَ" آیا ہے، اس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری تشہد کے ساتھ ایک رکعت ملا کر تین وتر پڑھے، جیسا کہ اوپر ام المؤمنین عائشہؓ کی روایت میں اس کی تصریح گزر چکی

ہے۔ خود حافظ رحمہ اللہ نے بھی "فتح الباری" (ج ۲ ص ۳۹۸) میں یحییٰ بن جزار کی روایت کو ناطق قرار دے کر اس کے حوالے سے شیخین کی اس روایت میں تاویل کی ہے۔

الغرض جب حدیث ابن عباسؓ کے متعدد طرق اس پر متفق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات تین وتر پڑھے تھے، اور خود کریب رحمہ اللہ کی ایک روایت میں بھی اس کی صراحت موجود ہے، تو کریب کی وہ روایت جس میں دونوں احتمال نکل سکتے ہیں، اس کو بھی اسی پر محمول کرنا لازم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پچھلی دو رکعتوں سے ملا کر تین وتر پڑھے، اسے ایک وتر پر محمول کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

کریب رحمہ اللہ کی زیر بحث روایت کے مماثل ایک روایت صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۶۲) اور ابوداؤد (ج ۱ ص ۱۹۳) میں حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں چھ مرتبہ دو دو رکعتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: "ثم اوتر" جو مطلب اوپر کریب کی روایت کا بیان کیا گیا ہے، وہی مفہوم اس کا بھی ہے، یعنی تیرہویں رکعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلی دو رکعتوں کے ساتھ ملا کر پڑھی، اور اس کا قرینہ طحاوی (ج ۱ ص ۱۴۰) کی روایت ہے، جس میں پانچ مرتبہ دو دو رکعتوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے: "ثم اوتر" (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھے) گویا طحاوی کی روایت میں آخری دو رکعتوں کو تیسری رکعت کے ساتھ ملا کر وتر میں شامل کر دیا گیا، اور مسلم و ابوداؤد کی روایت میں وتر کی تین رکعتوں میں سے دو الگ اور ایک کو الگ ذکر کر دیا گیا، یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے، ورنہ واقعہ بہرصورت ایک ہے، اور وہ ہے تین وتر۔

۳:... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت ہے:

"كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر بثلاث ..... الخ"

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔"

یہ پوری حدیث امام احمد حدیث کے ضمن میں نمبر ۱۱ پر باحوالہ ذکر کر چکا ہوں، اور

besturdubooks.wordpress.com

وہاں یہ بھی ذکر کر چکا ہوں کہ اس مضمون کی متواتر احادیث جن سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے مروی ہیں۔

اور صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۳۵) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت ہے:

"فَصَلّٰی أَرْبَعَ رَکْعَاتٍ، ثُمَّ نَامَ، ثُمَّ قَامَ، فَجِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ یَسَارِہٖ، فَجَعَلَنِیْ عَنْ یَمِیْنِہٖ، فَصَلّٰی خَمْسَ رَکْعَاتٍ، ثُمَّ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ۔"

ترجمہ:... "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعات پڑھیں، پھر سوگئے، پھر اُٹھے، میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب کھڑا ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دائیں جانب کرلیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ رکعتیں پڑھیں، پھر دو رکعتیں (سنتِ فجر) پڑھیں۔"

اس روایت میں کوئی شخص نہیں کہے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی چار رکعتیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھی ہوں گی، اسی طرح آخری پانچ رکعات کے بارے میں نہیں کہا جائے گا کہ انہیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ ادا فرمایا تھا، بلکہ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی گزشتہ بالا روایت کے پیشِ نظر ہر شخص اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ دو رکعتیں الگ پڑھیں اور تین رکعتیں (وتر) الگ۔ راوی کا مقصود یہ نہیں کہ ان پانچ رکعتوں میں نہ قعدہ تھا، نہ سلام، بلکہ مقصود ان پانچ رکعتوں کی موالات کو بیان کرنا ہے، یعنی جس طرح پہلی چار رکعتیں لگاتار پڑھی تھیں، ان کے درمیان وقفہ نہیں فرمایا تھا، اسی طرح یہ پانچ رکعتیں بھی لگاتار بغیر وقفے کے پڑھی تھیں۔ اور اسی مضمون کو ابوداؤد (ج:۱ ص:۱۹۳) کی روایت میں یوں تعبیر کیا ہے:

"ثُمَّ أَوْتَرَ بِخَمْسٍ لَمْ یَجْلِسْ بَیْنَھُنَّ۔"

ترجمہ:... "پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھے پانچ

رکعتوں کے ساتھ، ان کے درمیان میں نہیں بیٹھے۔"

مطلب یہ کہ پہلے دو رکعتیں پڑھیں، پھر تین وتر، اور ان کے درمیان وقفہ نہیں فرمایا۔ چونکہ یہ پانچ رکعتیں بغیر وقفے کے تھیں، اس لئے مجموعے پر وتر کا اطلاق کردیا گیا، اور وتر کے ساتھ کے نوافل پر "وتر" کا اطلاق بکثرت ہوا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قصے کی تمام روایات کو جمع کیا جائے تو ان میں سے متعدد روایات میں تین وتر کی تصریح ہے، اور باقی روایات اس کے لئے محتمل ہیں، اس لئے ان روایات کو بھی تین ہی وتر پر محمول کیا جائے گا، ان کو الگ الگ واقعات پر محمول کرکے وتر کی مختلف صورتیں قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں، بلکہ جیسا کہ حافظ رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کرچکا ہوں، یہ ایک ہی واقعے کی مختلف تعبیرات ہیں، اور ایک ہی واقعے کو اگر راوی مختلف عنوانات اور مختلف تعبیرات سے بیان کریں تو اس سے کئی واقعات نہیں بن جایا کرتے، اور نہ مختلف تعبیرات سے جوازِ وتر کی مختلف صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں، خصوصاً جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ اوپر نقل کرچکا ہوں کہ صرف تین وتر پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس کے ساتھ دو چار نوافل ضرور پڑھنے چاہئیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک وتر کی تین ہی رکعتیں ہیں، اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کا مشاہدہ کیا تھا۔

حدیثِ اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا:

اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے یحییٰ بن جزار کی روایت ہے:

"کَانَ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ إِحْدٰی عَشْرَةَ رَکْعَةً فَلَمَّا کَبُرَ وَضَعُفَ أَوْتَرَ بِسَبْعٍ."

(نسائی ج:۱ ص:۲۵۱، ترمذی ج:۱ ص:۱۰۰)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، مگر جب کبرسنی کی وجہ سے ضعف ہوگیا تو سات رکعتیں پڑھنے لگے۔"

یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق ہے، اور یحییٰ بن الجزار کی حدیث میں یہ تصریح موجود ہے کہ ان میں آٹھ رکعتیں نوافل کی اور تین وتر کی ہوتی تھیں، مگر مجموعہ صلوٰۃ اللیل کو لفظ "وتر" سے تعبیر کر دیا گیا، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ذیل میں اسحاق بن راہویہ سے اس کی تصریح نقل کی ہے:

"انما معناہ انہ کان یصلی من اللیل ثلث عشرۃ رکعۃ مع الوتر فنسبت صلوٰۃ اللیل الی الوتر۔"

(ترمذی ج:۱ ص:۶۰)

ترجمہ: "اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں وتر سمیت تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اس لئے صلوٰۃ اللیل کی نسبت وتر کی طرف بھی کر دی گئی ہے۔"

اور نسائی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جو مروی ہے کہ:

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوتر بخمس وسبع لا یفصل بینھا بسلام ولا کلام۔" (ج:۱ ص:۲۴۹)

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ اور سات رکعات کے ساتھ وتر پڑھتے تھے، ان کے درمیان سلام و کلام کا فصل نہیں فرماتے تھے۔"

اوّل تو اس کی سند مضطرب ہے، جیسا کہ امام نسائی نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے کہ کبھی مقسم اسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، کبھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کا واسطہ ذکر کرتے ہیں، اور کبھی حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما سے یہ قول منسوب کرتے ہیں:

"الوتر سبع، فلا اقل من خمس۔"

ترجمہ: "وتر سات ہوتے ہیں، پانچ سے کم نہیں۔"

ایسی مضطرب روایت متواتر روایات کے مقابلے میں حجت نہیں ہو سکتی، علاوہ از

اس کو صحیح کہا ہو تو خود اس میں تاویل کی جائے گی کہ ان پانچ یا سات رکعتوں میں بلند آواز سے سلام نہیں کہتے تھے، نہ کسی سے گفتگو فرماتے تھے، آخری رکعت سے فارغ ہوکر اس قدر بلند آواز سے سلام کہتے تھے کہ گویا گھر والے جاگ پڑیں گے۔ یہ مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات میں صراحت سے آیا ہے، اس لئے اس کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

حدیثِ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما:

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

"إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَلٰوةِ اللَّيْلِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلّٰى رَكْعَةً وَاحِدَةً تُوْتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلّٰى."

(بخاری ج:۱ ص:۱۳۶، مسلم ج:۱ ص:۲۵۷)

ترجمہ..... "ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ اللیل کے بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے، پھر جب تم میں سے ایک کو صبح کا اندیشہ ہو جائے تو ایک رکعت پڑھ لے، وہ اس کی پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دے گی۔"

اور صحیح مسلم (ج:۱ ص:۲۵۷) میں بروایت ابی مجلز، حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

"اَلْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ."

ترجمہ: "وتر ایک رکعت ہے رات کے آخری حصے میں۔"

صحیح مسلم کی یہ روایت مستقل حدیث نہیں، بلکہ گزشتہ بالا حدیث ہی کا اختصار ہے، چنانچہ ابن ماجہ ص:۸۳ پر یہ روایت یوں ہے:

"صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى وَالْوِتْرُ رَكْعَةٌ قَبْلَ الصُّبْحِ."

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ... "رات کی نماز دو، دو رکعت ہے، اور وتر ایک رکعت ہے صبح سے پہلے۔"

بعض حضرات کو خیال ہوا ہے کہ یہ حدیث ایک وتر کے جواز پر نص صریح اور برہان قاطع ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ حق تعالیٰ شانہ حافظ ابن حجرؒ کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ وہ "فتح الباری" میں ہمیں اس کے جواب سے سبکدوش کر گئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"وتعقب بانه ليس صريحا في الفصل، فيحتمل ان يريد بقوله: "صلى ركعة واحدة" اى مضافة الى ركعتين مما مضى." (فتح الباری ج:۲ ص:۴۷۹)

ترجمہ... "یہ حدیث ایک رکعت کے الگ پڑھنے میں صریح نہیں، کیونکہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہو کہ گزشتہ دو رکعتوں کے ساتھ ایک اور رکعت ملا کر تین وتر پڑھے۔"

شرح اس کی یہ ہے کہ وتر (طاق) ہونا آخری رکعت پر موقوف ہے، جس کے ذریعہ نمازی اپنی نماز کو وتر (طاق) بنائے گا، اس کے بغیر خواہ ساری رات بھی نماز پڑھتا رہے، اس کی نماز وتر نہیں بن سکتی، اور نہ اس کے بغیر وتر کا وجود متحقق ہو سکتا ہے، اس حقیقت کے اظہار کے لئے فرمایا گیا:

"الوتر ركعة من آخر الليل."

ترجمہ... "وتر ایک رکعت ہے رات کے آخری حصے میں۔"

اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ حج کے بارے میں فرمایا گیا: "الحج عرفة" حج عرفہ کا نام ہے۔ (جامع صغیر ج:۱ ص:۱۵۱، بحوالہ سنن اربعہ و مسند احمد وغیرہ)

جس کا مطلب یہ ہے کہ وقوف عرفات کے بغیر حج کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی عاقل اس کا یہ مطلب نہیں لے گا کہ حج کی پوری حقیقت بس وقوف عرفہ ہے، اس کے لئے نہ احرام کی ضرورت، نہ دوسرے مناسک کی۔

اسی طرح "الوتر ركعة من آخر الليل" کا مطلب یہ ہے کہ باقی کی نماز کے

ساتھ جب تک ایک رکعت کو نہ ملایا جائے، وتر کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی، یہ مطلب نہیں کہ پوری حقیقت ہی بس ایک رکعت ہے، اسی کو یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَاِذَا خَشِيَ اَحَدُكُمُ الصُّبْحَ، صَلّٰى رَكْعَةً وَّاحِدَةً تُوْتِرُ لَهٗ مَا قَدْ صَلّٰى۔"

(موطا مالک ص:۱۰۴)

ترجمہ:... "رات کی نماز دو دو رکعت ہے، پس جب تم میں سے کسی کو صبح کے طلوع کا اندیشہ لاحق ہو جائے، تو ایک رکعت اور پڑھ لے جو اس کی پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دے گی۔"

اس کا واضح مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ دو دو رکعت پڑھتا جائے، جب صبح کے طلوع کا اندیشہ ہو تو آخری دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت اور ملا لے، جس سے اس کی نماز وتر بن جائے گی، جہاں تک نمازِ وتر کی پوری حقیقت کا تعلق ہے، وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی حدیث میں یوں بیان فرمائی گئی ہے:

"صَلٰوةُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ النَّهَارِ فَاَوْتِرُوْا صَلٰوةَ اللَّيْلِ۔"

ترجمہ:... "مغرب کی نماز دن کے وتر ہیں، پس رات کی نماز کو وتر بنایا کرو۔"

یہ حدیث پہلے با حوالہ گزر چکی ہے، اور میں وہاں بتا چکا ہوں کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک نمازِ وتر کا ٹھیک وہی تصور ہے جو نمازِ مغرب کا ہے۔

اور پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث خطبے کے دوران برسرِ منبر ارشاد فرمائی تھی، جیسا کہ صحیح بخاری (ج:۱ ص:۶۸) "باب الحلق والجلوس فی المسجد" میں اس کی تصریح ہے، اس کے باوجود جمہور صحابہ و تابعین ایک رکعت وتر کے قائل نہیں تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کا یہ مطلب ہوتا کہ وتر کی بس ایک ہی رکعت ہوتی ہے، یا ایک رکعت وتر بھی جائز ہے تو ان تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو غلط فہمی نہیں ہوسکتی تھی، سامعین میں سے دو چار اگر مطلب نہ سمجھیں تو

besturdubooks.wordpress.com

جانے تعجب نہیں، لیکن جماہیر حنفیہ کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ انہوں نے مطلب نہیں سمجھا ہوگا، یا انہیں یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی، قطعاً صحیح نہیں، اس سے اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ ارشادِ نبوی کا منشا وہی ہے جو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا۔

اور یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ خود راویٔ حدیث ابنِ عمر رضی اللہ عنہما بھی تین ہی وتر کے قائل تھے، چنانچہ احادیث میں نمبر:۱۲ پر ان کی حدیث نقل کرچکا ہوں، اور ارشاداتِ نبویہ میں نمبر:۳ پر بھی ان کی مرفوع روایت گزرچکی ہے، جسے امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا (لاہور مطبوعہ ص:۴۰۰) میں موقوفاً نقل کیا ہے:

"اَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُوْلُ:
صَلٰوةُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ صَلٰوةِ النَّهَارِ۔" (مؤطا مالک ص:۴۰)۔

ترجمہ:... "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ:
نمازِ مغرب دن کے وتر ہیں۔"

حدیث ابی ایوب انصاری رضی اللہ عنہ:

نسائی (ج:۱ ص:۲۴۹)، ابوداؤد (ج:۱ ص:۲۰۰)، ابنِ ماجہ (ص:۸۳) وغیرہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْوِتْرُ حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ، فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّوْتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيُوْتِرْ، وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّوْتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّوْتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ۔"

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وتر واجب ہے ہر مسلمان پر، پس جو شخص پانچ وتر پڑھنا چاہے پڑھے، اور جو تین وتر پڑھنا چاہے پڑھے، اور جو ایک وتر پڑھنا چاہے پڑھے۔"

حضرت شافعیہ اور جو حضرات ایک وتر کے جواز کے قائل ہیں، ان کی آخری دلیل یہ روایت ان کی صریح دلیل بن سکتی تھی، مگر اس میں چند وجہ سے کلام ہے۔

اوّل: یہ کہ اس میں کلام ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے؟ حافظ رحمہ اللہ "التلخیص الحبیر" (ج:۲ ص:۱۳) میں لکھتے ہیں:

"وصحح أبو حاتم والذهلي والدارقطني في العلل والبيهقي وغير واحد وقفه وهو الصواب."

ترجمہ: "ابوحاتم، ذہلی، دارقطنی علل میں، بیہقی اور بہت سے حضرات نے اس کو موقوف صحیح کہا ہے، اور یہی درست ہے۔"

یعنی صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے، حدیث مرفوع کی حیثیت سے صحیح نہیں۔

دوم: یہ کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دارقطنی نے اس طرح نقل کی ہے:

"الوتر حق واجب فمن شاء فليوتر بثلاث."

ترجمہ: "وتر حق واجب ہے، پس جو چاہے تین وتر پڑھ لیا کرے۔"

حافظ رحمہ اللہ "التلخیص الحبیر" (ج:۲ ص:۱۳) میں اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں: "ورجاله ثقات" اس طرح حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک رکعت وتر کا اضافہ محل نظر ہو جاتا ہے۔

سوم: اور نسائی (ج:۱ ص:۲۴۹) کی ایک روایت میں سات اور پانچ کے عدد کے بعد یہ الفاظ ہیں:

"ومن شاء أوتر بواحدة ومن شاء أومى إيماء."

ترجمہ: "اور جو چاہے ایک وتر پڑھ لیا کرے، اور جو چاہے اشارہ کر لیا کرے۔"

اس روایت کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے تو ایک وتر بھی حذف ہو جاتا ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اور اشارے پر کفایت کرنے کا جواز نکل آتا ہے، تو اسی قرینے سے ایک رکعت کا جواز بھی معذور کے لئے ہوگا کہ جو شخص تین رکعت پر قادر نہ ہو وہ ایک ہی وتر پڑھ لیا کرے۔ الغرض اول تو یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ پھر اس میں اضطراب ہے، بعض روایتوں میں پانچ، تین اور ایک کا ذکر ہے، بعض میں صرف تین کا، اور بعض میں اشارے تک کی گنجائش دی گئی ہے، ایسی صورت میں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایک رکعت کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔

آخری بات:

تعدادِ وتر کا مسئلہ، اختصار کی پوری کوشش کے باوجود طویل ہوگیا، آخر میں اتنا مزید سن لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محض ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں، حافظ رحمہ اللہ نے "تلخیص" میں امام رافعی کے حوالے سے حافظ ابن الصلاح کا قول نقل کیا ہے:

"لا نعلم فی روایات الوتر مع کثرتہا انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اوتر بواحدۃ فحسب۔" (ج۲ ص:۱۵)

ترجمہ:... "وتر کی روایات کی کثرت کے باوجود ہمیں معلوم نہیں کہ کسی روایت میں یہ آتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صرف ایک رکعت وتر پڑھی ہو۔"

حافظ رحمہ اللہ نے ابن صلاحؒ کے اس قول پر استدراک کرتے ہوئے ابن حبانؒ کے حوالے سے کریب عن ابن عباسؓ کی روایت پیش کی ہے کہ:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوتر برکعۃ۔"

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھے۔"

لیکن میں اوپر حدیث "کریب عن ابن عباسؓ" کی روایت کے ذیل میں بتا چکا ہوں کہ کریبؒ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی شانہ نبوت میں شب گزاری کے راوی ہیں، اور کریب کی تمام روایات اسی قصے کی حکایت ہیں، اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

besturdubooks.wordpress.com

تین ہی وتر پڑھتے تھے، جیسا کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے متعدد حضرات کی صحیح روایات (ج:۲ ص:۱۲۷، ۱۲۸ طبع) موجود ہیں، اور خود کریبؒ کی صحیح روایت (ج:۲ ص:۱۹۹) بھی ذکر کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہی وتر پڑھے تھے، اس لئے حافظ رحمہ اللہ نے ابنِ حبانؒ کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے، وہ بھی اسی پر محمول ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت کو پہلی سے دوگانے کے ساتھ ملاکر تین وتر پڑھے، واللہ اعلم!

الغرض پورے ذخیرۂ احادیث میں اس کا ثبوت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک رکعت وتر پر اکتفا فرمایا ہو، اور جس کسی روایت سے ایسا وہم ہوتا ہے، دیگر متواتر روایات سے اس وہم کا ازالہ ہوجاتا ہے، البتہ اس سے انکار نہیں کہ بعض صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) ایک رکعت وتر کے بھی قائل تھے، بلاشبہ یہ حضرات اپنے اجتہاد کی بنا پر معذور ہیں۔ جس طرح قریب قریب ہر فقہی باب میں بعض شاذ آرا بھی ہوتی ہیں، اسی طرح اس مسئلے میں یہ رائے بھی شاذ ہے، جادۂ مستقیم وہی ہے جس پر صحابہ و تابعین (علیہم الرضوان) کی اکثریت ہے جو قائل تھی کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں۔ اس کی تفصیل گزرچکی ہے، تاہم مناسب ہے کہ اس سلسلے میں مزید ایک بات عرض کردی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے تراویح کی باقاعدہ جماعت کا اہتمام شروع ہوا، موطا امام مالکؒ (ص:۴۰) میں اس سلسلے میں دو روایتیں نقل کی ہیں، ایک گیارہ رکعات کی، اور دوسری ۲۳ رکعات کی، علامہ قسطلانیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

”وَجَمَعَ الْبَیْہَقِیُّ بَیْنَہُمَا بِأَنَّہُمْ کَانُوْا یَقُوْمُوْنَ بِإِحْدٰی عَشَرَۃَ، ثُمَّ قَامُوْا بِعِشْرِیْنَ وَأَوْتَرُوْا بِثَلَاثٍ، وَقَدْ عَدُّوْا مَا وَقَعَ فِیْ زَمَنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَالْإِجْمَاعِ۔“

(ارشاد الساری ج:۳ ص:۲۲۶)

ترجمہ: ”امام بیہقی رحمہ اللہ نے ان کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلے گیارہ رکعتوں کے ساتھ قیام کرتے تھے، پھر بیس تراویح اور تین وتر کے ساتھ، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں

besturdubooks.wordpress.com

صحابہؓ کا جو تعامل رہا اس کو علماء نے بمنزلہ اجماع کے شمار کیا ہے۔"

اور حافظ موفق ابن قدامہ رحمہ اللہ "المغنی" (ج:۲ ص:۱۶۷) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس آثار کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

"وعن علی انہ امر رجلا یصلی بھم فی رمضان عشرین رکعۃ وھذا کالاجماع۔" (ج:۱ ص:۷۹۹)

ترجمہ:... "اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو رمضان میں بیس تراویح پڑھانے کا حکم فرمایا اور یہ بمنزلہ اجماع کے ہے۔"

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تعامل کو "کالاجماع" تصوّر کرتے ہوئے ائمہ اربعہ تراویح کی بیس رکعات پر متفق ہیں، (اور ائمہ اربعہ کا کسی مسئلے پر اتفاق بجائے خود اجماع کی دلیل ہے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے "الانصاف" میں تحریر فرمایا ہے)۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جہاں تراویح کی بیس رکعت پر "کالاجماع" ہوا، وہاں وتر کی تین رکعت پر بھی یہی "کالاجماع" ہوا، اور جو حضرات نہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اجماعی تعامل کو لائقِ التفات سمجھتے ہیں، نہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے اتفاق کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں، بلکہ تراویح کی آٹھ ہی رکعتوں کے قائل ہیں، وہ صحاح کی اس حدیث پر اعتماد کرتے ہیں جسے پہلے نقل کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول رمضان و غیر رمضان میں گیارہ رکعات کا تھا، آٹھ تراویح اور تین وتر، گویا وتر یہاں بھی بطور دائمی معمول کے تین ہی نکلے، اور یہ حضرات بھی کم از کم وتر کے مسئلے میں تو ہمارے ساتھ متفق ہوگئے، فلہ الحمد علی الوفاق و حبذا الاتفاق۔ وللہ الحمد!

دُوسرا مسئلہ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ:

وتر کی دو رکعتوں پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا ضروری ہے، اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

اوّل:... شریعت نے ہر نماز میں دو رکعت پر قعدہ لازم قرار دیا ہے، چنانچہ ...

besturdubooks.wordpress.com

لیکن صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"وَكَانَ يَقُولُ: فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّة."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۹۴)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے

کہ ہر دو رکعت پر التحیات ہے۔"

اور ترمذی (ج:۱ ص:۵۰) میں حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

"قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

الصَّلٰوةُ مَثْنٰى مَثْنٰى، تَشَهَّدُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ. الحديث."

ترجمہ:... "نماز دو دو رکعت ہوتی ہے، ہر دو رکعت میں

تشہد ہے۔"

اس مضمون کی اور بھی متعدد احادیث ہیں، اختصار کے پیش نظر ان کو ذکر نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میں ہر دو رکعت پر قعدہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک فرض، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک واجب، اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک سنت ہے، مذاہب کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہر دو رکعت پر قعدے کا واجب ہونا متفق علیہ قول ہے۔

الغرض جب شریعت نے نماز کے لئے ایک اُصول اور ضابطہ مقرر کردیا کہ اس کی ہر دو رکعت پر قعدہ ہے، خواہ نماز فرض ہو یا نفل، سنت ہو یا واجب، تو نمازِ وتر کو بھی اسی قاعدے کے تحت رکھا جائے گا۔

دوم:... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث:

"صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى."

ترجمہ:... "رات کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے۔"

جس میں صلوٰۃ اللیل اور وتر ہی کے بارے میں ارشاد فرمائی گئی ہے، جیسا کہ اوپر معلوم ہوچکا ہے۔ ارشادِ نبوی: "رات کی نماز دو دو رکعت ہے" میں دو مسئلوں پر تنبیہ فرمائی گئی ہے، ایک یہ کہ نماز کا کم سے کم نصاب دو رکعت ہے، اس سے کم نماز نہیں، یہی وجہ ہے کہ فرائض و نوافل

besturdubooks.wordpress.com

میں کہیں کوئی نماز ایسی نہیں ملتی، جس میں شریعت نے ایک رکعت کو جز رکھا ہو اور اسے نماز قرار دیا ہو، ظاہر ہے کہ وتر کی نماز بھی اسی ضابطے کے تحت آئے گی اور محض ایک رکعت وتر نہیں کہلائے گی۔ دوسرا ضابطہ یہ کہ نماز کی ہر دو رکعت پر التحیات بیٹھنا ضروری ہے، ورنہ اس کے بغیر دوگانہ کا وجود ہی متحقق نہیں ہو سکتا، چنانچہ صحیح مسلم (ج:۱ ص:۲۵۷) میں اس روایت میں یہ اضافہ ہے:

"فَقِيْلَ لِابْنِ عُمَرَ: مَا مَثْنَى مَثْنَى؟ قَالَ: أَنْ تُسَلِّمَ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ۔"

ترجمہ:... "ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ دو دو رکعت کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: یہ کہ تم ہر دو رکعت پر سلام کہو۔"

یہاں سلام کہنے سے مراد تحیات ہے، جیسا کہ حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ذکر کیا جاچکا ہے: "ہر دو رکعت پر التحیات ہے"۔ نیز طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ تَشَهُّدٌ وَتَسْلِيْمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلَى مَنْ تَبِعَهُمْ مِنْ عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِيْنَ۔" [وفیہ عثمان بن زید و ضعفہ الی بلاحمد ... وقد وثق، مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۳۹]

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہر دو رکعت پر تشہد ہے، اور رسولوں پر اور ان کی پیروی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام ہے۔"

بالغرض متعدد احادیث میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے کہ نماز کی ہر دو رکعت پر تشہد کیا جائے، اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صلوٰۃ اللیل اور وتر ہی کے بارے میں ہے، اس میں اسی ضابطے کی نشاندہی کی گئی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ نماز وتر میں دو رکعت پر تشہد کو واجب نہ کہا جائے۔

besturdubooks.wordpress.com

سوم:... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر حضرات کی جن روایت میں یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ، سات، نو وتر پڑھا کرتے تھے، ان کی تشریح پہلے گزر چکی ہے کہ ان میں صلوٰۃ اللیل اور وتر کے مجموعے پر "وتر" کا اطلاق کر دیا گیا، ورنہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر تین رکعت ہوتے تھے، اور جیسا کہ سعد بن ہشام کی روایت میں گزر چکا ہے کہ ان کی دو رکعتوں پر تشہد بھی پڑھا کرتے تھے، مگر سلام نہیں پھیرتے تھے، یعنی یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔

چہارم:... شریعت میں ایسی کوئی نماز نہیں جس میں صرف ایک رکعت کو جائز رکھا گیا ہو، یا جس میں کئی دوگانوں کو بغیر تشہد کے جمع کیا گیا ہو۔ جو حضرات فی زمانہ شریعت کے اس قاعدے کو توڑتے ہیں اور راویوں کی تعبیرات سے غلط فہمی میں مبتلا ہوکر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر کی پانچ سات یا نو رکعتیں ایک ہی سلام اور ایک ہی قعدے سے جائز ہیں، کیا صحیح ہوگا کہ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث:

"صَلَّیْتُ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَمَانِیًا جَمِیْعًا وَّسَبْعًا جَمِیْعًا۔"

ترجمہ:... "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (ظہر و عصر کی) آٹھ رکعتیں اور (مغرب و عشاء کی) سات رکعتیں اکٹھی پڑھی ہیں۔"

کے پیشِ نظر یہ فتویٰ بھی دے ڈالیں کہ ظہر و عصر کی آٹھ اور مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ جائز ہیں؟ اور جو بزرگ حدیث "اَلْوِتْرُ رَکْعَۃٌ مِّنْ اٰخِرِ اللَّیْلِ" کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت بھی جائز ہے، کیا یہ صحیح ہوگا کہ وہ "اَلْحَجُّ عَرَفَۃٌ" کی حدیث سے یہ فتویٰ بھی دیا کریں کہ صرف وقوفِ عرفہ سے حج ہوجاتا ہے، باقی سے لئے اور ارکان و مناسک کی ضرورت نہیں...؟ لیکن اگر ان تعبیرات سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی، کیونکہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کا ضابطہ معلوم ہے، اسی طرح حج کے ارکان و مناسک بھی معلوم ہیں، تو اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ متواتر احادیث سے نماز

besturdubooks.wordpress.com

وتر کا ضابطہ بھی معلوم ہے کہ اس کی تین رکعتیں ہیں، راویوں کی باقی تعبیرات کو اسی ضابطے پر منطبق کیا جائے گا، یہ نہیں کہ ایک راوی کی تعبیر کو ایک مستقل اصول بنا کر اس کے لئے متواتر ضابطے کو توڑ دیا جائے...!

تیسرا مسئلہ:... قنوتِ وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین:

اس مسئلے میں چند امور قابلِ ذکر ہیں:

اوّل:... اس میں اختلاف ہوا ہے کہ قنوت صرف وتر میں پڑھی جائے یا نمازِ فجر میں بھی، اور رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا رکوع کے بعد؟ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ قنوتِ وتر ہمیشہ ہے، اور رکوع سے پہلے ہے، اور قنوتِ نازلہ جو نمازِ فجر میں خاص حوادث کے موقع پر پڑھی جاتی ہے، رکوع کے بعد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رکوع سے قبل اور بعد قنوت پڑھنے کی جو روایات مروی ہیں، حنفیہ کے نزدیک ان کے درمیان یہی تطبیق ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۳۶) "باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"حَدَّثَنَا عَاصِمٌ قَالَ: سَأَلْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ الْقُنُوْتِ فَقَالَ: قَدْ كَانَ الْقُنُوْتُ. قُلْتُ: قَبْلَ الرُّكُوْعِ أَوْ بَعْدَهُ؟ قَالَ: قَبْلَهُ، قُلْتُ: فَإِنَّ فُلَانًا أَخْبَرَنِيْ عَنْكَ أَنَّكَ قُلْتَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ! فَقَالَ: كَذَبَ، إِنَّمَا قَنَتَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا. الحديث."

ترجمہ:... "عاصم احولؒ کہتے ہیں: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے بارے میں پوچھا، انہوں نے فرمایا: قنوت ہوتی تھی۔ میں نے کہا: رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ فرمایا: رکوع سے پہلے۔ میں نے کہا کہ: فلاں شخص نے مجھے بتایا کہ آپ فرماتے ہیں کہ رکوع کے بعد قنوت ہے! فرمایا: اس نے غلط کہا

besturdubooks.wordpress.com

ہے رکوع کے بعد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مہینے قنوت پڑھی تھی۔"

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت میں ہے:

"اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَنَتَ حَتّٰی مَاتَ، وَاَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ حَتّٰی مَاتَ، وَعُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ حَتّٰی مَاتَ۔" (رواہ البزار ورجالہ موثقون مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۳۹)

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوگیا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ ان کا وصال ہوگیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ ان کا وصال ہوگیا۔"

بظاہر اس روایت میں قنوت سے قنوتِ وتر مراد ہے، کیونکہ قنوتِ فجر پر دوام ثابت نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت کے علاوہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے، اس لئے مسندِ احمد اور بزار کی روایت کے یہ الفاظ کہ:

"مَا زَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْنُتُ فِیْ صَلٰوۃِ الْغَدَاۃِ حَتّٰی فَارَقَ الدُّنْیَا۔" (طحاوی ج:۱ ص:۱۴۳)

ترجمہ:... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فجر میں قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔"

اس میں اگر "فی الفجر" کے الفاظ راوی کا سہو نہیں تو قنوتِ نازلہ پر محمول ہے۔ بہرحال متعدد احادیث کی بنا پر حنفیہ کی تحقیق یہ ہے کہ قنوتِ نازلہ جو فجر کی نماز میں (اور بعض اوقات دوسری نمازوں میں بھی) پڑھی جاتی تھی، وہ رکوع کے بعد ہوتی تھی، اور وہ خاص حوادث کے موقع پر پڑھی جاتی تھی، لیکن وتر میں قنوت ہمیشہ تھی اور وہ رکوع سے پہلے ہوتی تھی۔

دوم:... جو حضرات رکوع سے قبل قنوت کے قائل ہیں، ان کے نزدیک قراءت اور قنوت کے درمیان فصل کرنے کے لئے قنوت کے لئے تکبیر کہنا سنت ہے، امام طحاوی

رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وأما التكبير في القنوت في الوتر فإنها تكبيرة زائدة في تلك الصلوٰة وقد أجمع الذين يقنتون قبل الركوع على الرفع معها۔" (طحاوی ج:۱ ص:۳۳۲)

ترجمہ:... "لیکن قنوتِ وتر کی تکبیر، اس نماز میں ایک زائد تکبیر ہے، اور جو حضرات قبل الرکوع کے قائل ہیں، ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی ہوتا ہے۔"

سوم:... قنوتِ وتر قبل الرکوع متعدد احادیث سے ثابت ہے:

۱:... "عن أبي بن كعب رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يوتر بثلاث ركعات ... ويقنت قبل الركوع۔" (نسائی ج:۱ ص:۲۴۸)

ترجمہ:... "حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعات وتر پڑھتے تھے، اور رکوع سے قبل قنوت پڑھتے تھے۔"

ابن ماجہ (ص:۸۴) کی روایت میں ہے:

"كان يوتر فيقنت قبل الركوع۔"

ترجمہ:... "آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر پڑھتے تھے تو قنوت رکوع سے قبل پڑھتے تھے۔"

۲:... "عن ابن مسعود رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قنت في الوتر قبل الركوع۔"

(قال الدارقطني: وأبان بن أبي عياش متروك. قلت: ورواه الخطيب في كتاب القنوت من غير طريق أبان بن أبي عياش، وذكره ابن الجوزي في "التحقيق" من جهة الخطيب وسكت عنه، إلا أنه قال: أحاديثنا قليلة، كذا في نصب الراية ج:۲ ص:۱۲۳. وقال الترمذي في العلل ج:۲ ص:۱۲۴۳: وقد روى عنه

ہے کہ میں ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا، پس آپ رات کو اٹھے، اپنی دو رکعتیں پڑھیں، پھر اٹھ کر وتر پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی، پھر رکوع اور سجدہ کیا، پھر دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ اور قل یا ایہا الکافرون پڑھی، پھر رکوع کیا اور سجدہ کیا، اور تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھی، پھر قنوت پڑھی، پھر رکوع کیا۔"

۵:... "عَنِ الْأَسْوَدِ قَالَ: صَحِبْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سِتَّةَ أَشْهُرٍ، فَكَانَ يَقْنُتُ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ" (کتاب الحجۃ ج:۱ ص:۲۰۱)

ترجمہ:... "حضرت اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: چھ مہینے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہا، وہ وتر کی نماز میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔"

۶:... "عَنِ الْأَسْوَدِ أَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَانَ لَا يَقْنُتُ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الصَّلَوٰتِ إِلَّا فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ" (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۰۲، کتاب الحجۃ امام محمد ج:۱ ص:۲۰۱، مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۴۴)

ترجمہ:... "حضرت اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کے سوا کسی نماز میں قنوت نہیں پڑھتے تھے، وتر میں رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔"

۷:... "عَنْ عَلْقَمَةَ أَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ وَأَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (وَرَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ) كَانُوْا يَقْنُتُوْنَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ" (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۰۲)

ترجمہ:... "حضرت علقمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔"

ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا الأمر عندنا" (ج: ۲ ص: ۳۰۲) یعنی ہمارے نزدیک وتر میں رکوع سے قبل ہی قنوت صحیح ہے۔

چہارم:... جہاں تک قنوتِ وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین کا تعلق ہے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل روایات ہیں:

ا:... "عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْنُتُ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ. قَالَ: ثُمَّ أَرْسَلْتُ أُمِّيْ أُمَّ عَبْدٍ فَبَاتَتْ عِنْدَ نِسَائِهِ، فَأَخْبَرَتْنِيْ أَنَّهُ قَنَتَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ."

(ابن ابی شیبہ ج: ۲ ص: ۳۰۲)

"وَفِي الْاِسْتِيْعَابِ لِابْنِ عَبْدِالْبَرِّ: أُمُّ عَبْدٍ: أُمُّ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ، رَوَى عَنْهَا ابْنُهَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ أَنَّهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ. وَيُعْرَفُ أَيْضًا بِهَا حَدِيْثُ أُمِّ ابْنِ مَسْعُوْدٍ يَرْوِيْهِ حَفْصُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ أَبَانَ بْنِ أَبِيْ عَيَّاشٍ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ النَّخَعِيِّ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: أَرْسَلْتُ أُمِّيْ لَيْلَةً لِتَبِيْتَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَنْظُرَ كَيْفَ يُوْتِرُ. فَبَاتَتْ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّى مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يُصَلِّيَ، حَتّٰى إِذَا كَانَ آخِرُ اللَّيْلِ وَأَرَادَ الْوِتْرَ قَرَأَ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى فِي الرَّكْعَةِ الْأُوْلٰى، وَقَرَأَ فِي الثَّانِيَةِ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ ثُمَّ قَعَدَ، ثُمَّ قَامَ وَلَمْ يَفْصِلْ بَيْنَهُمَا بِالسَّلَامِ، ثُمَّ قَرَأَ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ، حَتّٰى

الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ، وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ حتّٰی
اِذَا فَرَغَ کَبَّرَ، ثُمَّ قَنَتَ فَدَعَا بِمَا شَاءَ اللہُ اَنْ یَدْعُوَہٗ ثُمَّ
کَبَّرَ وَرَکَعَ۔" (استیعاب ج:۴ ص:۴۵۰، ۴۵۱ برحاشیہ اصابہ)

ترجمہ:... "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع سے قبل قنوت پڑھا کرتے
تھے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: پھر میں نے اپنی والدہ
اُمِّ عبد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیجا، وہ امہات المؤمنین
کے پاس رات رہیں، پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے رکوع سے پہلے قنوت پڑھی۔"

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ "الاستیعاب" میں لکھتے ہیں:
"اُمِّ عبد، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں، ان سے ان کے
صاحب زادے حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ: میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے دیکھا ہے۔
اور ان کی نسبت وہ حدیث معروف ہے جسے حفص بن سلیمان، ابان
بن ابی عیاش سے، وہ ابراہیم نخعی سے، وہ علقمہ سے، وہ عبداللہ بن
مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں نے اپنی والدہ کو
بھیجا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رات رہیں، اور
دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کس طرح پڑھتے ہیں؟
چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں رات رہیں، پس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات میں... جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور
تھا... نماز پڑھی، جب رات کا آخری حصہ ہوا اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے وتر پڑھنے کا ارادہ فرمایا تو پہلی رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ
رَبِّکَ الْاَعْلٰی" اور دوسری رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ"

besturdubooks.wordpress.com

پڑھی، پھر قعدہ کیا، پھر سلام پھیرے بغیر کھڑے ہوگئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری رکعت میں "قل ھو اللہ احد" پڑھی، یہاں تک کہ جب اس سے فارغ ہوئے تو تکبیر کہی، پھر دعائے قنوت پڑھی، اور جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا دعا کی، پھر تکبیر کہی اور رکوع کیا۔"

۲:... "عن الأسود قال عن عبداللہ رضي اللہ عنه كان يرفع يديه اذا قنت في الوتر" (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۰۷، ۳۰۸)

ترجمہ:... "حضرت اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قنوتِ وتر کے لئے رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

۳:... "وفي جزء رفع اليدين انه كان يقرأ في آخر ركعة من الوتر قل هو الله احد، ثم يرفع يديه فيقنت قبل الركعة."

ترجمہ:... "امام بخاری کے رسالہ "رفع الیدین" (ص:۲۲) میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کی آخری رکعت میں "قل ھو اللہ احد" پڑھا کرتے تھے، پھر رفع یدین کرتے، پھر رکوع سے قبل قنوت پڑھتے۔"

۴:... "عن ابي عثمان كان عمر رضي الله عنه يرفع يديه في القنوت." (جزء رفع الیدین ص:۲۸)

ترجمہ:... "ابو عثمان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قنوت میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

۵:... "محمد قال: اخبرنا ابو حنيفة عن حماد عن ابراهيم ان القنوت في الوتر واجب في شهر رمضان وغيره قبل الركوع، واذا اردت ان تقنت فكبر، واذا اردت ان تركع فكبر ايضا." (کتاب الآثار ص:۱۴۶، جامع المسانید ج:۱ ص:۴۰۰)

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ:... ''امام محمد رحمہ اللہ کتاب الآثار اور کتاب الحجۃ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے، وہ حماد سے، وہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ وتر میں قنوت واجب ہے، رمضان المبارک میں بھی اور غیر رمضان میں بھی، اور جب تم قنوت پڑھنا چاہو تو تکبیر کہو، اور جب قنوت کے بعد رکوع کرنا چاہو تب بھی تکبیر کہو۔''

امام محمد رحمہ اللہ کتاب الآثار میں اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں:

''قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٖ نَأْخُذُ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي التَّكْبِيْرَةِ الْأُوْلٰى قَبْلَ الْقُنُوْتِ كَمَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي افْتِتَاحِ الصَّلٰوةِ، ثُمَّ يَضَعُهُمَا وَيَدْعُوْ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ۔''

(کتاب الآثار)

ترجمہ:... ''ہمارا عمل اسی کے مطابق ہے کہ قنوت سے پہلے کی تکبیر میں رفع یدین کرے، جیسا کہ نماز کے شروع میں کیا جاتا ہے، پھر ہاتھوں کو رکھ لے، اور دعائے قنوت پڑھے، یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔''

چوتھا مسئلہ:... دُعائے قنوت میں ہاتھ باندھنا:

قنوتِ وتر میں عقلاً تین صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ قنوت کے دوران ہاتھ اُٹھائے رکھیں، جیسا دُعا میں اُٹھائے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ہاتھوں کو چھوڑ دیا جائے، جیسے کہ قومہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ رفع یدین کے بعد ہاتھوں کو دوبارہ باندھ لیا جائے، جیسے کہ قیام کی حالت میں ہوتا ہے۔ پہلی صورت احناف کے نزدیک پسندیدہ نہیں، اس لئے کہ شریعت نے نماز میں جتنی دُعائیں رکھی ہیں، کہیں ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا، باوجودیکہ ہاتھ اُٹھانا دُعا کے آداب میں سے ہے، مگر عین نماز میں ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنے کا حکم نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کو بدعت فرماتے تھے:

''عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَرَأَيْتُمْ

قیامکم عند فراغ الامام من السورۃ ھذا القنوت، واللہ! إنہ لبدعۃ، ما فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر شھر ثم ترکہ، أرأیتم رفعکم أیدیکم فی الصلوۃ، واللہ! إنہ لبدعۃ، ما زاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ھذا قط، فرفع یدیہ حیال منکبیہ۔" (رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ بشر بن حرب، ضعفہ أحمد وابن معین وأبو زرعۃ وأبو حاتم والنسائی، ووثقہ أیوب وابن عدی۔ مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۳۷)

ترجمہ... "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: دیکھو! یہ جو تم نمازِ فجر میں امام کے سورۃ سے فارغ ہونے کے بعد قنوت کے لئے کھڑے ہوجاتے ہو، اللہ تعالیٰ کی قسم! یہ بدعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک مہینے سے زیادہ نہیں کیا، پھر اسے ترک کردیا۔ اور دیکھو! یہ جو تم نماز میں ہاتھ اُٹھاکر قنوت پڑھتے ہو، اللہ کی قسم! یہ بدعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف کندھوں تک رفع یدین کرتے تھے۔"

بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ قنوت کے لئے رفع یدین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مگر نماز کے دوران اس طرح ہاتھ اُٹھاکر دُعا کرنا، جس طرح نماز سے باہر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے جاتے ہیں، یہ معمول نہیں تھا۔

رہی دُوسری اور تیسری صورت، قنوت اگر رُکوع سے پہلے پڑھی جائے جیسا کہ وتر میں پڑھی جاتی ہے، تو قبل الرُکوع کی حالت چونکہ قیام کی حالت ہے، اور قیام میں ہاتھ باندھنا سنت ہے، اس لئے نمازِ وتر میں اس کو اختیار کیا جائے، اور قنوتِ نازلہ چونکہ رُکوع کے بعد قومہ کی حالت میں پڑھی جاتی ہے، اور قومہ میں ہاتھ باندھنا سنت نہیں، اس لئے قنوت ہاتھ چھوڑ کر پڑھی جانے کی یہ وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک قنوتِ وتر معمول قیام کے مطابق ہاتھ باندھ کر پڑھی جاتی ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

سوال نہم:... نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ:

"سوال:... نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ حدیثِ نبوی سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو دلیل تحریر فرمادیں، جبکہ حدیثِ مبارک کا مفہوم ہے کہ: سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔"

جواب:... یہاں چند امور قابلِ ذکر ہیں:

اوّل:... نمازِ جنازہ کو "نماز" کہنا مجاز ہے، کیونکہ اس میں نماز کی شرائط، سترِ عورت اور استقبالِ قبلہ وغیرہ کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے نماز نہیں، بلکہ ایک مخصوص طریقے سے میت کے لئے دُعا و استغفار ہے، حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ "زاد المعاد" میں لکھتے ہیں:

"وَمَقْصُوْدُ الصَّلٰوةِ عَلَى الْجَنَازَةِ هُوَ الدُّعَاءُ لِلْمَيِّتِ، وَلِذٰلِكَ حُفِظَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنُقِلَ عَنْهُ مَا لَمْ يُنْقَلْ مِنْ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ وَالصَّلٰوةِ عَلَيْهِ، صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (ج:۱ ص:۵۰۵)

ترجمہ:... "نمازِ جنازہ سے مقصود میت کے لئے دُعا کرنا ہے، اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازے کی دُعائیں اس کثرت کے ساتھ نقل کی گئی ہیں کہ فاتحہ یا درود شریف کا پڑھنا اس طرح نقل نہیں کیا گیا۔"

دوم:... چونکہ نمازِ جنازہ اپنی اصل کے اعتبار سے دُعا ہے، اور دُعا کے آداب میں سے ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا جائے، اس لئے نمازِ جنازہ میں بھی یہی ترتیب رکھی گئی ہے کہ اس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی ہے، پھر درود شریف ہوتا ہے، اور پھر میت کے لئے دُعا ہوتی ہے۔

سوم:... کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہو، حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ویذکر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ امر ان یقرأ علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب ولا یصح اسنادہ۔"

(ج: ص:۲۰۳)

ترجمہ:... "اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ میں قراءتِ فاتحہ کا حکم فرمایا، مگر اس کی سند صحیح نہیں۔"

چہارم:... نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی سب سے صحیح حدیث وہ ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب قراءۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ" (ج:۱ ص:۱۷۸) میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے:

"عن طلحۃ بن عبداللہ بن عوف قال صلیت خلف ابن عباس علی جنازۃ فقرأ فاتحۃ الکتاب وقال لتعلموا انھا سنۃ۔"

ترجمہ:... "طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں جنازے کی نماز پڑھی، تو انہوں نے بلند آواز سے سورۂ فاتحہ پڑھی، اور فرمایا کہ میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے۔"

اور نسائی (ج:۱ ص:۲۸۱) میں بسندِ صحیح اس روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"فقرأ بفاتحۃ الکتاب وسورۃ وجھر حتی اسمعنا، فلما فرغ اخذت بیدہ فسألتہ فقال: سنۃ وحق۔"

ترجمہ:... "انہوں نے سورۂ فاتحہ اور ایک سورۃ بلند آواز سے پڑھی کہ ہمیں سنائی، پس جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے ان کا

ہاتھ پکڑ کر ان سے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ سنت اور حق ہے۔"

اس روایت میں ایک امر تو قابلِ غور یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں کیا گیا تھا، یا بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں؟ اگر بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں سوال تھا تو جواب میں سنت اور حق بھی جہر ہی کو فرمایا گیا ہوگا، مگر جہر (یعنی بلند آواز سے پڑھنا) عام علماء کے نزدیک سنت نہیں۔

اگر آپ سے سوال سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں تھا، تو اس سوال سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ عام طور پر عادت نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی نہیں تھی، چونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خلافِ معمول کیا، اس لئے ان سے سوال کیا گیا، اور جواب میں جو اس کو سنت فرمادیا گیا، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سورۂ فاتحہ کا بہ نیتِ ثنا پڑھنا بھی جائز ہے، اور یہی بعض حنفیہ کا مذہب ہے۔

دوسرا امر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صرف سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، بلکہ اس کے ساتھ ایک اور سورۃ بھی پڑھی، مگر نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنے کا کوئی بھی قائل نہیں، اگر اس حدیث سے حنفیہ پر ترکِ سنت کا الزام عائد کیا جائے تو یہی الزام اس حدیث سے دوسروں پر عائد ہوگا، حالانکہ یہ حدیث حنفیہ کے خلاف نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک حمد و ثنا کے طور پر سورۂ فاتحہ اور دیگر ایسی آیات جو حمد و ثنا پر مشتمل ہوں، پڑھنا جائز ہے۔

ج…… یہ غلط ہے کہ حنفیہ سورۂ فاتحہ کے قائل نہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض حضرات سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، اور بعض نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ فرض و واجب نہیں، البتہ حق تعالیٰ شانہ کی حمد و ثنا کے طور پر سورۂ فاتحہ پڑھ لینا بھی درست ہے، مگر جس طرح نماز میں قراءت ہوا کرتی ہے، نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ یا کوئی اور سورۃ قراءت کی نیت سے نہیں پڑھی جاتی، اس لئے کوئی روایت بھی حنفیہ کے خلاف نہیں، چنانچہ امام محمد صاحبؒ نے مؤطا میں یہ روایت نقل کی ہے:

"اخبرنا مالک حدثنا سعید المقبری عن ابیہ انہ

besturdubooks.wordpress.com

سَأَلَ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَيْفَ تُصَلِّي عَلَى الْجَنَازَةِ؟ فَقَالَ: أَنَا لَعَمْرُ اللهِ أُخْبِرُكَ أَتْبَعُهَا مِنْ أَهْلِهَا، فَإِذَا وُضِعَتْ كَبَّرْتُ فَحَمِدْتُ اللهَ وَصَلَّيْتُ عَلَى نَبِيِّهِ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ثُمَّ أَقُولُ: اَللّٰهُمَّ ... اَلْخ. (مؤطا امام مالک ص:۲۰۹)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، لَا قِرَاءَةَ عَلَى الْجَنَازَةِ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ." (مؤطا امام محمد ص:۱۶۸)

ترجمہ:... "امام مالک رحمہ اللہ، سعید مقبریؒ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: جنازے کی نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ انہوں نے فرمایا: بخدا! میں تمہیں اس کی خبر دوں گا، میں جنازے کے گھر سے اس کے ساتھ ہولیتا ہوں، جب جنازہ نماز کے لئے رکھا جائے تو میں تکبیر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں، پھر یہ دُعا پڑھتا ہوں..... الخ۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہمارا اسی پر عمل ہے، جنازے میں قرأت نہیں، اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔"

مدوّنہ کبریٰ (ج:۱ ص:۱۵۸، ۱۵۹) میں ہے:

"قُلْتُ لِابْنِ الْقَاسِمِ: أَيُّ شَيْءٍ يُقَالُ عَلَى الْمَيِّتِ فِي قَوْلِ مَالِكٍ؟ قَالَ: اَلدُّعَاءُ لِلْمَيِّتِ، قُلْتُ: فَهَلْ يُقْرَأُ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي قَوْلِ مَالِكٍ؟ قَالَ: لَا!

قَالَ ابْنُ وَهْبٍ عَنْ رِجَالٍ مِّنْ أَهْلِ الْعِلْمِ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، وَعَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، وَعَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ، وَفَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ، وَوَاثِلَةَ بْنِ الْأَسْقَعِ، وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، وَسَالِمِ بْنِ عَبْدِاللهِ، وَابْنِ

المسيب، وربيعة، وعطاء بن أبي رباح، ويحيى بن سعيد: أنهم لم يكونوا يقرؤون في الصلوة على الميت.

قال ابن وهب وقال مالك: ليس ذلك بمعمول به في بلدنا، إنما هو الدعاء، أدركت أهل بلدنا على ذلك۔

ترجمہ... میں نے ابن قاسم سے کہا: امام مالک کے قول میں میت پر کیا پڑھنا ہوتا ہے؟ فرمایا: میت کے لئے دعا۔ میں نے کہا: کیا امام مالک کے نزدیک نماز جنازہ میں قراءت ہوتی ہے؟ فرمایا: نہیں!

ابن وہب کہتے ہیں کہ بہت سے اہل علم (صحابہ کرام میں سے) حضرت عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، فضالہ بن عبید، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ اور واثلہ بن اسقع، (اور تابعین میں سے) قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، یحییٰ بن سعید (رضی اللہ عنہم) نماز جنازہ میں قراءت نہیں کیا کرتے تھے۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ امام مالک نے فرمایا: ہمارے شہر میں اس پر عمل نہیں، نماز جنازہ صرف دعا ہے، میں نے اپنے شہر کے اہل علم کو اسی پر پایا ہے۔"

ششم: "لا صلوة الا بفاتحة الكتاب" سے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے ضروری ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں، کیونکہ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں نماز جنازہ حقیقتاً نماز ہی نہیں، بلکہ دعا و استغفار ہے، اور پھر فاتحہ خلف الامام کی بحث میں یہ ذکر کرچکا ہوں کہ صحیح احادیث میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ ضم سورۃ پڑھنے کو بھی انہی احادیث میں ضروری قرار دیا گیا ہے، جس کا نماز جنازہ میں کوئی بھی قائل نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ احادیث سے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بھی ثابت ہے، مگر حمد و ثنا کے طور پر ہے، قراءت کے طور پر نہیں، اور اس کے ہم بھی قائل ہیں۔

سوالِ دوم:... تکبیراتِ عیدین:

"سوال:... عیدین کی نماز میں چھ تکبیریں زائد ہیں یا بارہ؟ اگر دونوں ثابت ہیں تو راویوں کی کثرت کس طرف اعتماد کرتی ہے؟ اور یہ تکبیریں اوّل رکعت میں فاتحہ اور سورۃ پڑھنے سے قبل یا بعد میں؟ اسی طرح دوسری رکعت میں سورۃ پڑھنے کے بعد ہیں یا قبل؟"

جواب:... یہاں چند امور قابلِ ذکر ہیں:

اوّل:... امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک عیدین میں بارہ تکبیریں ہیں، پہلی رکعت میں سات، اور دوسری میں پانچ، اور دونوں میں قراءت سے پہلے ہوتی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں، تکبیرِ تحریمہ سمیت ہیں، اور دوسرے حضرات کے نزدیک تکبیرِ تحریمہ سے زائد۔ امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری اور دیگر حضرات رحمہم اللہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں تین تین تکبیریں زائد ہیں، پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے، اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد۔

دوم:... بارہ تکبیرات کی احادیث متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں، لیکن محدثین کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحت کے ساتھ ثابت نہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ نے بارہ تکبیرات کی حدیث کثیر بن عبداللہ عمرو بن عوف عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کی ہے:

"أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ فِي الْعِيْدَيْنِ فِي الْأُوْلٰى سَبْعًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ، وَفِي الْآخِرَةِ خَمْسًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ."

ترجمہ:... "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین میں پہلی

رکعت میں سات تکبیریں قراءت سے پہلے اور دوسری میں پانچ
تکبیریں قراءت سے پہلے ہیں۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ اس کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"حديث حسن وهو أحسن شيء روي في هذا
الباب" (ترمذی شریف ج:۱ ص:۷۰)

ترجمہ:... "یہ حدیث حسن ہے، اور اس باب میں جتنی
روایات مروی ہیں ان سب سے اچھی ہے۔"

یہ حدیث جو بقول امام ترمذی اس باب کی روایات میں سب سے احسن ہے، اس کا مدار کثیر بن عبداللہ پر ہے، اور اس کے بارے میں محدثین کی آرا یہ ہیں:

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لا يساوي شيئاً" (یہ کسی چیز کے برابر نہیں)، امام ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حديثه ليس بشيء" (اس کی حدیث کوئی چیز نہیں)، امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "متروك الحديث"، امام ابوداؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "واهي الحديث"، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ركن من أركان الكذب" (جھوٹ کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے)، امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"روى عن أبيه عن جده نسخة موضوعة لا
يحل ذكرها في الكتاب إلا على سبيل التعجب."

(تہذیب التہذیب ج:[illegible] ص:[illegible])

ترجمہ:... "اس نے اپنے باپ دادا کی سند سے ایک
موضوع (من گھڑت) نسخہ روایت کیا ہے، جس کا ذکر کرنا بھی جائز
نہیں، الا یہ کہ اظہارِ تعجب کے طور پر ہو۔"

جب اس روایت کا، جو "أحسن شيء في هذا الباب" کہی گئی ہے، یہ حال ہے تو انصاف کیا جائے کہ باقی روایات کا کیا حال ہوگا؟ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی جو تحسین کی ہے، محدثین اس سے بھی متفق نہیں، شاید اس سے [illegible]

عبدالرحمٰن الطائفی کی روایت ہے (عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ) جسے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے (ص ۱۶۳) اگرچہ اس میں بھی متعدد وجوہ سے کلام ہے۔

سوم:... دونوں رکعتوں میں تین تکبیرات کی احادیث اگرچہ تعداد میں کم تر ہیں، لیکن ثقاہت و وجاہت اور تعاملِ سلف کی وجہ سے اول الذکر روایات سے فائق ہیں، چنانچہ:

۱:... امام طحاوی رحمہ اللہ نے ابوعبدالرحمٰن قاسم کی روایت نقل کی ہے:

"حَدَّثَنِيْ بَعْضُ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: صَلَّى بِنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عِيْدٍ، فَكَبَّرَ أَرْبَعًا أَرْبَعًا، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ حِيْنَ انْصَرَفَ فَقَالَ: لَا تَنْسَوْا كَتَكْبِيْرِ الْجَنَازَةِ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ وَقَبَضَ إِبْهَامَهُ." (ج:۲ ص:۳۴۸)

ترجمہ: ... "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی تو چار چار تکبیریں کہیں، نماز سے فارغ ہوکر ہماری طرف متوجہ ہوکر فرمایا: بھول نہ جانا! عید کی تکبیریں جنازے کی طرح چار ہیں، ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ فرمایا اور انگوٹھا بند کرلیا۔"

امام طحاوی رحمہ اللہ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"فَهٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنُ الْإِسْنَادِ، وَعَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ وَيَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ وَالْوَضِيْنُ بْنُ عَطَاءٍ وَالْقَاسِمُ كُلُّهُمْ أَهْلُ رِوَايَةٍ مَعْرُوْفُوْنَ بِصِحَّةِ الرِّوَايَةِ."

ترجمہ: ... "اس حدیث کی سند حسن ہے، اس کے تمام راوی عبداللہ بن یوسف، یحییٰ بن حمزہ، وضین بن عطاء اور قاسم سب کے سب اہلِ روایت ہیں اور صحتِ روایت کے ساتھ معروف ہیں۔"

اس کے تمام راوی معروف ہیں، وضین بن عطاء کو بعض حضرات نے [illegible]

ہے، مگر اکثر حضرات نے ثقہ کہا ہے، اور حافظ رحمہ اللہ نے "فتح الباری" (ج:۲ ص:۴۵۳) میں مسئلہ وتر میں اس کی ایک روایت کو "ثابت و قوی" کہا ہے، جس سے اس کی حدیث جیسا کہ امام مکحول رحمہ اللہ نے فرمایا حسن ہے۔

۳:... "عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ ثَابِتِ بْنِ ثَوْبَانَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ مَكْحُوْلٍ قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبُوْ عَائِشَةَ جَلِيْسٌ لِأَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ سَعِيْدَ بْنَ الْعَاصِ سَأَلَ أَبَا مُوْسَى الْأَشْعَرِيَّ وَحُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ: كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكَبِّرُ فِي الْأَضْحٰى وَالْفِطْرِ؟ فَقَالَ أَبُوْ مُوْسٰى: كَانَ يُكَبِّرُ أَرْبَعًا تَكْبِيْرَةً عَلَى الْجَنَائِزِ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: صَدَقَ. فَقَالَ أَبُوْ مُوْسٰى: كَذٰلِكَ كُنْتُ أُكَبِّرُ فِي الْبَصْرَةِ حَيْثُ كُنْتُ عَلَيْهِمْ. قَالَ أَبُوْ عَائِشَةَ: وَأَنَا حَاضِرٌ سَعِيْدَ بْنَ الْعَاصِ."

(ابوداؤد ج:۱ ص:۱۶۳، طحاوی ج:۲ ص:۳۹۹، مسند احمد ج:۴ ص:۴۱۶)

ترجمہ:... "عبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان اپنے والد ثابت بن ثوبان سے روایت کرتے ہیں، وہ مکحول سے، انہوں نے کہا کہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہم نشین ابوعائشہ نے مجھے بتایا کہ: حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید میں کتنی تکبیریں کہا کرتے تھے؟ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار چار تکبیریں کہا کرتے تھے، جیسا کہ جنازے پر تکبیریں کہتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھیک کہتے ہیں! حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جب میں بصرہ کا حاکم تھا تو اسی طرح تکبیریں کہا کرتا تھا۔ ابوعائشہ کہتے ہیں کہ سعید

besturdubooks.wordpress.com

بن عاصؓ کے سوال کے وقت میں خود موجود تھے۔"

حافظ رحمہ اللہ نے "تقریب" میں عبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان کو "صدوق یخطئ یرمی بالقدر" اور ابو عائشہ کو "مقبول" لکھا ہے، اور سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے سوال کا قصہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے ایک اور سند سے اس طرح نقل کیا ہے:

"عن مكحول قال: حدثني رسول حذيفة وأبي موسى رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يكبر في العيدين أربعا وأربعا سوى تكبيرة الافتتاح." (ج:۲ ص:۳۹۹)

ترجمہ... "مکحول کہتے ہیں کہ مجھے حضرت حذیفہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما کے قاصد نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین میں (علاوہ تکبیر تحریمہ کے) چار چار تکبیریں کہا کرتے تھے، سوائے تکبیر تحریمہ کے۔"

چہارم... دراصل اس باب میں فقہائے امت کا اعتماد مرفوع احادیث کی بجائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل پر ہے، جیسا کہ ابن رشد رحمہ اللہ نے "بدایۃ المجتہد" (ج:۱ ص:۲۱۶) میں لکھا ہے، چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ موطا (ص:۱۶۴) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے عمل سے سات اور پانچ کی روایت نقل کرکے فرماتے ہیں:

"وهو الأمر عندنا" (ہمارے ہاں اسی پر عمل ہے)۔

اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل بھی اس باب میں مختلف ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل موطا کے حوالے سے ابھی گزرا، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلے میں مختلف روایات مروی ہیں۔

ان سے روایت یہ ہے کہ وہ دونوں رکعتوں میں قرأت سے پہلے بارہ تکبیریں کہا کرتے تھے، پہلی میں سات اور دوسری میں پانچ۔ چونکہ اس روایت کو خلفائے بنوعباس نے معمول بہا بنا دیا، اس لئے اس عمل کو زیادہ شہرت ہوئی، اور امام شافعی و امام احمد رحمہما اللہ نے

اسی روایت کو لیا ہے، اس سے دوسری روایت حنفیہ کے موافق ہیں۔

(طحاوی ج:۱ ص:۲۸۴، عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۹۳)

تیسری روایت میں ہے کہ وہ تیرہ تکبیریں کہتے تھے، پہلی میں سات قراءت سے پہلے، اور دوسری میں چھ قراءت کے بعد۔ (طحاوی ج:۱ ص:۴۰۰)

چوتھی روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو چاہے سات تکبیریں کہے، اور جو چاہے تو نو یا تیرہ تکبیریں کہے۔ (طحاوی ج:۱ ص:۴۰۰)

حنفیہ کا عمل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر ہے، چنانچہ ان سے مختلف طرق و اسانید سے مروی ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے بعد تین تکبیریں کہے، پھر قراءت کرے، اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد تین تکبیریں کہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی احادیث نصب الرایہ (ج:۲ ص:۲۱۳، ۲۱۴)، عبدالرزاق (ج:۳ ص:۲۹۳)، طحاوی (ج:۲ ص:۴۰۱)، کتاب الحجة علی اہل المدینة (ج:۱ ص:۳۰۳)، کتاب الآثار (ص:۵۳۶)، مجمع الزوائد (ج:۲ ص:۲۰۵)، تفسیر ابن کثیر (ج:۲ ص:۵۱۳) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تصدیق و تصویب و موافقت منقول ہے، چنانچہ:

۱:... امام طحاوی رحمہ اللہ نے "باب التکبیر علی الجنائز" میں حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو تکبیراتِ جنازہ میں اختلاف تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کسی ایک صورت پر متفق کرنے کے لئے مشورہ فرمایا:

"فاجمعوا أمرهم على أن يجعلوا التكبير على الجنائز مثل التكبير في الأضحى والفطر أربع تكبيرات، فأجمع أمرهم على ذلك." (طحاوی ج:۱ ص:۳۳۳)

ترجمہ:... "پس ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جنازے کی تکبیریں اتنی ہوں جتنی عیدین کی نماز میں زائد کہی جاتی ہیں۔"

تکبیروں کے بعد قراءت کرتے تھے، اور دُوسری میں تکبیروں سے پہلے، یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔"

اور ہر رکعت میں تین تکبیرات کے افضل اور راجح ہونے کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

حدیث نمبر۱ میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چار تکبیریں (بشمول تکبیرِ رکوع) کہیں، اور نماز سے فارغ ہوکر فرمایا: بھول نہ جانا، چار چار تکبیریں ہیں نمازِ جنازہ کی طرح، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنگلیوں سے اشارہ فرمایا، پس یہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل، اشارہ و استدلال اور تاکید سے ثابت ہے۔

۲:... پہلے گزر چکا ہے کہ تین تین تکبیرات کی احادیث صحت و قوت میں فائق ہیں۔

۳:... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اس پر تعامل زیادہ رہا ہے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعامل مختلف رہا ہے، کبھی بارہ پر، کبھی چھ پر۔

۴:... یہ ظاہر ہے کہ عیدین کی زائد تکبیریں، عام نمازوں کے طرز کے خلاف مشروع کی گئی ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ چھ تکبیروں پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتفاق ہے، اور زائد میں اختلاف ہے، پس متفق علیہ اور متیقن عدد کو لے لینا اور مختلف فیہ کو ترک کردینا اَوْلیٰ ہوگا، واللہ اعلم!

besturdubooks.wordpress.com

سوال ۱۱:... سنتِ فجر:

"سوال:... نماز کے لئے اقامت ہوچکی ہو تو قریب کوئی نماز نہیں ہوتی ہے، پھر کیوں لوگ فجر کی سنت اس وقت پڑھنے لگتے ہیں جبکہ فرض نماز شروع ہو رہی ہے؟ حدیث نبوی کی رُو سے نماز نہیں ہوئی، رہا یہ کہ مسجد کے کسی کونے میں پڑھ لینا تو کیا امام کی قراءت کی آواز کانوں سے نہیں ٹکراتی؟"

جواب:... اس مسئلے میں دو جہتیں متعارض ہیں، جن کی وجہ سے کسی ایک جانب کے اختیار کرنے میں اشکال پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں فجر کی پہلی سنتوں کی بہت ہی تاکید فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرض اور وتر نماز کے بعد باجماعِ اُمت سب سے زیادہ موٴکد سنتِ فجر ہے۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جماعت میں شرکت کی بھی بہت تاکید فرمائی ہے۔ اب جو شخص ایسے وقت آئے کہ نماز کھڑی ہوچکی ہو، اور اس نے سنتِ فجر نہ پڑھی ہو، اگر وہ سنتِ فجر کو ترک کرتا ہے تو ان احادیث کی مخالفت لازم آتی ہے، جو سنتِ فجر کی تاکید میں وارد ہوئی ہیں، اور اگر سنتِ فجر کے ادا کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو شرکتِ جماعت کی تاکید سے متعلقہ احادیث کی مخالفت لازم آتی ہے۔ ائمہ احناف رحمہم اللہ نے ان دونوں تاکیدوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر اس شخص کو جماعت کی ایک رکعت مل جانے کا اطمینان ہو تب تو دونوں فضیلتوں کو جمع کرے، پہلے مسجد کے دروازے پر سنتیں ادا کرلے، اور پھر جماعت میں شریک ہوجائے، اور اگر خیال ہو کہ سنتوں میں مشغول ہوا تو جماعت کی دونوں رکعتیں نکل جائیں گی تو جماعت میں شریک ہوجائے اور سنتیں طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھے، کیونکہ نمازِ فجر کے بعد نفل پڑھنے کی احادیثِ متواترہ میں ممانعت آئی ہے، سلف کا عمل بھی اس بارے میں

besturdubooks.wordpress.com

مختلف رہا ہے، حنفیہ کی تائید میں چند حدیثیں ذیل میں درج ہیں۔

۱:... "عن عبدالله بن أبي موسى قال: جاءنا ابن مسعود والإمام يصلي الفجر، فصلى ركعتين إلى سارية، ولم يكن صلى ركعتي الفجر." (عبدالرزاق ج:۲ ص:۴۴۴)

ترجمہ:... "عبداللہ بن ابوموسیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے، جبکہ امام نماز پڑھ رہا تھا، پس انہوں نے ستون کی اوٹ میں دو رکعتیں پڑھیں، انہوں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔"

۲:... "عن حارثة بن مضرب أن ابن مسعود وأبا موسى خرجا من عند سعيد بن العاص فأقيمت الصلوة فركع ابن مسعود ركعتين ثم دخل مع القوم في الصلوة وأما أبو موسى فدخل في الصف." (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۵۱)

ترجمہ:... "حارثہ بن مضرب کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہم کے پاس سے نکلے، راستے میں جماعت کھڑی ہوگئی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر جماعت میں شریک ہوئے، اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ آتے ہی صف میں داخل ہوگئے۔"

۳:... "عن أبي الدرداء رضي الله عنه أنه كان يقول: نعم والله لئن دخلت والناس في الصلوة لأعمدن إلى سارية من سواري المسجد ثم لأركعهما، ثم لأكملنهما، ثم لا أعجل[1] عن إكمالهما، ثم أمشي إلى

(۱) بعض نسخوں میں ہے: "لا أعجل" اور بعض میں: "لأعجل" میرے نزدیک یہی صحیح ہے، کیونکہ پہلے نسخے کے مطابق مضمون صحیح ہے۔

النَّاسِ فَأُصَلِّيْ مَعَ النَّاسِ الصُّبْحَ."

(عبدالرزاق ج:۲ ص:۴۴۴)

ترجمہ:... "حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ: ہاں! اللہ کی قسم! اگر میں ایسے وقت مسجد میں داخل ہوں جبکہ لوگ جماعت میں ہوں، تو میں مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے پیچھے جاکر سنتِ فجر کی دو رکعتیں ادا کروں گا، اور ان کو کامل طریقے سے ادا کروں گا، اور ان کو کامل کرنے میں جلدبازی سے کام نہیں لوں گا، پھر جاکر لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوں گا۔"

۴:... "عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: إِنِّيْ لَأَجِيْءُ إِلَى الْقَوْمِ وَهُمْ صُفُوْفٌ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ فَأُصَلِّي الرَّكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَنْضَمُّ إِلَيْهِمْ." (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۵۰)

ترجمہ:... "حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں لوگوں کے پاس جاتا ہوں، جبکہ وہ نمازِ فجر میں صفیں باندھے کھڑے ہوں، تو میں پہلے سنتِ فجر کی دو رکعتیں پڑھتا ہوں، پھر جماعت میں شریک ہوتا ہوں۔"

۵:... "عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يَدْخُلُ فِي الصَّلٰوةِ تَارَةً وَأُخْرٰى يُصَلِّيْهِمَا فِيْ جَانِبِ الْمَسْجِدِ." (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۵۱)

ترجمہ:... "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کبھی آتے ہی جماعت میں داخل ہوجاتے، اور کبھی مسجد کے ایک گوشے میں سنتیں پڑھ لیتے۔"

۶:... "عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ مَسْرُوْقٍ أَنَّهُ دَخَلَ

besturdubooks.wordpress.com

الْمَسْجِدَ وَالْقَوْمُ فِیْ صَلٰوۃِ الْغَدَاۃِ وَلَمْ یَکُنْ صَلّٰی الرَّکْعَتَیْنِ، فَصَلَّاھُمَا فِیْ نَاحِیَۃٍ، ثُمَّ دَخَلَ مَعَ الْقَوْمِ فِیْ صَلَاتِھِمْ۔"

(ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۲۵۰، المصنف عبدالرزاق ج:۲ ص:۴۴۴)

ترجمہ:... "امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت مسروق رحمہ اللہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ لوگ صبح کی نماز میں تھے، انہوں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں، پس ایک گوشے میں سنتیں پڑھیں، پھر جماعت میں شریک ہوئے۔"

۷:... "عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: اِذَا دَخَلْتَ الْمَسْجِدَ وَالْاِمَامُ فِی الصَّلٰوۃِ وَلَمْ تَکُنْ رَکَعْتَ رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ، فَصَلِّھِمَا ثُمَّ ادْخُلْ مَعَ الْاِمَامِ۔" (عبدالرزاق ج:۲ ص:۴۴۵)

ترجمہ:... "حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ: جب تم مسجد میں ایسے وقت میں داخل ہو کہ امام نماز میں ہو، اور تم نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں تو پہلے سنتیں پڑھو، پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔"

۸:... "عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْھُمَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَالْقَوْمُ فِی الصَّلٰوۃِ، وَلَمْ یَکُنْ صَلّٰی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ، فَدَخَلَ مَعَ الْقَوْمِ فِیْ صَلٰوتِھِمْ، حَتّٰی اِذَا اَشْرَقَتْ لَہُ الشَّمْسُ قَضَاھُمَا، قَالَ: وَکَانَ اِذَا اَجْنَبَ الصَّلٰوۃَ وَھُوَ فِی الطَّرِیْقِ صَلَّاھُمَا فِی الطَّرِیْقِ۔"

(عبدالرزاق ج:۲ ص:۴۴۳)

ترجمہ:... "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مسجد میں داخل ہوئے جبکہ نماز کھڑی ہوچکی تھی، اور انہوں نے سنتِ فجر نہیں پڑھی تھیں، پس وہ جماعت میں شریک ہوگئے، یہاں تک کہ سورج خوب

نکل آیا تو سنتیں قضا کیں۔ نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ اگر راستے میں اقامت ہو جاتی تو وہ راستے ہی میں سنتیں پڑھ لیتے۔"

ان آثار سے معلوم ہوا کہ ائمہ احناف رحمہم اللہ نے وہی مسلک اختیار کیا ہے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کا عمل تھا، اور جسے فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود، حکیم الامت ابو درداء اور شیخ المدینہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا، ظاہر ہے کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بے خبر نہیں تھے۔

سوال ۱۵: ...تاخیرِ واجب پر سجدۂ سہو:

"سوال: ...احناف کے نزدیک نماز کے دوران فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان اتنا وقفہ ہو جائے کہ تین مرتبہ "سبحان اللہ" کہا جاسکے تو سجدۂ سہو لازم آجاتا ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟"

جواب: ...اس ضمن میں چند امور قابلِ توجہ ہیں:

اوّل: ...سجدۂ سہو کی بحث میں اس طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند موقعوں پر سجدۂ سہو ثابت ہے، مثلاً:

۱: ...آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے اور سجدۂ سہو کیا۔

۲: ...دو رکعت پر قعدہ کئے بغیر کھڑے ہوگئے اور سجدۂ سہو کیا۔

۳: ...دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور سجدۂ سہو کیا۔

۴: ...تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور سجدۂ سہو کیا۔

۵: ...شک کی صورت میں غالب ظن پر عمل کرکے سجدۂ سہو کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ چند صورتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدۂ سہو کی منقول ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا سجدۂ سہو کا انحصار انہی صورتوں میں ہے؟ یا ان کے علاوہ بھی سجدۂ سہو کی صورت میں لازم آتا ہے؟ سجدۂ سہو کی بحث میں اس طرف بھی اشارہ کرچکا ہوں کہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ اور جمہور امت کے نزدیک سجدۂ سہو کی موجب کوئی چیز پائی جائے، وہاں سجدۂ سہو واجب ہوگا، کسی کے نزدیک سلام سے پہلے اور کسی کے نزدیک بعد۔

دوم: ...جب یہ بات طے ہوئی کہ سجدۂ سہو اور صورتوں میں بھی واجب ہے تو اب یہ سوال ہوگا کہ سجدۂ سہو کا اصول کیا ہے؟ کن چیزوں کے ترک سے سجدۂ سہو لازم ہوگا؟ اور کن چیزوں کے ترک سے نہیں؟ یہاں مجھے دوسرے ائمہ اجتہاد کے اصول سے بحث

besturdubooks.wordpress.com

نہیں بلکہ صرف ائمہ احناف کے اصول کی وضاحت پر اکتفا کروں گا۔

ائمہ احناف رحمہم اللہ نے تکبیرِ تحریمہ سے لے کر سلام تک نماز کے تمام افعال پر غور کر کے ان کے چار درجے مقرر کئے، بعض افعال کو "فرض" قرار دیا، جن کے فوت ہونے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، اور بغیر اعادہ کے اس کی تلافی ممکن نہیں ہوسکتی، جیسے: قیام، قراءت، رکوع و سجود، آخری قعدہ وغیرہ۔ بعض چیزوں کو "واجب" قرار دیا ہے اگر سہواً فوت ہوجائیں تو سجدۂ سہو سے ان کی تلافی ہوجاتی ہے، اور بعض امور کو "سنت" قرار دیا، جس کے ترک کردینے سے نماز خلافِ سنت ہوگی، اس سے سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا۔ بعض امور کو "مستحب" اور "مندوب" قرار دیا کہ ان کا کرنا موجبِ ثواب ہے، مگر ترک موجبِ عتاب نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ ائمہ احناف رحمہم اللہ کے نزدیک سجدۂ سہو کا اصول ترکِ واجب ہے، اور نماز کے ارکان و واجبات میں موالات بھی واجب ہے، اس لئے اس کے ترک سے سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

سوم:... اوپر احادیثِ طیبہ میں سجدۂ سہو کی جو صورتیں مذکور ہوئی ہیں، ان پر غور کرو تو ان میں یہی اصول کارفرما نظر آئے گا، چنانچہ قعدۂ اولیٰ کے ترک کی صورت میں سجدۂ سہو فرمایا، کیونکہ قعدۂ اولیٰ واجب تھا۔ چار رکعتوں کے بعد پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے تو سلام میں تاخیر ہوئی، اور موالات، جو واجب تھی، فوت ہوگئی، اس لئے سجدۂ سہو واجب ہوا۔ اسی طرح دو رکعت یا تین رکعت پر سلام پھیر دینے کی صورت میں بقیہ ارکان کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی، اور ارکان کے درمیان موالات نہ رہی، اس لئے سجدۂ سہو واجب ہوا۔ شک کی صورت میں احتمال ہے کہ شاید ایک رکعت زیادہ پڑھی گئی ہو اور فراغ عن الصلوٰۃ میں تاخیر ہوگئی تو سجدۂ سہو واجب ہوا۔

پس احادیثِ طیبہ سے یہ اصول منقح ہوگیا کہ ترکِ واجب یا تاخیرِ رکن یا تاخیرِ واجب سے سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے۔

چہارم:... اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا کہ تاخیر کا معیار کیا ہے جس سے

besturdubooks.wordpress.com

سے واجب فوت ہوجاتی ہے اور سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے؟ حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ذکر و تسبیح کا مختصر رکن جس میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے، پس ادنیٰ رکن کی ادائیگی کے بقدر اگر کسی رکن یا واجب کے ادا کرنے میں تاخیر ہوجائے تو سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے، اور وہ ہے تین تسبیح کی مقدار۔

یہ مقدمات ذہن نشین ہوگئے تو آپ کے سوال کا جواب واضح ہوجائے گا، چونکہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ پڑھنا نماز میں واجب ہے، اور تین تسبیح کی مقدار اس میں تاخیر سے واجبات فوت ہوجاتی ہے، اس لئے ائمہ احناف رحمہم اللہ اس پر سجدۂ سہو کا حکم کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں، یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث طیبہ ہی سے لیا گیا ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

سوال ۱۳:... ران ستر ہے؟

"سوال:... مرد کے لئے سترِ عورت ناف سے گھٹنے تک بتایا جاتا ہے، اس کے لئے کن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے؟ جبکہ بخاری میں حضرت انسؓ نے بروایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگِ خیبر میں) اپنی ران کھولی۔ زید بن ثابتؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر (قرآن) اُتارا، اور آپ کی ران میری ران پر تھی، وہ اتنی بھاری ہوگئی، میں ڈرا کہ کہیں میری ران ٹوٹ جاتی ہے۔ امام بخاریؒ نے استدلال کیا اگر ران عورت ہوتی تو آپ زیدؓ کی ران پر اپنی ران نہ رکھتے۔ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر جہاد کیا، ہم لوگوں نے صبح کی نماز اندھیرے میں خیبر کے قریب پہنچ کر پڑھی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے، اور میں ابوطلحہؓ کے پیچھے ایک ہی سواری پر بیٹھا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی گلیوں میں اپنی جانور دوڑایا اور (دوڑنے میں) میرا گھٹنا آنحضرتؐ کی ران سے چھو جاتا تھا، پھر آپ نے اپنی ران سے تہبند ہٹادی (ران کھول دی) یہاں تک کہ آپ کی سفیدی (اور چمک) دیکھنے لگا۔"

جواب:... یہاں چند اُمور قابلِ ذکر ہیں:

اوّل:... بہت سی احادیث سے ثابت ہے کہ ران ستر میں داخل ہے۔

۱:... "عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا زوج

ترجمہ:... ''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ران ستر ہے۔''

۴... ''عَنْ أَبِي أَيُّوْبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَسْفَلُ السُّرَّةِ وَفَوْقَ الرُّكْبَتَيْنِ مِنَ الْعَوْرَةِ۔''

(نصب الرایہ ج:۱ ص:۲۹۷، مغنی ابنِ قدامہ ج:۱ ص:۵۷۸)

ترجمہ:... ''حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ناف سے نیچے اور گھٹنوں سے اوپر کا حصہ ستر ہے۔''

۵... ''عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُبْرِزْ فَخِذَكَ وَلَا تَنْظُرْ إِلٰى فَخِذِ حَيٍّ وَلَا مَيِّتٍ۔'' (ابوداؤد ج:۲ ص:۴۴۳ وسکت عنہ فی باب ستر المیت عند غسلہ من کتاب الجنائز ثم اخرجہ فی کتاب الحمام باب النہی عن التعری ج:۲ ص:۵۵۵ وقال: ہذا الحدیث فیہ نکارۃ)

ترجمہ:... ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ران نہ کھولو، اور نہ کسی زندہ یا مردہ کی ران کی طرف نظر کرو۔''

۶... ''عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ (عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ) جَحْشٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا مَعَهُ عَلٰى مَعْمَرٍ وَفَخِذَاهُ مَكْشُوْفَتَانِ، فَقَالَ: يَا مَعْمَرُ! غَطِّ عَلَيْكَ فَخِذَيْكَ، فَإِنَّ الْفَخِذَيْنِ عَوْرَةٌ۔'' (فتح الباری ج:۱ ص:۴۷۹ وقال: وصلہ احمد والمصنف فی التاریخ والحاکم فی المستدرک کلہم من طریق اسماعیل بن جعفر عن العلاء بن

عند الطحاوي عن أبي كثير مولى محمد بن جحش عنه. ورجاله رجال الصحيح غير أبي كثير، فقد روى عنه جماعة. لكن لم أجد فيه تصريحًا بتعديل. ووقع لي حديث محمد بن جحش مسلسلًا بالمحمدين من ابتدائه إلى انتهائه، وقد أمليته في الأربعين المتباينة"

(فتح الباری ج:۱ ص:۴۷۹)

ترجمہ:... "حضرت محمد بن جحش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معمر کے پاس سے گزرے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، معمر کی رانیں کھلی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معمر! اپنی رانیں ڈھکو، کیونکہ رانیں ستر ہیں۔"

۷:... "قال الحافظ: ومعمر المشار إليه هو معمر بن عبدالله بن نضلة القرشي العدوي، وقد أخرج ابن قانع هذا الحديث من طريقه أيضًا" (فتح الباری ج:۱ ص:۴۷۹)

ترجمہ:... "حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت معمر رضی اللہ عنہ جن کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے، یہ معمر بن عبداللہ القرشی العدوی ہیں، ابن قانع نے یہ حدیث خود ان سے بھی روایت کی ہے۔"

۸:... "عن علي رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الركبة من العورة."

(اخرجہ الدارقطنی بسند ضعیف کذا فی نصب الرایہ ج:۱ ص:۲۹۷)

ترجمہ:... "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھٹنا ستر میں داخل ہے۔"

دوم:... ان احادیث میں سے بعض صحیح ہیں، بعض حسن اور مقبول، اور بعض ضعیف، لیکن ایک ہی مضمون جب متعدد احادیث میں، متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہو تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی تردد نہیں رہ جاتا، یہی وجہ ہے کہ ائمہ

besturdubooks.wordpress.com

اور یہی اور جمہور سلف و خلف رانوں کو ستر میں شمار کرتے ہیں، چنانچہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ "المغنی" (ج:۱ ص:۵۷۸) میں لکھتے ہیں:

"والصالح في المذهب أنها (أي العورة) من الرجل ما بين السرة والركبة نص عليه أحمد في رواية جماعة، وهو قول مالك والشافعي وأبي حنيفة وأكثر الفقهاء."

ترجمہ:... "صحیح روایت ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ مرد کا ستر ناف اور گھٹنے کے مابین ہے، ایک جماعت کی روایت میں امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے، اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔"

ابن قدامہ رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کی دو روایتیں ذکر کی ہیں، اور "صالح فی المذہب" اسی روایت کو کہا ہے جو جمہور کے مطابق ہے، اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ سے بھی دو روایتیں ہیں، لیکن معتمد علیہ روایت وہی ہے جو جمہور کے مطابق ہے۔

سوم:... سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی صحت میں کلام نہیں، مگر یہاں چند اُصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ جب ایک حدیث سے کسی شے کی حرمت ثابت ہوتی ہو اور دُوسری سے اس کی اباحت مفہوم ہوتی ہے، تو اہل علم کے نزدیک حرمت کو ترجیح ہوتی ہے، اور یہ اُصول بھی خود ارشادِ نبوی سے ثابت ہے:

"عن النعمان بن بشير رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الحلال بين والحرام بين، وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام، كالراعي يرعى حول الحمى يوشك أن يرتع

فیہ. الحدیث." (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۲۴۱)

ترجمہ: "نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال بھی واضح ہے، اور حرام بھی واضح ہے، اور حلال و حرام کے درمیان بعض امور مشتبہ ہیں، جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہات سے بچا، اس نے اپنے دین کو اور اپنی عزت کو بچا لیا، اور جو شخص شبہ کی چیزوں میں جا پڑا وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا، جیسے کوئی چرواہا ممنوعہ چراگاہ کے گرد و پیش چرائے تو قریب ہے کہ چراگاہ میں بھی چرانے لگے گا۔"

اس اصول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جن احادیث سے ران کا ستر ہونا ثابت ہوتا ہے، وہ مقدم ہوں گی ان روایات پر جن سے اس کے خلاف کا وہم ہوتا ہے، غالباً امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی "حدیث انس اسند و حدیث جرھد احوط" (ج ۱ ص ۵۳) کہہ کر اسی اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں بظاہر تعارض نظر آئے تو قول کو ترجیح ہوگی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پوری امت کے لئے قانونِ عام ہیں، اور افعال میں خصوصیت یا عذر کا احتمال ہے، چونکہ متعدد احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ران کو ستر فرمایا ہے، جو امت کے لئے تشریع ہے، اس کے مقابلے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

تیسرا اصول یہ کہ اگر شارع علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ کسی اصول اور قاعدے سے کوئی خاص جزئی واقعہ بظاہر ٹکراتا ہو تو اصول اور قاعدۂ کلیہ کو ترجیح ہوگی، اور خاص واقعے میں کوئی تاویل کی جائے گی، یہ نہیں ہوگا کہ اس خاص واقعے کو تو اصول اور قاعدہ بنایا جائے اور شارع علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ اصول اور قاعدے میں ترمیم کر ڈالی جائے۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول عام کے طور پر فرمادیا ہے کہ: "اَلْفَخِذُ عَوْرَةٌ" (ران ستر میں داخل ہے) اس لئے اس اصول کو تو محکم رکھا جائے گا، اور حضرت انس رضی

besturdubooks.wordpress.com

اللہ عنہ کی حدیث میں جو ایک خاص واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اس کی کوئی توجیہ کی جائے تو ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً رانوں کو کپڑا نہیں ہٹایا ہوگا، بلکہ کپڑا اوپر کو سرکتے ہوئے اتفاقاً ران کھل گئی ہوگی، چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد کی روایت میں "فانحسر" کا لفظ ہے، یعنی ران کھل گئی، یہ بھی احتمال ہے کہ ران کے ستر ہونے کی تشریح بعد میں ہوئی ہو، اس وقت تک یہ حکم نازل نہ ہوا ہو۔

ران کا ستر ہونا چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ثابت ہے، اور کسی موقع پر ران کھل جانے کی روایت راوی کی اپنی تعبیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں، اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد راوی کی کسی جزئی واقعے سے متعلق تعبیر پر مقدم ہے۔

چہارم:... ران کے ستر ہونے پر تو جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، ائمہ اربعہ اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ کا اتفاق ہے، لیکن حنفیہ گھٹنے کو بھی ستر میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں (جو اگرچہ ضعیف ہے) اس کو ستر فرمایا گیا ہے، نیز عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی حدیث "الى الركبة" کے الفاظ سے اس کا شبہ ہوتا ہے، اس لئے حنفیہ کے نزدیک گھٹنوں کا ستر میں شمار کیا جانا مقتضائے احتیاط ہے، تاہم ائمہ احناف نے اختلافِ روایت کے پیشِ نظر ستر کے تین درجے قرار دئیے ہیں، چنانچہ ہدایہ (کتاب الكراهية، فصل في الوطء والنظر واللمس) میں ہے:

"وحكم العورة في الركبة أخف منه في الفخذ،
وفي الفخذ أخف منه في السوأة حتى أن كاشف الركبة
ينكر عليه برفق وكاشف الفخذ يعنف عليه وكاشف
السوأة يؤدب إن لج."

ترجمہ:... "ستر کا حکم گھٹنے میں ہلکا ہے بہ نسبت ران
کے، اور ران میں ہلکا ہے بہ نسبت اعضائے مستورہ کے، چنانچہ
اگر کوئی گھٹنے کھولے تو اس کو نرمی سے ٹوکا جائے گا (اور اگر

besturdubooks.wordpress.com

اصرار کرے تو خاموشی اختیار کی جائے گی)، اور اگر کوئی شخص بیان تنگی
کرے تو اس کو تنگی سے روکا جائے گا (لیکن اگر وہ اصرار کرے تو اس
پر دست درازی نہیں کی جائے گی)، اور اگر کوئی شخص اعضائے
مستورہ کو برہنہ کرے اور کھولے پر بھی باز نہ آئے تو اس کی گوشمالی کی
جائے گی۔"

اس سے ائمہ احناف رحمہم اللہ کی دقیقہ رسی واضح ہوجاتی ہے کہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کے عشق و محبت کا یہ عالم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کو بھی، خواہ ضعیف سند ہی سے منقول ہو، وہ نہیں چھوڑنا چاہتے، اور دوسری طرف ان کی حقیقت پسندی و مرتبہ شناسی کا یہ حال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیز جس درجے میں منقول ہو، اسے وہی مقام و مرتبہ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ احادیث نبویہ کی جمع و تطبیق اور ان کی وجہ بندی کا جو کام ائمہ احناف رحمہم اللہ نے کیا ہے، اس کی مثال نہیں۔ مناسب وقت کے حسب حال کی آخری کا نام "تفقہ فی الدین" ہے، جس کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

"مَنْ أَرَادَ الْفِقْهَ فَهُوَ عِيَالٌ عَلَى أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ۔"

ترجمہ:... "جو شخص تفقہ فی الدین کا ارادہ رکھتا ہو، وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا دست نگر ہے۔"

besturdubooks.wordpress.com

سوال۱۴:... خطبے کے دوران تحیۃ المسجد کا حکم:

"نوٹ:... یہ سوال اسی نوعیت کے جناب محمد صادق صاحب کھارادر کراچی کے موصول ہوئے، بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ان کا جواب بھی انہی تیرہ سوالوں کے ساتھ ملحق کردیا جائے، لہٰذا سوال نمبر۱۴ اور ۱۵ میں یہ دونوں سوال و جواب درج کئے جاتے ہیں۔"

"سوال:... ہمارے ہاں خطبے کے احکام میں بتایا جاتا ہے کہ جب امام خطبے کے لئے منبر پر بیٹھ جائے تو اس وقت نہ ہی نماز پڑھی جائے اور نہ ہی کلام کیا جائے، حتیٰ کہ زبان سے کسی کو منع بھی نہ کیا جائے، بلکہ دُعا و دُرود بھی دل میں ہی کہہ لیا جائے، زبان نہ ہلے۔ لیکن احادیث کے حوالے سے یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ اگر کوئی ایسے موقع پر مسجد میں حاضر ہو کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو ہلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھنا چاہئے، اور اس سلسلے میں مسلم، ابنِ ماجہ اور ابوداؤد کے حوالے سے سلیک غطفانیؓ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ خطبے کے دوران جب وہ مسجد میں آئے اور بغیر دو رکعت پڑھے بیٹھ گئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ: دو رکعت پڑھ کر بیٹھے ہو؟ تو ان کے نفی کے جواب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُٹھو! اور دو رکعت ادا کرکے بیٹھو۔ پھر لوگوں سے فرمایا کہ: جو بھی ایسے وقت حاضر ہو، وہ ہلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھے۔ مزید اس کی تفصیل میں کہا جاتا ہے کہ

besturdubooks.wordpress.com

مروان بن حکم کے زمانے میں فرمانِ شاہی تھا کہ جب بادشاہ خطبہ پڑھ رہے ہوں تو کوئی دو رکعت نماز نہ پڑھے، اور ضبط شانِ شاہی کی تحقیر بتلائی گئی۔ لیکن حضرت ابوسعید خدریؓ ایسے موقع پر پہنچتے ہیں اور دو رکعت ادا فرماتے ہیں، اور جبراً ان کی یہ نماز تڑوانے کی بھی پروا نہیں فرماتے ہیں کہ: سنتِ رسول کسی بادشاہ کے قانون پر قربان نہیں کی جاسکتی، بلکہ تمام قوانینِ سلطنت ایک سنت پر پائمیں پاؤں تلے روندے جاسکتے ہیں۔ اس واقعے کے لئے حوالہ ترمذی شریف کا دیا جاتا ہے، اور خطبے کے دوران آنے والا دو رکعت نہ پڑھے، اسے "مروانی بدعت" کہا جاتا ہے، اور ان کے متعلق یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ اس بادشاہ نے عید کے خطبے کو بھی نماز سے پہلے کردیا تھا۔ مندرجہ بالا تفصیل کے پیشِ نظر حدیث سے تطابق کی صورت کیا ہوگی؟ ہمارے ہاں! تو جیسے اور افعال خطبے کے دوران منع ہیں، ایسے ہی نماز کو بھی منع کیا جاتا ہے، یہاں نماز کا حکم دیا جارہا ہے، اس حدیث کی روشنی میں نماز کی اجازت ہمارے ہاں بھی ہے یا نہیں؟ نفی کی صورت میں ہمارے دلائل، اور اس حدیث کا جواب کیا ہے؟ اس حدیث میں جن دو رکعتوں کا ذکر ہے، اس سے تو تحیۃ المسجد سمجھ میں آتی ہے، جو کہ شاید وجوب کا درجہ نہیں رکھتی، یہاں تاکید سے سنتِ مؤکدہ سمجھ میں آتی ہے، اگر تحیۃ المسجد (ان دو رکعتوں) کی حیثیت سنتِ مؤکدہ کی ہے تو چار سنت قبل الجمعہ کی اجازت ہونی چاہئے، جو کہ سنتِ مؤکدہ ہی ہے۔ اسی ضمن میں ایک سوال ذہن میں یہ بھی اُٹھتا ہے کہ جو شخص عین خطبے کے دوران آئے، اسے وضو بھی کرنا ہوتا ہے، اس کے وضو کے عمل سے ثواب لغو ہوجائے گا یا نہیں؟"

جواب:... حضرات خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم) کے

besturdubooks.wordpress.com

نزدیک خطبے کے دوران صلوٰۃ و کلام ممنوع ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور اکثر فقہائے امت رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، اور قرآن و سنت کی روشنی میں یہی مسلک راجح اور صواب ہے۔ اس کے برعکس بعض صحابہ و تابعین خطبے کی حالت میں بھی تحیۃ المسجد کے قائل تھے، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور مابعد کے بیشتر محدثین رحمہم اللہ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ تاہم ان حضرات کے نزدیک بھی تحیۃ المسجد کے استحسان یا جواز کی شرط یہ ہے کہ خطبہ آخری مرحلے میں نہ ہو کہ تحیۃ المسجد میں مشغول ہونے کی صورت میں جماعت شروع ہو جانے کا اندیشہ ہو، ایسی حالت میں ان کے نزدیک بھی تحیۃ المسجد میں مشغول ہونا ممنوع ہے۔

جو حضرات خطبے کے دوران تحیۃ المسجد کے جواز یا استحسان کے قائل ہیں، ان کا استدلال حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جو سوال میں ذکر کی گئی ہے، اس پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ جمہورِ امت نے جو مسلک اختیار کیا ہے کہ خطبے کے دوران نماز اور کلام ممنوع ہے، اس کے دلائل معلوم کر لئے جائیں۔

قرآنِ کریم:

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ." (الاعراف:۲۰۴)

ترجمہ:... "اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو، امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔" (بیان القرآن)

فاتحہ خلف الامام کی بحث میں شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آیت نماز اور خطبے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، چنانچہ وہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"اور سلف سے استفاضہ و شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت قراءۃ فی الصلوٰۃ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور بعض کا قول ہے کہ خطبے کے بارے میں نازل ہوئی، اور امام احمد رحمہ اللہ

besturdubooks.wordpress.com

نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ نماز اور خطبے کے بارے میں نازل
ہوئی۔" (ج:۲۲ طبع قدیم ص:۱۲۲، طبع جدید ص:۲۹۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"امام احمد رحمہ اللہ نے اس پر لوگوں کا اجماع ذکر کیا ہے
یہ آیت نماز اور خطبے کے بارے میں نازل ہوئی۔"

(ج:۲۲ ص:۲۷۲، ص:۳۱۲)

پس جب یہ آیت کریمہ نماز اور خطبے دونوں سے متعلق ہے، اور امام احمد رحمہ اللہ
اس پر لوگوں کا اجماع نقل کرتے ہیں تو قرآن کی نصِ قطعی سے خطبے کا استماع اور اس کے
لئے خاموش رہنا واجب ہوا، اور ہر ایسا قول و فعل ممنوع ٹھہرا جو استماع و انصات کے منافی
ہو۔ راز اس کا یہ ہے کہ خطبہ چونکہ قرآنی آیات پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے پورے خطبے کو
"ذکر" فرماکر اس کے استماع کو واجب فرمایا گیا ہے، اور پھر خطیب کی حیثیت چونکہ
خدائی ترجمان کی ہوتی ہے، جو لوگوں کو احکامِ خداوندی سنا رہا ہے، اس لئے حاضرین کو
گوش بر آواز رہنے کا حکم دے کر ہر ایسی حرکت کو ممنوع قرار دیا گیا جو خطبے کی سماعت میں مخل
ہو، اور جو شخص اس موقع پر استماع کے منافی حرکت کرے اس کو لغو کا مرتکب، اور جمعہ میں
اس کی حاضری کو باطل و بے کار اور ثواب سے محروم فرمایا، کیونکہ خطبے میں دو طرفہ عمل ہے،
خطیب کی طرف سے اسماع یعنی احکامِ خداوندی کا سنانا، اور حاضرین کی طرف سے
استماع یعنی سننا اور خاموش رہنا، پس حاضرین میں سے جو شخص فریضۂ استماع سے سرتابی
کرتا ہے، وہ گویا خطیب اور خطبے کا استخفاف کر رہا ہے کہ خطیب اس کو احکامِ خداوندی سنا رہا
ہے، مگر یہ اس کو سنتا نہیں، بلکہ کسی دوسرے شغل میں مصروف ہے، شاید اسی بنا پر حدیث
ابنِ عباسؓ میں ایسے شخص کو گدھے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (مشکوٰۃ ج:۱ ص:۱۲۳)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خطبے کی حیثیت محض وعظ و تذکیر کی نہیں،
بلکہ اس میں ایک گونہ نماز کی شان پائی جاتی ہے، شاید یہی حکمت ہے کہ خطبے کو صحتِ جمعہ کے
لئے شرط قرار دیا گیا ہے، اور شاید اسی سے بعض سلف نے یہ سمجھا ہے کہ جس شخص سے خطبہ

فوت ہوجائے اس کا جمعہ نہیں ہوتا، بلکہ اسے ظہر کی چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

"اَلْخُطْبَةُ مَوْضِعُ الرَّكْعَتَيْنِ، مَنْ فَاتَتْهُ الْخُطْبَةُ صَلّٰى أَرْبَعًا۔" (مصنف عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۳۷، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۱۲۸)

ترجمہ:... "جمعہ کا خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے، جس سے خطبہ فوت ہوجائے، وہ چار رکعتیں پڑھے۔"

اور طاؤس، مجاہد اور عطاء (تابعین) رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے:

"فَمَنْ لَّمْ يُدْرِكِ الْخُطْبَةَ صَلّٰى أَرْبَعًا۔"

(عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۳۸، ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۱۲۸)

ترجمہ:... "جس نے خطبہ نہیں پایا، وہ چار رکعتیں پڑھے۔"

اگرچہ جمہور اُمت کے نزدیک ایسے شخص کو جمعہ کی دو ہی رکعتیں پڑھنی ہوں گی، لیکن ان آثار سے خطبہ جمعہ کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

الغرض آیت موصوفہ میں خطبہ جمعہ کے استماع کو لازم قرار دیا گیا ہے، لہٰذا خطبے کے دوران صلوٰۃ و کلام، جو استماع کے منافی ہیں، اس آیت کریمہ کی رُو سے ممنوع ہوں گے۔

احادیثِ نبویہ:

اور یہی مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث میں مذکور ہے، چنانچہ:

۱:... حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:

"لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ وَيَمَسُّ مِنْ طِيْبِ بَيْتِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، ثُمَّ يُصَلِّيْ مَا كُتِبَ لَهُ، ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى۔" (صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲۱)

besturdubooks.wordpress.com

ترجمہ:… "جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور خوب صفائی کرے، تیل لگائے، اور گھر میں خوشبو ہو تو وہ لگائے، پھر جمعہ کے لئے نکلے تو دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھے، پھر جتنی نماز اس کے لئے مقدر ہے، پڑھے، پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو خاموش رہے، تو ایسے شخص کے اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

۲:… اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ الفاظ مروی ہیں:

"فصلّٰی ما قُدِّرَ لَهٗ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ." (ص:۲۸۳)

ترجمہ:… "پھر جتنی نماز اس کے لئے مقدر تھی، پڑھی، پھر خاموش رہا یہاں تک کہ امام خطبے سے فارغ ہو گیا۔"

۳:… حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی حدیث مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ثُمَّ خَرَجَ حَتّٰی یَأْتِیَ الْمَسْجِدَ فَیَرْکَعَ إِنْ بَدَا لَهٗ وَلَمْ یُؤْذِ أَحَدًا، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتّٰی یُصَلِّیَ."

(رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر، ورجالہ ثقات، مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۷۱)

ترجمہ:… "پھر مسجد کی طرف نکلا، پس نماز پڑھتا رہا جس قدر جی چاہا، اور کسی کو ایذا نہیں دی، پھر نماز جمعہ ختم ہونے تک خاموش رہا۔"

۴:… اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"وَرَکَعَ مَا قُضِیَ لَهٗ ثُمَّ انْتَظَرَ حَتّٰی یَنْصَرِفَ الْإِمَامُ."

(رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر، عن حرب بن قیس عن ابی الدرداء، وحرب لم یسمع من ابی الدرداء۔ ج:۲ ص:۱۷۱)

besturdubooks.wordpress.com

"المسجد، لا یؤذی أحدًا، فان لم یجد الامام خرج صلّٰی ما بدا لہ، وان وجد الامام قد خرج جلس فاستمع وانصت حتّٰی یقضی الامام جمعتہ وکلامتہ .... الخ۔"

(رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح خلا شیخ احمد وھو ثقۃ، مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۷۱)

ترجمہ: ... "مسلمان جب جمعہ کے دن غسل کرے مسجد کی طرف چلے کسی کو ایذا نہ دے، پھر اگر دیکھے کہ امام ابھی نکلا نہیں تو جتنی چاہے نماز پڑھتا رہے، اور اگر دیکھے کہ امام نکل آیا ہے تو بیٹھ جائے، سنتا رہے اور خاموش رہے، یہاں تک کہ امام خطبہ و نماز سے فارغ ہوجائے۔"

۹: ... اور طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

"اذا دخل أحدکم المسجد والامام علی المنبر فلا صلٰوۃ ولا کلام حتّٰی یفرغ الامام۔"

(وفیہ ایوب بن نھیک، وھو متروک، ضعفہ جماعۃ، وذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال یخطئ۔ مجمع الزوائد ج:۲ ص:۱۸۴)

ترجمہ: ... "جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں اس وقت داخل ہو جبکہ امام منبر پر ہو تو نماز اور کلام نہیں، جب تک امام فارغ نہ ہوجائے۔"

اس روایت کا ایک راوی اگرچہ مختلف فیہ ہے، جیسا کہ علامہ ہیثمی نے ابن حبان سے اس کی توثیق بھی نقل کی ہے، لیکن اس میں ٹھیک وہی مضمون ہے جو قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اوپر آچکا ہے۔

علاوہ ازیں متعدد، بلکہ متواتر احادیث میں یہ مضمون وارد ہے کہ خطبہ کی حالت

ترجمہ:... "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ جمعہ کے دن نماز پڑھتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لاتے، پس جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لاکر منبر پر بیٹھ جاتے اور مؤذن اذان کہتے، تو ہم بیٹھے بیٹھے بات کرلیا کرتے تھے، پھر جب مؤذن خاموش ہوجاتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبے کے لئے کھڑے ہوجاتے تو ہم خاموش ہوجاتے، پس ہم میں سے کوئی شخص کلام نہ کرتا۔ ابن شہابؒ فرماتے ہیں: پس امام کا نکلنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کردیتا ہے۔"

مصنف ابن ابی شیبہ میں ثعلبہ بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"أَدْرَكْتُ عُمَرَ وَعُثْمَانَ فَكَانَ الْإِمَامُ إِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ تَرَكْنَا الصَّلٰوةَ۔" (ج:۲ ص:۱۰۱)

ترجمہ:... "میں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا زمانہ پایا، پس جب امام جمعہ کے دن خطبے کے لئے نکل آتا تو ہم نماز چھوڑ دیتے تھے۔"

۵:... نصب الرایہ (ج:۲ ص:۲۰۲) میں مسند اسحاق بن راہویہ سے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"كُنَّا نُصَلِّيْ فِيْ زَمَنِ عُمَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَإِذَا خَرَجَ عُمَرُ وَجَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ قَطَعْنَا الصَّلٰوةَ، وَكُنَّا نَتَحَدَّثُ وَيُحَدِّثُوْنَنَا، وَرُبَّمَا نَسْأَلُ الرَّجُلَ الَّذِيْ يَلِيْهِ عَنْ سُوْقِهٖ وَمَعَاشِهٖ، فَإِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ خَطَبَ وَلَمْ يَتَكَلَّمْ أَحَدٌ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ۔" (نصب الرایہ ج:۲ ص:۲۰۲)

ترجمہ:... "ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمعہ کے دن نماز پڑھتے تھے، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لا

بِسُنَّةٍ، إِنْ شَاءَ أَعْطَاهُ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُ." (ج:۳ ص:۲۰۲)

ترجمہ: "اور تیسرا وہ شخص جس نے امام کے نکلنے کے بعد نماز پڑھی، جس کی یہ نماز سنت کے مطابق نہیں، اب اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو (ثواب) دے اور چاہے تو نہ دے۔"

۵:... ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ خطبے کے دوران کوئی نماز پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا: اگر سبھی پڑھنے لگیں تو کیا یہ ٹھیک ہوگا؟ (مصنف عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۴۵)

۶:... ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ امام کے نکلنے سے پہلے نماز پڑھتے تھے، امام کے آنے کا وقت ہوتا تو نماز نہیں پڑھتے تھے، بیٹھ جاتے تھے۔ (ایضاً ص:۲۱۰)

۷:... مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے:

"أَنَّهُمَا كَانَا يَكْرَهَانِ الصَّلٰوةَ وَالْكَلَامَ بَعْدَ خُرُوْجِ الْإِمَامِ." (ج:۲ ص:۱۱۱)

ترجمہ: "یہ حضرات امام کے نکلنے کے بعد صلوٰۃ و کلام کو مکروہ سمجھتے تھے۔"

۸:... امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"الصَّلٰوةُ وَالْإِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ مَعْصِيَةٌ."

(طحاوی ج:۱ ص:۲۴۳)

ترجمہ: "جب امام منبر پر ہو اس وقت نماز پڑھنا گناہ ہے۔"

۹:... اور حضرت ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

"جُلُوْسُ الْإِمَامِ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ وَكَلَامُهُ يَقْطَعُ الْكَلَامَ."

ترجمہ: "امام کا منبر پر بیٹھنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو منقطع کردیتا ہے۔"

۱۰... حاشیہ السنن (ج:۲ ص:۱۲۸) میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خطبے کے دوران نماز پڑھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

۱۱... مصنف عبدالرزاق میں سیدالتابعین حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

"خروج الامام یقطع الصلٰوۃ، وکلامہ یقطع الکلام۔" (عبدالرزاق ج:۳ ص:۲۰۸)

ترجمہ:... "امام کا نکلنا نماز کو، اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کردیتا ہے۔"

۱۲... مصنف عبدالرزاق (ج:۳ ص:۲۴۵) اور ابن ابی شیبہ (ج:۲ ص:۱۱۱) میں قاضی شریح رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ خطبے کے دوران نماز کے قائل نہیں تھے۔

۱۳... مصنف عبدالرزاق (ج:۳ ص:۲۴۵، ۲۴۶) میں قتادہ اور عطاء رحمہما اللہ سے یہی نقل کیا ہے۔

۱۴... مصنف ابن ابی شیبہ میں ابن سیرین، عروہ بن زبیر اور زہری رحمہم اللہ سے ممانعت نقل کی ہے۔

سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

سوال میں حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کے جس واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کے بارے میں چند امور پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔

۱... یہ تو اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ قرآن کریم نے خطبے کے استماع و انصات کو فرض قرار دیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متواتر ارشادات میں بھی اس کی تاکید فرمائی گئی ہے، خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) قرآن و سنت کے انہی نصوص کے پیش نظر خطبے کے دوران صلوٰۃ و کلام کے قائل نہیں تھے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ان سے مخفی نہیں تھا، لیکن انہوں نے اس واقعے کو

besturdubooks.wordpress.com

علم روایات کے ذریعہ ہوا، مگر یہ اکابر اس واقعے کے عینی شاہد تھے، یہ واقعہ جمعہ کے اجتماعِ عام میں پیش آیا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ سے جو کچھ ارشاد فرمایا، برسرِ منبر ارشاد فرمایا تھا، اس لئے یہ تاویل تو ممکن نہیں کہ ان حضرات کو اس واقعے کا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا علم نہیں ہوگا۔

اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ حضرات دیدہ و دانستہ، بغیر کسی معقول وجہ کے حدیثِ نبوی کو ترک کردیں، اور نصِ نبوی کے خلاف کے قائل ہوجائیں، کیونکہ اگر اس احتمال کو تسلیم کرلیا جائے تو حضرات خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم کے دین و دیانت پر ہی سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے، یہ احتمال کسی رافضی ذہن میں تو آسکتا ہے، مگر صحیح العقیدہ مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اکابر ہم لوگوں سے بڑھ کر متبعِ سنت اور حسنات کے حریص تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ کو جو حکم فرمایا، اگر یہ سب کے لئے عام ہوتا تو ناممکن تھا کہ تمام صحابہ کرامؓ، خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اس حکم پر عمل چھوڑ دیتے، اور اس کار ثواب سے نہ صرف خود محروم رہا کرتے، بلکہ دوسروں کو بھی منع کیا کرتے۔

۲:... مندرجہ بالا حقائق بالکل صاف اور بدیہی ہیں، جن سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان اکابر نے جو اس حدیث پر عمل نہیں فرمایا تو اس کی کوئی معقول اور صحیح وجہ ہوگی، رہا یہ سوال کہ وہ وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب صرف ہمارے ذمے نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں کے ذمے ہے جو صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حق و صداقت کے علم بردار سمجھتے ہیں، اور جن کا ذہن رفض کے شائبے سے پاک ہے، اگر کسی حدیث کی مخالفت کا الزام امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر ہو تو اس کی جواب دہی تو مان لیجئے کہ صرف حنفیوں کا فرض ہے، لیکن خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تو صرف حنفیوں کے نہیں، اگر کسی حدیث کی مخالفت کا الزام خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پر آتا ہے تو اس کی جواب دہی ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجانی چاہئے کہ خبرِ واحد کی حجیت زیادہ ہے یا خلفائے راشدین اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل کی؟ یعنی جب خلفائے

راشدین اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم کا تعامل کسی خبرِ واحد کے خلاف ہو (جیسا کہ زیرِ بحث مسئلے میں) تو خبرِ واحد کو واجب العمل قرار دے کر ان اکابر کو معاذ اللہ مجرم ٹھہرایا جائے گا؟ یا یہ کہ ان اکابر کے تعامل کی روشنی میں خود خبرِ واحد کو لائقِ تاویل تصور کیا جائے گا...؟ پہلا راستہ رفض و بدعت کی طرف جاتا ہے، اور دوسرا "ما انا علیہ واصحابی" کی طرف۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جونسا راستہ چاہے اختیار کرلے...!

۳:... ان اکابر نے سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کی روایت کو جو معمول بہا نہیں سمجھا، ہمارے نزدیک اس کی بلاتکلف دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ حضرات جانتے تھے کہ سلیکؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھنے کا جو حکم فرمایا ہے، یہ عام حکم نہیں، بلکہ یہ صرف انہی کے لئے ایک خصوصی و استثنائی حکم ہے۔

دوم یہ کہ ان حضرات کو معلوم تھا کہ اس واقعے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے دوران صلوٰۃ و کلام سے ممانعت فرمائی ہے، اس لئے اب اس کا جواز باقی نہیں رہا۔

۴:... پہلی توجیہ یعنی یہ کہ اس واقعے کو خصوصیت پر محمول کیا جائے، اس کے قرائن مندرجہ ذیل ہیں:

الف:... خصوصیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کی حاضری خطبے کے دوران ہوئی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دو رکعت ادا کرنے کا حکم نہیں فرمایا، مثلاً:

۱:... صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۳۷) "باب الاستسقاء فی المسجد الجامع" میں ان صاحب کا واقعہ مذکور ہے جنھوں نے خطبے کے دوران آتے ہی بارش کی دعا کی درخواست کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۲:... پھر اسی روایت میں اس شخص کے آئندہ جمعہ آنے کا ذکر ہے، اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہیں فرمایا۔

۳:... ابوداؤد (ج:۱ ص:۱۵۶) "باب الامام یکلم الرجل فی خطبتہ" میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے دوران فرمایا: "بیٹھ جاؤ!" حضرت

besturdubooks.wordpress.com

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ابھی مسجد کے دروازے سے باہر تھے کہ ارشاد گرامی سن کر وہیں بیٹھ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک ان پر پڑی تو ان سے فرمایا: "ابن مسعود! اندر آجاؤ"۔ مگر ان کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۳:... ابوداؤد (ج:۱ ص:۱۵۹) اور نسائی (ج:۱ ص:۲۰۷) میں اس شخص کا واقعہ مذکور ہے جو خطبے کے دوران لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آرہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: "اجلس، فقد اذیت" "بیٹھ جا! تو نے ایذا دی ہے" اور اسے دو رکعتوں کا حکم نہیں فرمایا۔

ب:... روایات اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کے بیٹھ جانے کے بعد انہیں دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تھا، حالانکہ بیٹھ جانے کے بعد تحیۃ المسجد ساقط ہو جاتا ہے، اور جو شخص مسجد میں بیٹھا ہو اس کے لئے خطبے کے دوران نوافل پڑھنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، یہی قرینہ ہے کہ یہ خصوصی و استثنائی حکم تھا ورنہ اس کے بیٹھ جانے کے بعد (اور وہ بھی خطبے کے دوران) اسے نماز پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

ج:... بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی منبر پر تشریف فرما ہوئے تھے کہ سلیک رضی اللہ عنہ آکر بیٹھ گئے، گویا ان سے گفتگو خطبے کے دوران نہیں، بلکہ خطبہ شروع کرنے سے پہلے ہوئی، چنانچہ صحیح مسلم (ج:۱ ص:۲۸۷) میں ہے:

"جَاءَ سُلَيْكٌ الْغَطَفَانِيُّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَرَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَقَعَدَ سُلَيْكٌ قَبْلَ أَنْ يُّصَلِّيَ .... الخ."

ترجمہ:... "سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن اس وقت آئے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے تھے، پس سلیک نماز پڑھنے سے پہلے بیٹھ گئے۔"

امام نسائی رحمہ اللہ نے سنن کبریٰ میں اس روایت پر یہ باب باندھا ہے: "باب الصلوٰۃ قبل الخطبۃ" (خطبے سے پہلے نماز کا بیان)۔ (نصب الرایہ ج:۲ ص:۲۰۳)

نیز یہ بھی کہا ہے کہ سلیک رضی اللہ عنہ جب تک دوگانہ سے فارغ نہیں ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع نہیں فرمایا، چنانچہ دارقطنی (ص:۱۴۹) کی روایت میں ہے:

"فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قُمْ! فَارْكَعْ رَكْعَتَيْنِ، وَأَمْسَكَ عَنِ الْخُطْبَةِ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ صَلٰوتِهٖ."

ترجمہ... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اٹھو! دو رکعتیں پڑھو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبے سے رکے رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہوگئے۔"

امام دارقطنی رحمہ اللہ اس روایت کو مسند اور مرسل دونوں طرح روایت کرکے لکھتے ہیں کہ: مرسل صحیح ہے، مرسل روایت جب صحیح ہو تو عام اہل علم کے نزدیک حجت ہے، اور اگر اس کے طرق متعدد ہوں یا اس کی مؤید کوئی اور روایت موجود ہو تو تمام اہل علم کے نزدیک حجت ہے۔ یہاں یہی آخری صورت ہے، چنانچہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ایک اور روایت بھی (بطریق ابومعشر عن محمد بن قیس) اس کی مؤید نقل کی ہے، یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ اَمَرَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ اَمْسَكَ عَنِ الْخُطْبَةِ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ رَكْعَتَيْهِ، ثُمَّ عَادَ اِلٰى خُطْبَتِهٖ." (ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۱۱۰)

ترجمہ... "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلیک کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تو خطبہ سے رُک گئے، یہاں تک کہ جب وہ اپنی دو رکعتوں سے فارغ ہوئے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کی طرف رجوع فرمایا۔"

اس روایت کے راوی کو دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، مگر یہ روایت اوپر کی مرسل صحیح کو مزید تائید فراہم کرتی ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

نیز یہ بھی آتا ہے کہ حضرت سلیک رضی اللہ عنہ چونکہ بہت ہی خستہ اور قابلِ رحم حالت میں آئے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انہیں صدقہ دینے کی ترغیب دلائی، چنانچہ حاضرین نے اپنے کپڑے اتار کر پیش کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے دو کپڑے ان کو مرحمت فرمائے۔ (نسائی ج:۱ ص:۲۰۸)

غالباً اس سے فارغ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع فرمایا ہوگا، جس کا تذکرہ اوپر دارقطنی اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں آیا ہے۔

پس یہ تمام امور جو اس واقعے میں پیش آئے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلیک رضی اللہ عنہ کے دوگانہ ادا کرنے تک خطبہ روک دینا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو چندے کی ترغیب دینا، اور صحابہ کرام کا کپڑے اتار اتار کر پیش کرنا، یہ خطبے کے عام معمول کے خلاف ہیں، اور انہیں خصوصیت ہی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اگر اس کے باوجود کسی کو اصرار ہو کہ یہ سلیک رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں، بلکہ خطبے کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنا ہر شخص کے لئے عام سنت ہے، تو ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر خطبے کے دوران دو رکعتیں پڑھنا حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کی سنت ہے تو ایسے شخص کے لئے خطیب کا خطبے کو روک دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے! لہٰذا خطیب کا فرض ہے کہ تحیۃ المسجد پڑھنے والوں کی رعایت فرماتے ہوئے خطبہ روک کر سنتِ نبوی پر عمل کیا کریں۔ یہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ مقتدی تو سنتِ سلیکؓ پر عمل کریں، اور خطیب صاحب پر سنتِ نبوی کی پابندی لازم نہ ہو۔ اور ہاں! حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کی سنت پر بھی جب پورا عمل ہوگا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں مسجد میں آکر بیٹھ جایا کریں، پھر خطیب صاحب ان کو دوگانہ ادا کرنے کا حکم کریں، پھر ان کے دوگانہ ادا کرنے کے دوران خطبہ روکے رکھیں، پھر حاضرین سے ان کے لئے چندہ بھی کیا کریں، تب دوبارہ خطبہ شروع ہوا کرے...!

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیک رضی اللہ عنہ نے بھی دوگانہ عین خطبے کے دوران ادا نہیں فرمایا تھا، کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاطر خطبہ روک دیا تو یہ دورانِ خطبہ کی حالت نہ رہی۔ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے دوبارہ دو رکعتیں پڑھوانا بھی کسی خصوصی مصلحت کی بنا پر ہوگا ورنہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر صحابہؓ سے نہیں پڑھواتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ حضرات خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم) نے جو سلیک رضی اللہ عنہ کی روایت کو تشریعِ عام نہیں سمجھا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود قرائن اس کی خصوصیت کے موجود ہیں۔

۵:... اور دوسری وجہ ان اکابر کی اس روایت کو معمول بہا نہ سمجھنے کی یہ ہوسکتی ہے کہ خطبے کے دوران نماز و کلام کی ممانعت بعد میں ہوئی ہوگی، ہمارے سامنے تو قرآن کریم اور حدیث نبوی کا ذخیرہ بیک وقت پورے کا پورا موجود ہے، اس لئے ہمیں تو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون سی آیت پہلے اتری اور کون سی بعد میں؟ کون سا ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا؟ اور کون سا بعد میں؟ نقل و روایت کی ضرورت ہے، لیکن حضرات خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے آیاتِ قرآن کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی ترتیب مشاہدے کی چیز تھی، وہ جانتے تھے کہ کون سی آیت کب؟ اور کہاں نازل ہوئی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا ارشاد کس موقع پر فرمایا تھا؟ کون سا حکم پہلے تھا؟ کون سا حکم بعد میں؟ الاتقان (النوع الثمانون) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا:

"سَلُوْنِیْ، فَوَاللهِ لَا تَسْأَلُوْنَ عَنْ شَیْءٍ إِلَّا أَخْبَرْتُکُمْ، وَسَلُوْنِیْ عَنْ کِتَابِ اللهِ، فَوَاللهِ مَا مِنْ آیَةٍ إِلَّا وَأَنَا أَعْلَمُ أَبِلَیْلٍ نَزَلَتْ أَمْ بِنَهَارٍ؟ أَمْ فِیْ سَهْلٍ أَمْ فِیْ جَبَلٍ؟"

(ج:۲ ص:۱۸۷)

ترجمہ:... "مجھ سے پوچھو! پس اللہ کی قسم! تم مجھ سے کوئی چیز نہیں پوچھو گے مگر میں تم کو اس کے بارے میں خبر دوں گا، اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوال کرو، پس اللہ کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں یہ نہ جانتا ہوں کہ رات

besturdubooks.wordpress.com

میں اتری کی رات میں! اور میدان میں اتری یا پہاڑ پر؟"

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"والذی لا الٰہ غیرہ! ما نزلت آیۃ من کتاب اللہ

الا وانا اعلم فیمن نزلت واین نزلت۔" (ایضاً)

ترجمہ:... "اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں!

کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم

نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟"

پس جب یہ اکابر ایک روایت کے مقابلے میں ان نصوص پر عمل فرماتے ہیں جن میں خطبے کے دوران کلام و نماز کی ممانعت کی گئی ہے، تو یہ روایت اگر خصوصیت پر محمول نہیں تو لامحالہ متروک العمل ہوگی۔

۷:... جو حضرات حدیث سلیکؓ سے استدلال کرتے ہوئے خطبے کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنے پر زور دیتے ہیں، انہیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ تحیۃ المسجد عام حالات میں بھی مستحب ہے، اور خطبہ کا سننا فرض ہے، کیا مستحب کی خاطر فرض کو ترک کرنا جائز ہے؟ اور پھر اگر تحیۃ المسجد پڑھنے کی صورت میں ایک حدیث پر عمل کرنے سے گڑبڑی لازم آتی ہے، تو فرض استماع و انصات کو چھوڑنے سے قرآن کریم، احادیثِ متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے متفق علیہ مسئلے کی مخالفت لازم آتی ہے، کیا ایک حدیث کی خاطر قرآن کریم، احادیثِ متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے تعامل سے انحراف جائز ہے...؟

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

سوال میں ترمذی کے حوالے سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کر کے اس کی مخالفت کو "مروانی بدعت" کہا گیا ہے۔ یہ تو اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ مروانی حکم نہیں، بلکہ قرآنی حکم ہے، اور مروانی بدعت نہیں، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت ہے، جو بات قرآن کریم، سنتِ متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے تعامل سے ثابت ہو، اسے محض اس بنا پر

"مروانی بدعت" کہا کہ مروان بھی جس کا قائل تھا، نکیر صحیح ہوگا؟ شاید یہ حضرات کل خطبۂ
جمعہ کو بھی "مروانی بدعت" فرمادیں...!

رہا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا دوگانہ پڑھنے پر اصرار فرمانا، تو اس کی
دلیل میں انہوں نے نبی کی حضرت سلیک کا واقعہ پیش کیا ہے، اور اسی سے دوگانہ کا جواز
استنباط فرمایا ہے، جبکہ خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے خلاف فتویٰ
دیتے ہیں۔ اب اہل فہم انصاف فرمائیں کہ ہمیں کون سا مسلک اختیار کرنا چاہئے...؟

اور اس ناکارہ کے خیال میں تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا اس موقع پر
اصرار کسی اور ہی بات کی غمازی کرتا ہے، تشریح اس کی یہ ہے کہ امرائے جور کے زمانے میں
سلف میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا کہ اگر امام خطبے میں ذکر کو چھوڑ کر غیر متعلق قسم کی باتیں
کرنے لگے تو کیا اس کا استماع بھی لازم ہے؟ بعض اکابر کی رائے تھی کہ امام چونکہ ذکر
سے خارج ہوگیا، اور استماع صرف ذکر کا لازم ہے، نہ کہ اس کی غیر متعلق باتوں کا، اس
لئے اس وقت اس کے خطبے کی حرمت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق (ج:۳
ص:۲۲۶) میں ہے کہ حجاج بن یوسف خطبہ دے رہا تھا، اور امام شعبی اور ابوبردہ رحمہما اللہ
باتیں کر رہے تھے، ان سے عرض کیا گیا کہ آپ خطبے کے دوران باتیں کر رہے تھے؟ تو
فرمایا: ہمیں ایسی باتوں کے سننے کے لئے خاموشی کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ
(ج:۲ ص:۱۲۶) میں اسی نوعیت کا واقعہ حضرت ابراہیم نخعی اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما کا
نقل کیا گیا ہے، پس کیا بعید ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو بھی ایسی صورت
پیش آئی ہو، اور انہوں نے اس وقت نماز شروع کردی ہو، اس صورت میں ان کا حدیث
سلیک کا حوالہ دینا بھی برمحل ہے کہ جیسے ان کے دوگانہ ادا کرتے وقت خطبہ منقطع ہوگیا تھا،
اسی طرح یہاں بھی انقطاعِ خطبہ کی حالت میں دوگانہ ادا کیا، واللہ اعلم بالصواب!

اللہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

"واعلم اولًا ان الجمعة فريضة محكمة
والاجماع يكفر جاحدها." (ج:۱ ص:۴۰۷)

ترجمہ:... "سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جمعہ
کتاب و سنت اور اجماع کی رو سے محکم فریضہ ہے، اور اس کی
فرضیت کا منکر کافر ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فرضیت کا انکار کفر ہے، اگر کچھ لوگ حنفیہ کو "فرضیتِ جمعہ کا منکر" کہتے ہیں، جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے، تو اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ وہ اپنی کم فہمی کی وجہ سے ایک گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہیں، کیونکہ کسی مسلمان کو "کفر" کی طرف منسوب کرنا وبالِ عظیم ہے، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: یہ کفر کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس وبال سے محفوظ فرمائیں۔

۲:... ائمہ کا جہاں اس پر اتفاق ہے کہ جمعہ فرضِ عین ہے، وہاں اس پر بھی اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز تمام نمازوں کی طرح نہیں، بلکہ اس کی ایک خاص شان ہے، اور اس کے لئے خاص شرائط ہیں، ایک شرط جماعت ہے اور دوسری شرط ایک خاص نوعیت کی "آبادی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبادی سے دور جنگل میں جمعہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" (ص:۲۰۲) میں لکھتے ہیں:

"وقد تلقت الامة تلقيًا معنويًا من غير تلقي لفظ
انه يشترط في الجمعة الجماعة ونوع من التمدن.
وكان النبي صلى الله عليه وسلم وخلفاؤه رضي
الله عنهم والائمة المجتهدون رحمهم الله تعالى يجمعون
في البلدان ولا يؤاخذون اهل البدو، بل ولا يقام في
عهدهم في البدو، ففهموا من ذلك قرنًا بعد قرن
وعصرًا بعد عصر انه يشترط لها الجماعة والتمدن."

besturdubooks.wordpress.com

"يشترط لها الجماعة۔"　　　(ج:۱ ص:۱۵۵)

ترجمہ:... "اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جمعہ فرض عین ہے، اور یہ کہ اس کے لئے جماعت شرط ہے۔"

۳:... حنفیہ کے نزدیک جمعہ یا تو شہر میں ہوتا ہے یا "قریۂ کبیرہ" میں، جس کی حیثیت قصبے کی ہو، اور شہر اور قصبے کے گرد و پیش کی وہ بستیاں جو اس کی ضروریات کے لئے ہوں، اسے "فنائے مصر" کہا جاتا ہے، چونکہ وہ بھی شہر اور قصبے کے ساتھ ملحق ہے، اس لئے اس میں بھی جمعہ جائز ہے، شہروں اور قصبوں کے علاوہ چھوٹے دیہات میں جمعہ جائز نہیں۔

حنفیہ کا مسلک بھی (دیگر مسائل کی طرح) قرآن و سنت سے ثابت اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کے عین مطابق ہے۔

قرآن کریم:

سورۂ جمعہ میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔"

ترجمہ:... "اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو، اور خرید و فروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں) چھوڑ دیا کرو، یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو۔"　　　(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

جمعہ کی اذان سن کر تمام کاروبار چھوڑ دینا واجب ہے، اور آیت کریمہ میں خرید و فروخت چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ جمعہ ایسی جگہ ہونا چاہئے جہاں بازار ہے، جہاں کے لوگ عموماً تجارت و سوداگری اور خرید و فروخت میں مشغول رہتے ہیں، اور جہاں چھوٹی بڑی روزمرہ کی ضروریات خرید و فروخت کے لئے مہیا رہتی ہیں، شہروں اور

دیہاتوں میں یہی فرق ہے کہ شہروں میں تجارت ہوتی ہے، دیہات میں نہیں، پس جہاں
وہاں ہوگا جہاں تجارتی مرکز ہوں، وہ شہر یا قصبہ کہا جاتا ہے۔

سنتِ نبوی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دورِ نبوی میں جمعہ صرف شہروں ہی میں ہوتا تھا، دیہاتی آبادیوں میں نہیں ہوتا تھا، چنانچہ:

۱:... جمعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے قبل فرض ہوچکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ طیبہ میں شروع بھی ہوچکا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں جمعہ نہیں ادا فرماسکے، جیسا کہ علامہ شوکانی نے "نیل الاوطار" (ج:۳ ص:۲۳۱) میں، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" (ج:۱ ص:۹۹) میں، اور حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے "الاتقان" (ج:۱ ص:۳۰، نوع ثانی عشر) میں اس کی تصریح کی ہے۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں پیر کے دن (۱۲ ربیع الاول کو) تشریف لائے، اور دس روز سے زیادہ قیام فرمایا۔ (صحیح بخاری ج:۱ ص:۵۵۵) صحیح بخاری کی ایک روایت میں چودہ دن قیام کی تصریح ہے (ج:۱ ص:۶۱) اور ایک نسخے میں چوبیس دن کا ذکر ہے (ج:۱ ص:۹۰)۔ اگر چودہ دن کی مدت صحیح ہو تب بھی ظاہر ہے کہ کم از کم دو جمعے ضرور آئے ہوں گے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں جمعہ قائم نہیں فرمایا، نہ اہلِ قبا کو جمعہ پڑھنے کا حکم فرمایا، بلکہ مدینہ طیبہ پہنچ کر جمعہ کا آغاز فرمایا۔ اس سے واضح ہے کہ چھوٹی بستی میں جمعہ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ دورِ نبوی میں قبا میں جمعہ نہیں ہوا۔

۲:... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حجِ اکبر بالاجماع جمعہ کو ہوا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ عرفات میں جمعہ نہیں پڑھا، اور نہ اہلِ مکہ کو وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اس سے واضح ہے کہ ہر جگہ جمعہ صحیح نہیں، بلکہ اس کے لئے خاص قسم کی آبادی شرط ہے۔

۳:... صحیح بخاری (ج:۱ ص:۱۲۳) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"کان الناس ینتابون الجمعة من منازلھم والعوالی۔"

ترجمہ:... لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اور عوالی سے جمعہ

پڑھیں گے، جو چاہے ہمارے ساتھ جمعہ پڑھے، اور جو چاہے واپس اپنے گھر لوٹ جائے۔" مراد اس سے اہلِ عوالی کو اجازت دینا تھا، کیونکہ جمعہ ان پر فرض نہیں تھا، جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار (ج:۲ ص:۵۸) میں فرمایا ہے، اور مصنف عبدالرزاق (ج:۳ ص:۱۶۳) میں مرسل ابنِ جریج سے اس کی تصریح آئی ہے:

"فَأَذِنَ لِلْأَنْصَارِ فِي الرُّجُوْعِ إِلَى الْعَوَالِي وَتَرْكِ الْجُمُعَةِ، فَلَمْ يَزَلِ الْأَمْرُ عَلَى ذٰلِكَ بَعْدُ."

ترجمہ:... "پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو عوالی لوٹ جانے اور جمعہ چھوڑ دینے کی اجازت مرحمت فرمائی، اور پھر ہمیشہ یہی تعامل رہا۔"

ان تمام احادیث سے ثابت ہے کہ دورِ نبوی میں جمعہ صرف شہروں میں ہوتا تھا، دیہات میں کبھی جمعہ نہیں ہوا۔

سلفِ صالحینؒ کا تعامل:

۱:... صحیح بخاری (ج:۲ ص:۸۳۵)، موطا امام مالکؒ (ص:۶۳) میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خطبۂ عید میں فرمایا: "آج تمہارے لئے دو عیدیں جمع ہوگئی ہیں، اہلِ عوالی میں سے جو شخص جمعہ پڑھنا چاہتا ہے، وہ جمعہ کا انتظار کرے، اور جو واپس جانا چاہتا ہے، اس کو واپسی کی اجازت ہے۔" امام محمد رحمہ اللہ موطا (ص:۱۲۹) میں فرماتے ہیں: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہلِ عوالی کو اس لئے اجازت دی کہ وہ شہر کے لوگ نہیں تھے۔" اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مسوّیٰ شرح فارسی موطا میں اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے: "عوالی میں جمعہ جائز نہیں، اور اہلِ عوالی میں سے جو لوگ شہر میں آئیں، ان کو وقتِ جمعہ سے پہلے واپس جانے کی اجازت ہے۔" اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی عمل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیہاتیوں کو کبھی اقامتِ جمعہ کا مکلف نہیں بنایا۔" (ج:۱ ص:۱۵۳، ۱۵۴)

بیس تراویح کا مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:... ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ تراویح کی آٹھ رکعتیں ہی سنت ہیں، کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب دریافت کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز رمضان میں کیسی ہوتی تھی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان وغیرہ میں آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھائے۔

اس کے خلاف جو روایت بیس رکعت پڑھنے کی نقل کی جاتی ہے، وہ بالاتفاق ضعیف ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی گیارہ رکعت ہی کا حکم دیا تھا، جیسا کہ موٴطا امام مالک میں صحیح سند سے مروی ہے، اور اس کے خلاف جو روایت ہے، اوّل تو صحیح نہیں، اور اگر صحیح بھی ہو تو ہوسکتا ہے کہ پہلے انہوں نے بیس پڑھنے کا حکم دیا ہو، پھر جب معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت پڑھی ہیں تو سنت کے مطابق آٹھ پڑھنے کا حکم دے دیا ہو۔ بہرحال آٹھ رکعت تراویح ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سنت ہے۔ جو لوگ بیس رکعت پڑھتے ہیں، وہ خلافِ سنت کرتے ہیں... آپ فرمائیے کہ

ہمارے دوست کی یہ بات کہاں تک درست ہے؟

(سائل: عبداللہ، کراچی)"

جواب:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

آپ کے دوست نے اپنے موقف کی وضاحت کردی ہے، میں اپنے موقف کی وضاحت کئے دیتا ہوں، ان میں کون سا موقف صحیح ہے؟ اس کا فیصلہ خود کیجئے! اس تحریر کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

۱:... تراویح عہدِ نبوی میں۔

۲:... تراویح عہدِ فاروقی میں۔

۳:... تراویح صحابہؓ و تابعینؒ کے دور میں۔

۴:... تراویح ائمہ اربعہ کے نزدیک۔

۱:... تراویح عہدِ نبویؐ میں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں قیامِ رمضان کی ترغیب دی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"کَانَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُرَغِّبُ فِیْ قِیَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّأْمُرَھُمْ بِعَزِیْمَۃٍ، فَیَقُوْلُ: مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ۔ فَتُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْاَمْرُ عَلٰی ذٰلِکَ، ثُمَّ کَانَ الْاَمْرُ عَلٰی ذٰلِکَ فِیْ خِلَافَۃِ اَبِیْ بَکْرٍ وَصَدْرًا مِّنْ خِلَافَۃِ عُمَرَ۔"

(جامع الاصول ج:۹ ص:۴۳۹، بروایت بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، موطا)

ترجمہ... "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامِ رمضان کی ترغیب دیتے تھے بغیر اس کے کہ قطعیت سے حکم فرمائیں، چنانچہ فرماتے تھے۔ جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت رکھتے ہوئے رمضان میں قیام کیا، اس کے گزشتہ گناہ معاف ہوگئے۔ چنانچہ یہ معاملہ اسی حالت پر رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی یہی صورتِ حال رہی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں بھی۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ صِیَامَ رَمَضَانَ وَسَنَنْتُ لَکُمْ قِیَامَہٗ، فَمَنْ صَامَہٗ وَقَامَہٗ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِہٖ کَیَوْمِ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ۔" (جامع الاصول ج:۹ ص:۴۴۱، بروایت نسائی)

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کا روزہ فرض کیا ہے، اور میں نے تمہارے لئے اس کے قیام کو سنت قرار دیا ہے، پس جس نے ایمان کے جذبے سے اور ثواب کی نیت سے اس کا صیام و قیام کیا، وہ اپنے گناہوں سے ایسا نکل جائے گا جیسا کہ جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔"

چند راتیں تراویح کا جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔[1]

---

(۱) یعنی حدیث عائشہ جس میں تین رات کا ذکر ہے، پہلی رات تہائی رات تک، دوسری رات آدھی رات تک، تیسری رات سحر تک۔ (صحیح بخاری ج:۱ ص:۲۶۹)

حدیث ابی ذرؓ جس میں تئیسویں رات میں تہائی رات تک، پچیسویں میں آدھی رات تک، اور ستائیسویں شب میں اول فجر تک قیام کا ذکر ہے۔

(جامع الاصول ج:۹ ص:۴۴۰ بروایت ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

(باقی اگلے صفحے پر)

نے سے ضعفاء میں ذکر کیا ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ: اس کی حدیثیں محفوظ نہیں۔ [۱]

خلاصہ یہ کہ یہ راوی اس روایت میں متفرد بھی ہے اور ضعیف بھی، اس لئے یہ روایت منکر ہے، اور پھر اس روایت میں صرف ایک رات کا قصہ مذکور ہے، جبکہ یہ بھی احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آٹھ رکعتوں سے پہلے یا بعد میں تنہا بھی کچھ رکعتیں پڑھی ہوں، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے۔ [۲]

دوسری روایت مصنف ابن ابی شیبہ [۳] میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے" مگر اس کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان راوی متروک ہے، اس لئے یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح نہیں، مگر جیسا کہ آگے معلوم ہوگا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں امت کا تعامل اسی کے مطابق ہوا۔

تیسری حدیث ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے، جس کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے، مگر اس میں تراویح کا ذکر نہیں، بلکہ اس نماز کا ذکر ہے جو رمضان اور غیر رمضان میں ہمیشہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے رکعاتِ تراویح کے تعین میں اس سے بھی مدد نہیں ملتی، چنانچہ علامہ شوکانی "نیل الاوطار" میں لکھتے ہیں:

"والحاصل أن الذي دلّت عليه أحاديث الباب وما يشابهها هو مشروعية القيام في رمضان والصلوة فيه جماعة وفرادى فقصر الصلوة المسماة بالتراويح على عدد معين وتخصيصها بقراءة مخصوصة لم يرد به سنة."

(شوکانی: نیل الاوطار ج:۳ ص:۵۳)

ترجمہ: "حاصل یہ کہ اس باب کی حدیثیں اور ان کے

---

(۱) تہذیب التہذیب ج:۹ ص:۲۸۶، میزان الاعتدال ج:۳ ص:۳۱۱۔

(۲) مجمع الزوائد ج:۱ ص:۳۳۲ بروایت طبرانی و قال: ورجالہ رجال الصحیح۔

(۳) ج:۲ ص:۳۹۴، بیہقی سنن کبریٰ ج:۲ ص:۴۹۶، مجمع الزوائد ج:۳ ص:۱۷۲۔

مشابہ حدیثیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ رمضان میں قیام کرنا اور باجماعت یا اکیلے نماز پڑھنا مشروع ہے، لیکن تراویح کو کسی خاص عدد میں منحصر کردینا اور اس میں خاص مقدار قراءت مقرر کرنا ایسی بات ہے جو سنت میں وارد نہیں ہوئی۔“

۲:... تراویح عہدِ فاروقی میں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تراویح کی باقاعدہ جماعت کا اہتمام نہیں تھا، بلکہ لوگ تنہا یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے، سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک امام پر جمع کیا،[1] اور یہ خلافتِ فاروقی کے دوسرے سال ۱۴ھ کا واقعہ ہے۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کتنی رکعتیں پڑھی جاتی تھیں؟ اس کا ذکر حضرت سائب بن یزید صحابی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، حضرت سائب سے اس حدیث کو تین شاگرد نقل کرتے ہیں، نمبر۱:... حارث بن عبدالرحمن بن ابی ذباب۔ نمبر۲:... یزید بن خصیفہ۔ نمبر۳:... محمد بن یوسف۔ ان تینوں کی روایت کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱:... حارث بن عبدالرحمن رحمہ اللہ کی روایت علامہ عینی رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کی ہے:

”قال ابن عبدالبر: وروی الحارث بن عبدالرحمن بن ابی ذباب عن السائب بن یزید قال: کان القیام علی عهد عمر بثلاث وعشرین رکعة. قال ابن عبدالبر: هذا محمول علی أن الثلاث للوتر.“

(عمدۃ القاری ج:۱۱ ص:۱۲۷)

ترجمہ:... ”ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ: حارث بن

(۱) صحیح بخاری ج:۱ ص:۲۶۹ باب فضل من قام رمضان۔

(۲) تاریخ الخلفاء ص:۱۴۱، تاریخ ابن اثیر ج:۲ ص:۱۸۹۔

عبدالرحمٰن بن ابی ذباب نے حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تیئیس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں، ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ ان میں بیس تراویح اور تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں۔"

۲... حضرت سائب رضی اللہ عنہ کے دوسرے راوی یزید بن خصیفہ رحمہ اللہ کے تین شاگرد ہیں: ابن ابی ذئب، محمد بن جعفر اور امام مالک رحمہم اللہ، اور یہ تینوں بالاتفاق بیس رکعتیں روایت کرتے ہیں۔

الف... ابن ابی ذئب رحمہ اللہ کی روایت امام بیہقی رحمہ اللہ کی سنن کبریٰ میں درج ذیل سند کے ساتھ مروی ہے:

"أخبرنا أبو عبدالله الحسين بن محمد بن الحسين بن فنجويه الدينوري -بالدامغان- ثنا أحمد بن محمد بن اسحاق السني، أنبأنا عبدالله بن محمد بن عبدالعزيز البغوي، ثنا علي بن الجعد، أنبأنا ابن أبي ذئب عن يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد قال: كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب رضي الله عنه في شهر رمضان بعشرين ركعة، قال: وكانوا يقرءون بالمئين، وكانوا يتوكئون على عصيهم في عهد عثمان بن عفان رضي الله عنه من شدة القيام."

(سنن کبریٰ ج ۲ ص ۴۹۶)

ترجمہ... "یعنی ابن ابی ذئب، یزید بن خصیفہ سے اور وہ حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں رمضان میں لوگ بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں شدتِ قیام کی وجہ سے اپنی

لاٹھیوں پر ٹیک لگاتے تھے۔"

اس کی سند کو امام نوویؒ، امام عراقیؒ اور حافظ سیوطی رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے۔

(آثار السنن ج ۲ ص ۵۴، تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۷۵)

ب:... محمد بن جعفرؒ کی روایت امام بیہقی رحمہ اللہ کی دوسری کتاب "معرفۃ السنن والآثار" میں حسب ذیل سند سے مروی ہے۔

"اخبرنا ابو طاهر الفقيه، ثنا ابو عثمان البصري، ثنا ابو احمد محمد بن عبد الوهاب، ثنا خالد بن مخلد، ثنا محمد بن جعفر، حدثني يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد قال: كنا نقوم في زمن عمر بن الخطاب بعشرين ركعة والوتر۔" (نصب الرایہ ج ۲ ص ۱۵۴)

ترجمہ:... "محمد بن جعفرؒ، یزید بن خصیفہؒ سے اور وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے۔"

اس کی سند کو امام نوویؒ نے خلاصہ میں، امام سبکیؒ نے شرح منہاج میں اور ملا علی قاریؒ نے شرح موطا میں صحیح کہا ہے۔ (آثار السنن ج ۲ ص ۵۴، تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۷۵)

ج:... یزید بن خصیفہؒ سے امام مالک رحمہ اللہ کی روایت حافظؒ نے فتح الباری میں اور علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں ذکر کی ہے، حافظ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وروى مالك من طريق يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد عشرين ركعة"

(فتح الباری ج ۴ ص ۲۵۳ طبع لاہور)

ترجمہ:... "اور امام مالکؒ نے یزید بن خصیفہؒ کے طریق سے حضرت سائب بن یزیدؓ سے بیس رکعتیں نقل کی ہیں۔"

اور علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:

besturdubooks.wordpress.com

"وفی الموطأ من طریق یزید بن خصیفۃ عن

السائب بن یزید انھا عشرین رکعۃ۔"

(نیل الاوطار ج:۳ ص:۵۳ مطبوعہ عثمانیہ مصر ۱۳۵۷ھ)

"مالک عن یزید بن خصیفۃ عن السائب بن یزید" کی سند سے یہ صحیح بخاری (ج:۱ ص:۳۱۲) پر موجود ہے، لیکن یہ روایت مجھے مؤطا کے موجودہ نسخے میں نہیں ملی، ممکن ہے کہ مؤطا کے کسی نسخے میں حافظ کی نظر سے گزری ہو، یا غیر مؤطا میں ہو، اور علامہ شوکانی کا "وفی الموطأ" کہنا سہو کی بنا پر ہو، فلیفتش!

۳:... حضرت سائبؓ کے تیسرے شاگرد محمد بن یوسفؒ کی روایت میں ان کے شاگردوں کے درمیان اختلاف ہوا ہے، چنانچہ:

الف:... امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُبیؓ اور تمیم داریؓ کو گیارہ رکعتیں پڑھانے کا حکم دیا تھا، جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں ہے۔

(مؤطا امام مالک ص:۹۸ مطبوعہ نور محمد کراچی)

ب:... ابن اسحاقؒ ان سے تیرہ کی روایت نقل کرتے ہیں۔ (فتح الباری ج:۴ ص:۲۵۳)

ج:... اور داؤد بن قیسؒ اور دیگر حضرات ان سے اکیس رکعتیں نقل کرتے ہیں۔

(مصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۲۶۰)

اس تفصیل سے معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت سائبؓ کے دو شاگرد حارثؒ اور یزید بن خصیفہؒ اور ان کے تینوں شاگرد متفق اللفظ ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات پر لوگوں کو جمع کیا تھا، محمد بن یوسفؒ کی روایت مضطرب ہے، بعض ان سے گیارہ نقل کرتے ہیں، بعض تیرہ اور بعض اکیس۔ اصولِ حدیث کے قاعدے سے مضطرب حدیث حجت نہیں، لہٰذا حضرت سائبؓ کی صحیح حدیث وہی ہے جو حارثؒ اور یزید بن خصیفہؒ نے نقل کی ہے، اور اگر محمد بن یوسفؒ کی مضطرب اور مشکوک روایت کو کسی درجے میں قابلِ لحاظ سمجھا جائے تو دونوں کے درمیان تطبیق کی وہی صورت متعین ہے جو امام بیہقی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ گیارہ پر چند روز عمل رہا، پھر بیس پر عمل کا استقرار ہوا، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ دونوں

besturdubooks.wordpress.com

روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ویمکن الجمع بین الروایتین، فانھم کانوا یقومون باحدی عشرۃ ثم کانوا یقومون بعشرین ویوترون بثلاث." (سنن بیہقی ج:۲ ص:۴۹۶)

ترجمہ: "دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے، کیونکہ وہ لوگ پہلے گیارہ پڑھتے تھے، اس کے بعد بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھنے لگے۔"

امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ ارشاد کہ عہدِ فاروقی میں صحابہ کا آخری عمل، جس پر استقرار ہوا، بیس تراویح تھا، جس پر متعدد شواہد و قرائن موجود ہیں۔

اوّل:... امام مالک رحمہ اللہ جو محمد بن یوسف سے گیارہ کی روایت نقل کرتے ہیں، خود ان کا اپنا مسلک بیس یا چھتیس تراویح کا ہے، جیسا کہ چوتھی بحث میں آئے گا، اس سے واضح ہے کہ یہ روایت خود امام مالکؒ کے نزدیک بھی مختار اور پسندیدہ نہیں۔

دوم:... ابن اسحاق جو محمد بن یوسفؒ سے تیرہ کی روایت نقل کرتے ہیں، وہ بھی بیس کی روایت کو اثبت کہتے ہیں، چنانچہ علامہ شوکانی نے بیس والی روایت کے ذیل میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ:

"قال ابن اسحاق: وھذا اثبت ما سمعت فی ذلک." (نیل الاوطار ج:۳ ص:۵۳)

ترجمہ: "ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: رکعاتِ تراویح کی تعداد کے بارے میں میں نے جو کچھ سنا اس میں سب سے زیادہ ثابت یہی تعداد ہے۔"

سوم:... یہ کہ محمد بن یوسف کی گیارہ والی روایت کی تائید میں تو دوسری کوئی اور روایت موجود نہیں، جبکہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی بیس والی روایت کی تائید میں دیگر متعدد روایتیں بھی موجود ہیں، چنانچہ:

۱:... یزید بن رومان کی روایت ہے کہ:

"کَانَ النَّاسُ یَقُوْمُوْنَ فِیْ زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِیْ رَمَضَانَ بِثَلَاثٍ وَّعِشْرِیْنَ رَکْعَۃً"

(موطا امام مالک ص:۹۸ مطبوعہ نور محمد کراچی،
سنن کبریٰ ج:۲ ص:۴۹۶، قیام اللیل ص:۹۱)

ترجمہ: "لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تیئس رکعتیں پڑھا کرتے تھے (بیس تراویح اور تین وتر)۔"

یہ روایت سند کے لحاظ سے نہایت قوی ہے، مگر مرسل ہے، کیونکہ یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، تاہم حدیث مرسل (جبکہ ثقہ اور لائقِ اعتماد سند سے مروی ہو) امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد رحمہم اللہ اور جمہور علماء کے نزدیک حجت ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حدیث مرسل کے حجت ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کی تائید کسی دوسری مسند یا مرسل سے ہوئی ہو، چونکہ یزید بن رومان کی زیرِ بحث روایت کی تائید میں دیگر متعدد روایات موجود ہیں، اس لئے یہ باتفاقِ اہلِ علم حجت ہے۔

یہ بحث تو عام مراسیل کے باب میں تھی، موطا کے مراسیل کے بارے میں اہلِ حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ سب صحیح ہیں، چنانچہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:

"قال الشافعی: أصح الکتب بعد کتاب اللہ موطا مالک، واتفق أھل الحدیث علی أن جمیع ما فیہ صحیح علی رأی مالک ومن وافقہ، وأما علی رأی غیرہ فلیس فیہ مرسل ولا منقطع إلّا قد اتصل السند بہ من طرق أخری فلا جرم أنھا صحیحۃ من ھذا الوجہ، وقد صنف فی زمان مالک موطآت کثیرۃ فی تخریج أحادیثہ ووصل منقطعہ مثل کتاب ابن أبی ذئب

besturdubooks.wordpress.com

وابن عیینة والثوری ومعمر۔"

(حجة اللہ البالغہ ج:۱ ص:۱۳۳ طبع مصر)

ترجمہ:... "امام شافعیؒ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب موطا امام مالک ہے، اور اہلِ حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اس میں جتنی روایتیں ہیں، وہ سب امام مالکؒ اور ان کے موافقین کی رائے پر صحیح ہیں، اور دوسروں کی رائے پر اس میں جو مرسل اور منقطع روایات بھی ہیں کہ دوسرے طریقوں سے اس کی سند متصل ہوجاتی ہے، اس لحاظ سے وہ سب کی سب صحیح ہیں، اور امام مالکؒ کے زمانے میں موطا کی حدیثوں کی تخریج کے لئے اور اس کے منقطع و متصل ثابت کرنے کے لئے بہت سے موطا تصنیف ہوئے، جیسے ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، ثوری اور معمر کی کتابیں۔"

اور بیس رکعات پر اصل استدلال تو حضرت سائب بن یزیدؓ کی روایت سے ہے، جس کے "صحیح" ہونے کی تصریح گزرچکی ہے، اور یزید بن رومان کی روایت بطور تائید ذکر کی ہے۔

۲:... یحییٰ بن سعید انصاریؒ کی روایت ہے کہ:

"اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَمَرَ رَجُلًا اَنْ یُّصَلِّیَ بِھِمْ عِشْرِیْنَ رَکْعَةً۔" (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

ترجمہ:... "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعتیں پڑھائے۔"

یہ روایت بھی سنداً قوی مگر مرسل ہے۔

۳:... عبدالعزیز بن رفیعؒ کی روایت ہے:

"کَانَ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ یُصَلِّیْ بِالنَّاسِ فِیْ رَمَضَانَ بِالْمَدِیْنَةِ عِشْرِیْنَ رَکْعَةً وَّیُوْتِرُ بِثَلَاثٍ۔" (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

ترجمہ:... "حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو مدینہ میں رمضان میں بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھایا کرتے تھے۔"

یہ روایت بھی مرسل ہے۔

۴:... محمد بن کعب قرظی کی روایت ہے کہ:

"كَانَ النَّاسُ يُصَلُّوْنَ فِيْ زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِيْ رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً يُطِيْلُوْنَ فِيْهَا الْقِرَاءَةَ وَيُوْتِرُوْنَ بِثَلَاثٍ۔" (قیام اللیل ص:۹۱)

ترجمہ:... "لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان مبارک میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے، ان میں طویل قراءت کرتے تھے اور تین وتر پڑھتے تھے۔"

یہ روایت بھی مرسل ہے، اور قیام اللیل میں اس کی سند نہیں ذکر کی گئی۔

۵:... کنز العمال میں خود حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ:

"اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَمَرَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ بِاللَّيْلِ فِيْ رَمَضَانَ، فَقَالَ: اِنَّ النَّاسَ يَصُوْمُوْنَ النَّهَارَ وَلَا يُحْسِنُوْنَ اَنْ يَّقْرَءُوْا، فَلَوْ قَرَأْتَ عَلَيْهِمْ بِاللَّيْلِ، فَقَالَ: يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! هٰذَا شَيْءٌ لَمْ يَكُنْ، فَقَالَ: قَدْ عَلِمْتُ وَلٰكِنَّهٗ حَسَنٌ، فَصَلّٰى بِهِمْ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً۔"

(کنز العمال ج:۸ ص:۴۰۹، حدیث:۲۳۴۷۱، طبع جدید بیروت)

ترجمہ:... "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو رات کے وقت نماز پڑھایا کریں، حضرت عمر نے فرمایا کہ: لوگ دن کو روزہ رکھتے ہیں، مگر خوب اچھی پڑھنا نہیں

۲۱۳ھ) اور ابو مروان عبد الملک بن حبیب القرطبی المالکی رحمہ اللہ (متوفی ۲۳۸ھ) نے نقل کیا ہے۔ (زرقانی شرح موطا ج:۱ ص:۲۳۹)

۴... حافظ موفق الدین ابن قدامہ المقدسی حنبلی رحمہ اللہ (متوفی ۶۲۰ھ) "المغنی" میں لکھتے ہیں:

"ولنا أن عمر رضي الله عنه لما جمع الناس على أبي بن كعب كان يصلي لهم عشرين ركعة."

ترجمہ:... "ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کو ابی بن کعب پر جمع کیا تو وہ ان کو بیس رکعتیں پڑھاتے تھے۔"

اس سلسلے کی روایات نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"وهذا كالإجماع."

ترجمہ:... "اور یہ بمنزلہ اجماعِ صحابہؓ کے ہے۔"

پھر اہلِ مدینہ کے ۳۶ رکعتوں کے تعامل کو ذکر کرکے لکھتے ہیں:

"ثم لو ثبت أن أهل المدينة كلهم فعلوه لكان ما فعله عمر وأجمع عليه الصحابة في عصره أولى بالاتباع. قال بعض أهل العلم: إنما فعل هذا أهل المدينة لأنهم أرادوا مساواة أهل مكة، فإن أهل مكة يطوفون سبعا بين كل ترويحتين، فجعل أهل المدينة مكان كل سبع أربع ركعات، وما كان عليه أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم أولى وأحق."

(ابن قدامہ: المغنی مع الشرح الکبیر ج:۱ ص:۷۹۹)

ترجمہ:... "پھر اگر یہ ثابت ہو کہ اہلِ مدینہ سب چھتیس رکعتیں پڑھتے تھے، تب بھی جو کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا اور

besturdubooks.wordpress.com

جس پر ان کے دور میں صحابہؓ نے اجماع کیا، اسی کی پیروی اولیٰ ہوگی۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اہلِ مدینہ کا مقصود اس عمل سے اہلِ مکہ کی برابری کرنا تھا، کیونکہ اہلِ مکہ دو ترویحوں کے درمیان طواف کیا کرتے تھے، اہلِ مدینہ نے طواف کی جگہ دو ترویحوں کے درمیان چار رکعتیں مقرر کرلیں۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا جو معمول تھا وہی اولیٰ اور حق ہے۔"

۵:... امام محی الدین نووی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۶ھ) شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

"واحتج أصحابنا بما رواه البيهقي وغيره بالإسناد الصحيح عن السائب بن يزيد الصحابي رضي الله عنه قال: كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب رضي الله عنه في شهر رمضان بعشرين ركعة. الحديث."

(المجموع شرح مہذب ج:۴ ص:۳۲)

ترجمہ:... "ہمارے اصحاب نے اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے جو امام بیہقیؒ اور دیگر حضرات نے حضرت سائب بن یزید صحابی رضی اللہ عنہ سے بہ سندِ صحیح روایت کی ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان مبارک میں بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔"

آگے یزید بن رومان کی روایت ذکر کرکے امام بیہقیؒ کی تطبیق ذکر کی ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کرکے اہلِ مدینہ کے فعل کی وہی توجیہ کی ہے جو ابنِ قدامہ کی عبارت میں گزرچکی ہے۔

۶:... علامہ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی شافعی رحمہ اللہ (متوفی ۹۲۳ھ) شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

"وجمع البيهقي بينهما بأنهم كانوا يقومون بإحدى عشرة، ثم قاموا بعشرين وأوتروا بثلاث. وقد

عددا ما وقع فی زمن عمر رضی اللہ عنہ کالاجماع۔"

(ارشاد الساری ج:۳ ص:۲۲۶)

ترجمہ:... "اور امام بیہقیؒ نے ان دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ وہ پہلے گیارہ پڑھتے تھے، پھر بیس تراویح اور تین وتر پڑھنے لگے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو معمول جاری ہوا اسے علماء نے بمنزلہ اجماع کے شمار کیا ہے۔"

۷:... علامہ شیخ منصور بن یونس بہوتی حنبلیؒ (متوفی ۱۰۵۱ھ) "کشف القناع عن متن الاقناع" میں لکھتے ہیں:

"وھی عشرون رکعۃ لما روی مالک عن یزید بن رومان قال: کان الناس یقومون فی زمن عمر فی رمضان بثلاث وعشرین رکعۃ .... وھذا فی مظنۃ الشھرۃ بحضرۃ الصحابۃ فکان اجماعاً۔"

(کشف القناع عن متن الاقناع ج:۱ ص:۴۲۵)

ترجمہ:... "تراویح بیس رکعت ہیں، چنانچہ امام مالکؒ نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان میں تئیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ کا صحابہؓ کی موجودگی میں بیس کا حکم دینا عام شہرت کا موقع تھا، اس لئے یہ اجماع ہوا۔"

۸:... مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:

"وزادت الصحابۃ ومن بعدھم فی قیام رمضان ثلاثۃ اشیاء: الاجتماع لہ فی مساجدھم، وذلک لانہ یفید التیسیر علی خاصتھم وعامتھم، واداؤہ فی اول اللیل مع القول بان صلاۃ آخر اللیل مشھودۃ، وھی افضل

besturdubooks.wordpress.com

كما نبه عمر رضي الله عنه بهذا التعبير الذي أشرنا إليه، وعدده عشرون ركعة." (حجۃ اللہ البالغہ ج:۲ ص:۱۸)

ترجمہ:... "اور صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد کے حضرات نے قیامِ رمضان میں تین چیزوں کا اضافہ کیا۔ ۱:... اس کے لئے مساجد میں جمع ہونا، کیونکہ اس سے عام و خاص کو آسانی حاصل ہوتی ہے۔

۲:... اول شب میں ادا کرنا، باوجود اس بات کے قائل ہونے کے کہ آخر شب کی نماز میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے، اور وہ افضل ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر متنبہ فرمایا، مگر اول شب کا اختیار کرنا بھی اسی آسانی کے لئے تھا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

۳:... بیس رکعات کی تعداد۔"

۴:... تراویح عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ میں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس تراویح کا معمول شروع ہوا تو بعد میں بھی کم از کم بیس کا معمول رہا، بعض صحابہؓ و تابعینؒ سے زائد کی روایات تو مروی ہیں، لیکن کسی سے صرف آٹھ کی روایت نہیں۔

۱:... حضرت سائب رضی اللہ عنہ کی روایت اوپر گزر چکی ہے، جس میں انہوں نے عہدِ فاروقی میں بیس کا معمول ذکر کرتے ہوئے اسی سیاق میں عہدِ عثمانیؓ کا ذکر کیا ہے۔

۲:... ابن مسعود رضی اللہ عنہ، جن کا وصال عہدِ عثمانی کے اواخر میں ہوا ہے، وہ بھی بیس پڑھا کرتے تھے۔ (قیام اللیل ص:۹۱)

۳:... "عَنْ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ السُّلَمِي عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ دَعَا الْقُرَّاءَ فِي رَمَضَانَ فَأَمَرَ مِنْهُمْ رَجُلًا يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً وَكَانَ عَلِيٌّ يُوْتِرُ بِهِمْ."

(سنن کبریٰ بیہقی ج:۲ ص:۴۹۵)

ترجمہ:... "ابو عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی

اللہ عنہ نے رمضان میں قاریوں کو بلایا، پس ان میں سے ایک شخص کو حکم دیا کہ بیس رکعتیں پڑھایا کریں، اور وتر حضرت علی خود پڑھایا کرتے تھے۔"

اس کی سند میں حماد بن شعیب پر محدثین نے کلام کیا ہے، لیکن اس کے متعدد شواہد موجود ہیں۔ ابو عبدالرحمن سلمی کی یہ روایت شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنہ میں ذکر کی ہے، اور اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جاری کردہ تراویح کو اپنے دورِ خلافت میں باقی رکھا۔ (منہاج السنہ ج:۲ ص:۲۲۴)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے المنتقی مختصر منہاج السنہ (المنتقی ص:۵۴۲) میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے استدلال کو بلانکیر ذکر کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ ان دونوں کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیس رکعات تراویح کا معمول جاری تھا۔

۴:... "عَنْ عَمْرِو بْنِ قَیْسٍ عَنْ اَبِی الْحَسْنَاءِ اَنَّ عَلِیًّا اَمَرَ رَجُلًا یُصَلِّیْ بِھِمْ فِیْ رَمَضَانَ عِشْرِیْنَ رَکْعَةً۔"

(مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

ترجمہ:... "عمرو بن قیس، ابوالحسناء سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعتیں پڑھایا کرے۔"

۵:... "عَنْ اَبِیْ سَعْدٍ الْبَقَّالِ عَنْ اَبِی الْحَسْنَاءِ اَنَّ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ اَمَرَ رَجُلًا اَنْ یُّصَلِّیَ بِالنَّاسِ خَمْسَ تَرْوِیْحَاتٍ عِشْرِیْنَ رَکْعَةً وَفِیْ ھٰذَا الْاِسْنَادِ ضُعْفٌ۔" (سنن کبریٰ بیہقی ج:۲ ص:۴۹۷)

ترجمہ:... "ابوسعد بقال، ابوالحسناء سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو پانچ ترویحے یعنی بیس رکعتیں پڑھایا کرے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

besturdubooks.wordpress.com

اس کی سند میں ضعف ہے۔"

علامہ ابن ترکمانی رحمہ اللہ "الجوہر النقی" میں لکھتے ہیں کہ: "خبر یہ ہے کہ اس سند کا ضعف ابو سعد بقال کی وجہ سے ہے، جو متکلم فیہ راوی ہے، لیکن مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں (جو اوپر ذکر کی گئی ہے) اس کا متابع موجود ہے، جس سے اس کے ضعف کی تلافی ہوجاتی ہے۔" (ذیل سنن کبریٰ ج:۲ ص:۴۹۵)

۶:... "عن شتير بن شكل وكان من أصحاب علي رضي الله عنه أنه كان يؤمهم في شهر رمضان بعشرين ركعة ويوتر بثلاث."

ترجمہ:... "شتیر بن شکل، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے تھے، رمضان مبارک میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھایا کرتے تھے۔"

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس اثر کو نقل کرکے کہا ہے: "وفي ذلك قوة" (اور اس میں قوت ہے) پھر اس کی تائید میں انہوں نے ابو عبدالرحمن سلمی کا اثر ذکر کیا ہے، جو اوپر گزر چکا ہے۔

۷:... "عن أبي الخصيب قال: كان يؤمنا سويد بن غفلة في رمضان فيصلي خمس ترويحات عشرين ركعة. قال النيموي: وإسناده حسن." (آثار السنن ج:۲ ص:۵۵)

ترجمہ:... "ابو الخصیب کہتے ہیں کہ سوید بن غفلہ ہمیں رمضان میں نماز پڑھاتے تھے، پس پانچ ترویحے بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔ علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ: اس کی سند حسن ہے۔"

حضرت سوید بن غفلہ بڑی عمر کے تابعی ہیں، جنھوں نے زمانہ جاہلیت پایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اسلام لائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی، کیونکہ مدینہ طیبہ اس دن پہنچے جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ

besturdubooks.wordpress.com

وسلم کی تدفین ہوئی، اس لیے صحابیت کے شرف سے مشرف نہ ہوسکے، بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے خاص اصحاب میں تھے، ۸۰ھ میں ایک سو تیس برس کی عمر میں انتقال ہوا۔

۸:... "عن الحارث انہ کان یؤم الناس فی رمضان باللیل بعشرین رکعۃ ویوتر بثلاث ویقنت قبل الرکوع۔" (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

ترجمہ:... "حارث رحمہ اللہ رمضان میں لوگوں کو بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے، اور رکوع سے قبل قنوت پڑھتے تھے۔"

۹:... قیام اللیل میں عبدالرحمن بن ابی بکرہ، سعید بن ابی الحسن اور عمران العبدی رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بیس راتیں بیس تراویح پڑھایا کرتے تھے، اور آخری عشرے میں ایک ترویحہ کا اضافہ کردیتے تھے۔ (قیام اللیل ص:۹۲)

حارث، عبدالرحمن بن ابی بکرہ[1] (متوفی ۹۶ھ) اور سعید بن ابی الحسن (متوفی ۱۰۸ھ) تینوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔

۱۰:... ابوالبختریؒ بھی بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

۱۱:... علی بن ربیعہ رحمہ اللہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں تھے، بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

۱۲:... ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۷ھ) بھی بیس تراویح پڑھاتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

۱۳:... حضرت عطاء رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۴ھ) فرماتے ہیں کہ: میں نے لوگوں کو وتر سمیت تئیس رکعتیں پڑھتے ہوئے پایا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۲ ص:۳۹۳)

۱۴:... موطا امام مالکؒ میں عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج (متوفی ۱۱۷ھ) کی روایت ہے

(۱) قیام اللیل میں "ابی بکرہ" کی جگہ "ابی بکر" طباعت کی غلطی ہے۔

کہ میں نے لوگوں کو اس حالت میں پایا ہے کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت کرتے تھے، اور قاری آٹھ رکعتوں میں سورۂ بقرہ ختم کرتا تھا، اگر وہ بارہ رکعتوں میں سورۂ بقرہ ختم کرتا تو لوگ یہ محسوس کرتے کہ اس نے قراءت میں تخفیف کی ہے۔ (مؤطا امام مالک ص:۹۹) اس روایت سے مقصود تو تراویح میں طولِ قراءت کا بیان کرنا ہے، لیکن روایت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف آٹھ رکعت پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی باقاعدہ جماعت جاری کی، ہمیشہ بیس رکعات تراویح پڑھی جاتی تھیں۔ البتہ ایامِ حرہ (۶۳ھ) کے قریب اہلِ مدینہ نے یہ دیکھ کر کہ درمیان چار رکعتوں کا وقفہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر وقفہ میں چار رکعتیں پڑھتے تھے، اور بعض دیگر تابعین بھی عشرۂ اخیرہ میں اضافہ کر لیتے تھے۔ بہرحال صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے دور میں آٹھ تراویح کا کوئی ضعیف سے ضعیف ثبوت نہیں ملتا، اس لئے جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس تراویح پر صحابہ کا اجماع ہو گیا تھا، ان کا یہ ارشاد مبنی برحقیقت ہے، کیونکہ حضرات سلف بیس تعداد پر اضافے کے تو قائل تھے، مگر اس میں کمی کا قول کسی سے منقول نہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس بات پر سلف کا اجماع تھا کہ تراویح کی تعداد بیس سے کم نہیں رکعات ہے۔

۳:... تراویح ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے نزدیک:

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک تراویح کی بیس رکعتیں ہیں، اور امام مالک رحمہ اللہ سے اس سلسلے میں دو روایتیں منقول ہیں، ایک بیس کی، اور دوسری چھتیس کی۔ لیکن مالکی مذہب کے متون میں بیس ہی کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے۔ فقہِ حنفی کے حوالے دینے کی ضرورت نہیں، دوسرے مذاہب کی مستند کتابوں کے حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

فقہ مالکی:

قاضی ابوالولید ابن رشد مالکی رحمہ اللہ (متوفی ۵۹۵ھ) بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں:

"واختلفوا فی المختار من عدد الرکعات التی

besturdubooks.wordpress.com

يقوم بها الناس في رمضان، فاختار مالك في أحد قوليه وأبو حنيفة والشافعي وأحمد وداود القيام بعشرين ركعة سوى الوتر، وذكر ابن القاسم عن مالك أنه كان يستحسن ستًّا وثلاثين ركعة والوتر ثلاث."

(بدایۃ المجتہد ج:۱ ص:۲۱۲)

ترجمہ:... "رمضان میں کتنی رکعات پڑھنا مختار ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ نے ایک قول میں، اور امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور داؤدؒ نے وتر کے علاوہ بیس رکعت کو اختیار کیا ہے، اور ابن قاسم نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ تین وتر اور چھتیس رکعات تراویح کو پسند فرماتے تھے۔"

مختصر خلیل کے شارح علامہ شیخ احمد دردیر مالکی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۰۱ھ) لکھتے ہیں:

"وهي (ثلاث وعشرون) ركعة بالشفع والوتر كما كان عليه العمل [۱] (ثم جعلت) في زمن عمر بن عبد العزيز (ستًّا وثلاثين) بغير الشفع والوتر، لكن الذي جرى عليه العمل سلفًا وخلفًا الأوّل."

(الشرح الکبیر للدردیر مع حاشیۃ الدسوقی ج:۱ ص:۳۱۵)

ترجمہ:... "اور تراویح مع وتر تئیس رکعتیں ہیں، جیسا کہ اسی کے مطابق (صحابہؓ و تابعینؒ کا) عمل تھا، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں وتر کے علاوہ چھتیس کردی گئیں، لیکن جس تعداد پر سلف و خلف کا عمل ہمیشہ جاری رہا وہ اوّل ہے (یعنی بیس تراویح اور تین وتر)۔"

---

(۱) قوله: كما كان عليه العمل أي عمل الصحابة والتابعين. حاشية الدسوقي على الشرح الكبير للدردير.

besturdubooks.wordpress.com

فقہِ شافعی:

امام محی الدین نووی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۶ھ) المجموع شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

"(فرع) في مذاهب العلماء في عدد ركعات التراويح: مذهبنا أنها عشرون ركعة بعشر تسليمات غير الوتر وذلك خمس ترويحات والترويحة أربع ركعات بتسليمتين هذا مذهبنا وبه قال أبو حنيفة وأصحابه وأحمد وداؤد وغيرهم ونقله القاضي عياض عن جمهور العلماء، وحكي أن الأسود بن يزيد كان يقوم بأربعين ركعة ويوتر بسبع، وقال مالك: التراويح تسع ترويحات وهي ستة وثلاثون ركعة غير الوتر"

(المجموع شرح المہذب ج ۴ ص ۳۲)

ترجمہ: "رکعاتِ تراویح کی تعداد میں علماء کے مذاہب کا بیان۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ تراویح بیس رکعتیں ہیں، دس سلاموں کے ساتھ، علاوہ وتر کے، یہ پانچ ترویحے ہوئے۔ ایک ترویحہ چار رکعات کا، دو سلاموں کے ساتھ، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب، امام احمدؒ اور امام داؤدؒ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں، اور قاضی عیاضؒ نے اسے جمہور علماء سے نقل کیا ہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ اسود بن یزیدؒ چالیس تراویح اور سات وتر پڑھا کرتے تھے، اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تراویح نو ترویحے ہیں، اور یہ وتر کے علاوہ چھتیس رکعتیں ہوئیں۔"

فقہِ حنبلی:

حافظ ابن قدامہ المقدسی الحنبلی رحمہ اللہ (متوفی ۶۲۰ھ) المغنی میں لکھتے ہیں:

"والمختار عند أبي عبد الله رحمه الله فيها عشرون ركعة وبهذا قال الثوري وأبو حنيفة والشافعي۔

وقال مالک: ستة وثلاثون."

(مغنی ابن قدامہ ج:[illegible] ص:[illegible] طبع ۱۹۹۷ء بتحقیق ترکی)

ترجمہ:... "امام احمدؒ کے نزدیک تراویح میں بیس رکعتیں مختار ہیں، امام ثوریؒ، ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں، اور امام مالکؒ چھتیس کے قائل ہیں۔"

خاتمۂ بحث... چند ضروری فوائد

مسئلہ تراویح کے ضمن میں چند فوائد کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، تاکہ مسئلہ تراویح کی اہمیت ذہن نشین ہو سکے۔

ا... بیس تراویح سنتِ مؤکدہ ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے بیس تراویح جماعت سے جاری کرائی، صحابہ کرام کا اس پر نکیر نہ کرنا اور بعد میں پڑھتے رہنا، آج تک شرقاً غرباً بیس تراویح کا معمول رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین میں داخل ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کے لئے اس دین کو قرار و تمکین بخشنے کا وعدہ فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے)، الاختیار شرح المختار میں ہے:

"روى أسد بن عمرو عن أبي يوسف قال: سألت أبا حنيفة رحمه الله عن التراويح وما فعله عمر رضي الله عنه، فقال: التراويح سنة مؤكدة، ولم يتخرص عمر من تلقاء نفسه، ولم يكن فيه مبتدعا، ولم يأمر به إلا عن أصل لديه وعهد من رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولقد سن عمر هذا وجمع الناس على أبي بن كعب فصلاها جماعة والصحابة متوافرون، منهم عثمان وعلي وابن مسعود والعباس وابنه وطلحة والزبير ومعاذ وأبي وغيرهم من المهاجرين

والانصار رضی اللہ عنہم أجمعین، وما رد علیہ واحد منہم بل ساعدوہ ووافقوہ وأمروا بذلک"

(الاختیار لتعلیل المختار ج:۱ ص:۲۸، شیخ الامام ابی الفضل مجد الدین عبداللہ بن محمود الموصلی الحنفی، متوفی ۶۸۳ھ)

ترجمہ:... "اسد بن عمرو، امام ابو یوسفؒ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تراویح اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ: تراویح سنتِ مؤکدہ ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا، نہ وہ کوئی بدعت ایجاد کرنے والے تھے، انہوں نے جو حکم دیا، وہ کسی اصل کی بنا پر تھا جو ان کے پاس موجود تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عہد پر مبنی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنت جاری کی اور لوگوں کو اُبی بن کعبؓ پر جمع کیا، پس انہوں نے تراویح کی جماعت کرائی، اس وقت صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں موجود تھے، حضرت عثمان، علی، ابن مسعود، عباس، ابن عباس، طلحہ، زبیر، معاذ، ابی، اور دیگر مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین سب موجود تھے، مگر ایک نے بھی اس کو رد نہیں کیا، بلکہ سب نے حضرت عمرؓ سے موافقت کی، اور اس کا حکم دیا۔"

۳:... خلفائے راشدینؓ کی جاری کردہ سنت کے بارے میں وصیتِ نبویؐ:

اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ بیس تراویح خلفائے راشدینؓ کی سنت ہے، اور سنتِ خلفائے راشدینؓ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"انہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا، فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ، وایاکم

شرع للمحسنين احدى عشرة ركعة في جميع السنة. فحكموا انه لا ينبغي ان يكون حظ المسلم في رمضان عند قصده الاقتحام في لجة التشبه بالملكوت اقل من ضعفها." (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۸)

ترجمہ: "اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسنین کے لئے (صلوٰۃ اللیل کی) گیارہ رکعتیں پورے سال میں مشروع فرمائی ہیں، پس ان کا فیصلہ ہوا کہ رمضان مبارک میں جب مسلمان تشبہ بالملکوت کے دریا میں غوطہ لگانے کا قصد رکھتا ہے، تو اس کا حصہ سال بھر کی رکعتوں کے دوگنا سے کم نہیں ہونا چاہئے۔"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔